اکتوبر 2015

خواتین ڈائجسٹ

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیر اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— سائرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

تخفیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری	
پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے




آپ سے کیا پردہ


خاتون کی ڈائری


مجھ سے ملیے


انٹرویو


ناول


مکمل ناول


ناولٹ


افسانے


نظمیں غزلیں















اکتوبر 2015

جلد 43 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کرن کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

جب یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو عالم گیر یکجہتی کی حامل عبادت حج کی سعادت سے فیض یاب ہونے والی قارئین اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد گھر واپسی کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ ہماری جانب سے ان سب کو دلی مبارک باد۔

اکتوبر کے مہینے میں نئے اسلامی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہی حرمت کا حامل رہا ہے۔ اس مہینے کی بزرگی اور عظمت مسلمہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک جتنے بھی انبیا علیہ السلام دنیا میں آئے ان کی حیات مبارکہ کے اہم واقعات محرم کی دس تاریخ کو پیش آئے۔ قیامت بھی محرم کی دس تاریخ کو ہی آئے گی۔

نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ بھی محرم کی دس تاریخ کو پیش آیا جو دنیا بھر میں ایک تاریخ ساز اہمیت رکھتا ہے۔

یہ ایک تاریخی اور ابدی حقیقت ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ حق کی خاطر سینہ سپر ہونے والے، جان دینے والے دنیا میں امر ہو گئے اور بلاشبہ باطل ٹوٹ جانے کے لیے ہی ہے۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کو صداقت اور حق پر کامل یقین تھا۔ یہ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا اور اپنے خون سے قیامت تک کے لیے عزم اور ہمت کی داستان رقم کر دی۔

آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ باطل کے پیروکار خواہ تعداد میں کتنے زیادہ کیوں نہ ہوں، باطل کبھی حق نہیں ہو سکتا۔

اسلام میں جاگیرداری اور بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بادشاہت صرف اللہ کے لیے ہے۔

آپؓ نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے سر کٹوا دیا۔ گھر بار لٹا دیا لیکن باطل کے آگے سر جھکانا گوارا نہیں کیا۔

آپؓ کی شہادت مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سبق ہے کہ پوری دنیا باطل کے ساتھ ہو۔ اگر آپ سچ اور حق پر ہیں تو پوری استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہیں۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

کرن کی محفل سجاتے ہنستے مسکراتے سجتے بکھیرتے محمود بابر فیصل اس طرح اچانک رخصت ہوئے کہ دل آج بھی یہ ماننے سے انکاری ہے کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ بلاشبہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کی دلچسپ باتیں، چٹکلے، شگفتہ جوابات، ناول، افسانے ان کی صلاحیت اور ذہانت کے عکاس تھے۔ انہوں نے قارئین کے ذہنوں پر جو نقش چھوڑا ہے، وہ آج بھی دھندلایا نہیں۔

25۔ اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل، ☆ راشدہ رفعت کا مکمل ناول۔ محبتوں کا سبزہ،
- امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول۔ شہر آشوب، ☆ عمیرہ احمد کا ناول۔ آب حیات،
- عفت سحر طاہر کے ناول کی آخری قسط، ☆ آسیہ مقصود کا ناولٹ۔ دل دریا سمندروں ڈونگے،
- سدرہ حیات، سمیہ یاسمین، فریدہ فرید اور بدیع الجمال کے افسانے،
- باتیں علی عباس سے، ☆ حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ۔ مصنفین سے سروے،
- یہ خوشبوؤں کے سلسلے۔ فنکاروں سے سروے، ☆ کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اکتوبر کے شمارے کے بارے میں آپ اپنی رائے ہمیں اپنے خطوط کے ذریعے ضرور دیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

چہرہ داغنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گدھے پر سے گزر ہوا جس کے چہرے کو داغا گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جس نے اسے داغا ہے۔" (مسلم)

چہرے پر مارنا

اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے اور چہرے کو داغنے سے منع فرمایا ہے۔

فائدہ : چہرہ چونکہ نہایت ہی لطیف اور حساس چیز ہے' اس لیے انسان ہو یا جانور' اس کے چہرے پر مارنا یا اسے داغنا یا کوئی اور ایسا عمل کرنا جو اس کی نزاکت کے خلاف ہو' ممنوع ہے۔ اسی لیے بیوی' اولاد اور خادم وغیرہ کو اگرچہ بطور تادیب مارنے کی اجازت ہے لیکن یہ تاکید کی گئی ہے کہ اس مار سے چہرہ محفوظ رہے۔

آگ میں جلانے کی سزا دینا منع ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا تو فرمایا۔

"اگر تم فلاں فلاں کو پاؤ تو ان کو آگ میں جلا دو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے دو آدمیوں کا نام لیا۔ پھر جب ہم نکلنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کو جلا دینا۔ لیکن آگ کا عذاب تو صرف اللہ ہی دے گا' اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو انہیں قتل کر دینا۔" (بخاری)

فائدہ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوسرے حکم میں واضح فرما دیا کہ آگ میں جلانے کی سزا کسی کو نہیں دینی چاہیے حتیٰ کہ اپنے بدترین دشمن کو بھی نہیں۔

آگ میں جلانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

"ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی بشری حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ ہم نے (چڑیا کی طرح کا) ایک سرخ پرندہ دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑلیا۔ وہ پرندہ ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس پرندے کو اس کے بچوں کی وجہ سے کس نے دردمند کیا (تکلیف پہنچائی) ہے؟ اسے اس کے بچے لوٹادو۔"

اور آپ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جس کو ہم نے جلادیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"یہ بستی کس نے جلائی ہے؟"

ہم نے جواب دیا: ہم نے (جلائی ہے)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آگ کا عذاب دینا تو آگ کے رب ہی کو سزاوار ہے۔" (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل : پرندوں کے بچوں کو پکڑ کر پرندوں کو ایذا پہنچانا' چیونٹیوں اور دیگر حشرات الارض کے مسکنوں کو کیڑے مکوڑوں سمیت جلانا منع ہے' البتہ خالی مسکنوں کو جلانا ممنوع نہیں ہے۔

اگر کسی نے کسی کو آگ میں جلا کر مار دیا تو قصاص میں ایسا کیا جاسکتا ہے کہ قاتل کو بھی جلادیا جائے' البتہ مقتول کے ورثاء چاہیں تو تلوار سے اس کی گردن اڑا کر بھی قصاص لے سکتے ہیں۔

حق دار کا اپنے حق کا مطالبہ کرنے پر مال دار آدمی کا ٹال مٹول کرنا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔" (النساء۔58)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"پس اگر تمہارا بعض بعض پر اعتبار کرے تو چاہیے کہ جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت واپس کردے۔" (البقرہ۔283)

فائدہ آیات : امانتوں سے مراد حقوق ہیں' حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔ مطلب یہ ہے کہ تمام حقوق ادا کرو' اللہ کے بھی اور بندوں کے بھی' کسی کا حق مت رکھو۔ اگر کسی کا حق رکھو گے تو یہ ادائے امانت کی منافی ہے۔ دوسری آیت کا مطلب ہے کہ گروی رکھے بغیر اور کسی کو گواہ بنائے بغیر اگر ایک شخص نے دوسرے پر اعتبار کیا ہے تو صاحب امانت کو اس کی امانت واپس کردی جائے۔ اسی سے امام صاحب نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ صاحب حق کو اس کا حق لوٹانے میں بلاوجہ ٹال مٹول کرنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ رویّہ بھی ادائے امانت کے حکم کے منافی ہے۔

ظلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"مال دار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو (قرض کی وصولی کے لیے) کسی مال دار کے سپرد کیا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کے پیچھے لگ جائے (اسی سے اپنا قرض طلب کرے۔)" (بخاری و مسلم)

اتبع: کے معنی ہیں سپرد کردیا جائے۔

فوائد و مسائل : ٹال مٹول کا مطلب ہے کہ قرض خواہ کی رقم ادا کرنے کی استطاعت موجود ہونے کے باوجود نہ دینا اور بلاوجہ ٹال مٹول سے کام لینا کبیرہ گناہ ہے۔

اگر جھگڑا ختم کرنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے قرض خواہ کو کسی مال دار آدمی کے سپرد کردیا جائے کہ وہ اس سے اپنی رقم وصول کرلے تو قرض خواہ کو یہ فیصلہ قبول کرلینا چاہیے۔ اس میں گویا حسن معاملہ کی ترغیب ہے۔

ہبہ واپس لینے کی کراہت

سوائے اس ہبہ کے جو ابھی تک موہوب لہ (جسے ہبہ کیا جائے) کے سپرد ہی نہ کیا ہو' اور (سوائے) اس ہبہ کے جو اپنی اولاد کو دیا ہو' اسے سپرد کر دیا ہو یا ابھی نہ کیا ہو۔ اور اس شخص سے صدقہ کی (ہوئی) چیز خریدنے کی کراہت (کا بیان) جس پر صدقہ کیا ہو یا اسے بطور زکوۃ اور کفارہ وغیرہ کے نکالا ہو۔ البتہ کسی دوسرے شخص سے' جس کی طرف وہ چیز منتقل ہو گئی ہو' خریدنے میں کوئی حرج نہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص اپنے ہبے کو واپس لیتا ہے وہ اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے اپنی قے کو چاٹتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے:
"اس شخص کی مثال جو اپنا صدقہ واپس لیتا ہے' اس کتے کی طرح ہے جو قے کرتا ہے' پھر اپنی قے میں لوٹتا اور اسے چاٹتا ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے: "اپنے ہبے کو واپس لینے والا اپنی قے میں لوٹنے والے کی طرح ہے۔"

فائدہ : اس کی شناخت و قباحت اس سے واضح ہے کہ ایک تو ایسے شخص کو' جو ہبہ واپس لیتا ہے' کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور دوسرے' موہوب چیز کو قے سے تعبیر کیا جس سے انسان سخت کراہت محسوس کرتا ہے۔

تاہم علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اجنبی آدمی کے لیے ہے۔ اگر انسان اپنی اولاد یا ——— پوتوں کو کوئی چیز ہبہ کرے تو اسے واپس لینے کا یہ حکم نہیں ہے' اس کا واپس لینا اس کے لیے جائز ہے جیسا کہ عنوان باب سے بھی واضح ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ۔
"میں نے ایک شخص کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک گھوڑا دے دیا' چنانچہ جس کے پاس وہ تھا' اس نے اسے ضائع کر دیا (اس کی دیکھ بھال نہیں کی) میں نے اسے' اس سے خریدنے کا ارادہ کیا اور میرا خیال تھا کہ وہ اسے معمولی سی قیمت پر بیچ دے گا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کی بابت) پوچھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔
"اسے نہ خریدو اور اپنا صدقہ واپس نہ لو اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم میں دے دے' اس لیے کہ اپنا صدقہ واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو اپنی قے کو چاٹتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمتاً خرید کر بھی واپس لینا جائز نہیں۔

مال یتیم کے حرام ہونے کی تاکید کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"بے شک وہ لوگ جو ناجائز طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں' وہ یقیناً اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔" (النساء۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔" (الانعام۔152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"یہ تجھ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں' ان سے کہہ دے: ان کی اصلاح کرنی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو (خرچ میں) اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے ہی بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔" (البقرہ۔220)

شہید

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب احد کی جنگ برپا ہوئی تو میرے والد (حضرت عبداللہ) نے رات کے وقت مجھے بلایا اور فرمایا۔
"مجھے یوں لگتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے جو پہلے شہید ہوں گے' میں بھی ان

ہی میں سے ہوں گا۔ اور میں اپنے بعد' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے علاوہ ایسا کوئی شخص چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں جو مجھے تجھ سے زیادہ عزیز ہو اور یاد رکھنا کہ میرے ذمے قرض ہے' اسے ادا کرنا اور اپنی بہنوں کے ساتھ بھلائی کرنا۔"

چنانچہ جب ہم نے صبح کی تو پہلے شہید ہونے والے وہی تھے اور میں نے ان کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی قبر میں دفن کیا' پھر میرا نفس اس بات پر مطمئن نہ ہوا کہ میں ان کو دوسرے (آدمی) کے ساتھ ہی رہنے دوں' چنانچہ میں نے چھ مہینے کے بعد ان کو (قبر سے) نکال لیا تو وہ کانوں کے سوا' اسی طرح تھے جیسے قبر میں رکھے جانے والے دن تھے۔ پھر میں نے ان کو ایک علیحدہ قبر میں رکھا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل: 1 ۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی اس محبت و تعلق خاطر کا بیان ہے جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جو دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ تھا۔

2 ۔ ان کے دل شوق شہادت سے معمور تھے۔

3 ۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کو اپنی شہادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

4 ۔ ان کی کرامت کا بیان ہے کہ چھ مہینے کے بعد بھی ان کی میت صحیح اور سالم تھی۔ رضی اللہ عنہم۔

5 ۔ اس سے بوقت ضرورت قبر سے لاش نکالنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے کہ ابھی زیادہ وقت نہ گزرا ہو اور یہ ظن غالب ہو کہ لاش ابھی محفوظ ہی ہو گی۔

بلاوجہ نشانہ بنانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ان کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا جو ایک پرندے کو نشانہ بنائے اسے تیر مار رہے تھے اور پرندے کے مالک سے یہ طے کیا تھا کہ ہر چوک جانے والا تیر اس کا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔

"ایسا کام کس نے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کام کیا ہے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جاندار چیز کو نشانہ بنائے۔" (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب ہے کہ قتل کرنے کے لیے اسے قید کر دیا جائے۔

فائدہ:

باندھ کر یا قید کر کے مارنے کا مطلب ہے کہ اسے باندھ کر پھر تیروں یا گولیوں وغیرہ سے اسے نشانہ بنایا جائے حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جانور کو قابو کر کے اس کے گلے پر تیز چھری پھیری جائے تاکہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

کنیز کو مارنا

حضرت ابو علی سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں مقرن کے سات بیٹوں میں سے ساتواں تھا (ہم سات بھائی تھے۔) ہماری ایک ہی کنیز تھی۔ اسے ہمارے سب سے چھوٹے بھائی نے طمانچہ مارا تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اسے آزاد کر دیں۔ (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے: میں اپنے بھائیوں کا ساتواں تھا۔

فائدہ:

مملوک (غلام اور نوکر چاکر) کو بلاوجہ مارنا پیٹنا اور اس پر زیادتی کرنا سخت جرم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے یا پھر کسی دوسرے طریقے سے اسے راضی کیا جائے' ورنہ عنداللہ زیادتی کرنے والا مجرم ہو گا۔ یہ ساتوں بھائی صحابی اور مہاجر تھے۔ رضی اللہ عنہم۔

کفارہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے غلام پر کسی ایسے جرم کی حد لگائی جو اس نے کیا ہی نہیں یا اس کو طمانچہ مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردے۔" (مسلم)

فائدہ:

قاضی عیاض فرماتے ہیں: اس پر اجماع ہے کہ آزاد کرنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے، تاہم یہ آزادی کو اجر میں بغیر کسی سبب کے آزاد کرنے کے برابر نہیں ہے، مگر اس کی زیادتی کا کفارہ ضرور ہوگی۔

لوگوں کو عذاب دینا

حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا ملک شام میں کچھ عجمی کاشت کار لوگوں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا، اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟

ان کو بتلایا گیا کہ انہیں خراج کی وجہ سے سزا دی جا رہی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ "انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔"

حضرت ہشام نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔"

پھر حضرت ہشام ان لوگوں کے گورنر کے پاس گئے اور انہیں یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان کی بابت حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ خراج، اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو اس زمین کی پیداوار پر عائد کیا جاتا ہے۔ جو کسی اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے قبضہ و تصرف میں ہو اور مسلمانوں کی زمینوں کی پیداوار سے جو مالیہ وصول کیا جاتا ہے، اسے عشر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جزیہ، وہ سالانہ رقم ہے، جو اسلامی مملکت میں رہنے والے ذمیوں سے ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے عوض وصول کی جاتی ہے۔ مسلمان، سالانہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اور غیر مسلم اہل ذمہ جزیہ۔

2۔ عذاب سے مراد، وہ مخصوص قسم کی سخت سزا ہے جو اللہ تعالیٰ جہنم میں جہنمیوں کو دے گا، دنیا میں کوئی ایسی سزا کسی کو دے گا تو اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں ہے اور وہ قیامت والے دن ایسی سزا دینے والے کو سزا دے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کرنا اور سروں پر تیل ڈالنا بھی، جہنم ہی کی سزاؤں میں سے ہے۔ اس لیے صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما کر اس پر گورنر کو متنبہ فرمایا اور انہوں نے یہ سزا موقوف کردی۔

3۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

4۔ ظالموں کو ان کے ظلم سے ڈرایا جائے تاکہ وہ ظلم کے ارتکاب سے باز آجائیں۔

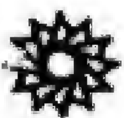
لمبا قیام

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"کون سی نماز افضل ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لمبے قیام والی نماز۔" (مسلم)

فائدہ: معلوم ہوا کہ نماز کے تمام ارکان (رکوع، سجدہ وغیرہ) میں سے قیام کا لمبا کرنا سب سے بہتر ہے کیونکہ قیام جتنا لمبا ہوگا، قرآن اتنا ہی زیادہ پڑھا جائے گا اور قرآن چونکہ افضل ذکر ہے، اس لیے طول قیام بھی افضل ہے۔



بابر

انشا جی

بابر

اک لڑکا ہے دوست ہمارا   سُنا اُس کا حال
ابا کا گھر جالندھر ہے   امی کا بھوپال
چمچہ، بوتل، چوسنی اس کی   امریکہ کا مال
کرتا، ٹوپی، جوتا، موزے   سب میڈ اِن بنگال
ایک نجومی بتلاتا ہے   دیکھ کے ہاتھ کا حال
پڑھنے کو یہ جا کے رہے گا   لندن میں چھ سال
ملکوں ملکوں سیر کرے گا   چین، عرب، نیپال
مری میں اس کی کوٹھی ہو گی   دلی میں سسرال
کابل کی پہنے گا چپل   سری نگر کی شال

اک لڑکا ہے دوست ہمارا
سُنا اُس کا حال

شاعر ہیں سب جھوٹ کے پتلے   کیا کیا کریں کمال
دل سے باتیں جوڑ کے لکھ دیں   دیکھو ایک مثال
انشا نے یہ شعر کہے ہیں   کر کے محض خیال

ابھی تو تین مہینے کا ہے
بابر، ماں کا لال



1 ""اصلی نام؟""
""علی عباس۔""
2 ""پیار کا نام؟""
""بنٹی۔""
3 ""تاریخ پیدائش / شہر؟""
""11 فروری 1986ء / لاہور""
4 ""قد / اسٹار؟""
""5 فٹ 10 انچ / Aquarins (دلو)۔""
5 ""بہن بھائی / آپ کا نمبر؟""
""دو بہنیں ایک بھائی / میرا پہلا نمبر ہے۔""
6 ""تعلیمی قابلیت؟""
""ایل ایل بی، سی ایس ایس پھر ""این سی اے"" سے مزید تعلیم مکمل کی۔""

باتیں علی عباس سے

شاہین رشید

7 ""دنیا میں سب سے زیادہ عزیز؟""
""میرے ابا ان کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔""
8 ""شوبز میں متعارف کرایا؟""
""میرے ٹیلنٹ نے۔""
9 ""شادی؟""
""دو سال ہو گئے۔ ایک بیٹی ہے میری۔""
10 ""پہلی کمائی؟""
""5 ہزار۔ فیصل رحمن کو اسیسٹ کیا تھا اور دو دن کے 5 ہزار ملے تھے۔""
11 ""خرچ کہاں کیے؟""
""2 ہزار والدہ کو دے دیے اور 3 ہزار کے اپنے لیے جوتے خرید لیے تھے۔""
12 ""کیا برائی صرف شوبز میں ہے؟""
""ہرگز نہیں، بلکہ پورے معاشرے میں ہے۔ ہاں شوبز میں یہ برائی ہے کہ لوگ فنکاروں کو پسند کرتے ہیں، قبول نہیں کرتے۔""
13 ""صبح کب اٹھتے ہیں، رات کب سوتے ہیں؟""
""آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے صبح ہوتی ہے اور رات ڈیڑھ بجے تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔""
14 ""صبح اٹھ کر کیا دل چاہتا ہے؟""
""کہ دوبارہ سو جاؤں۔""
15 ""تہوار مناتے ہیں؟""
""عید کا، بسنت، بچپن میں شب برات مناتے تھے مگر اب نہیں مناتے۔ بسنت بھی تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔""
16 ""اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟""
""آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ آج سے دو سال پہلے میرا وزن 87۔ کے، جی تھا اور اب 68۔ کے، جی ہے تو میں نے بہت محنت کی ہے۔ وزن کم کرنے کے لیے۔""
17 ""بھوک میں رد عمل؟""
""چڑچڑا ہو جاتا ہوں اور غصہ بھی آجاتا ہے۔""

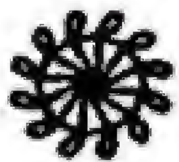
18 ''دوستوں کے معاملے میں؟''
''تھوڑا چوزی ہوں۔ جو بچپن کے دوست ہیں صرف وہی دوست ہیں۔''
19 ''مطالعہ کرتے ہیں؟''
''جی۔ منٹو کو شوق سے پڑھتا ہوں۔''
20 ''انتظار رہتا ہے؟''
''اپنے نئے پروجیکٹ کے آن ایئر ہونے کا۔''
21 ''تھکن میں بھی جانا چاہتے ہیں؟''
''کہیں نہیں' صرف اپنے کمرے میں۔''
22 ''خوشی سب سے پہلے کس سے شیئر کرتے ہیں؟''
''اپنے ابا سے.... پہلے انہیں ہی بتاتا ہوں۔''
23 ''طبیعت میں ضد ہے یا ضبط ہے؟''
''ضد بھی بہت ہے اور ضبط بھی بہت ہے۔''
24 ''دماغ کب گھوم جاتا ہے؟''
''جب نان سیریس لوگ سیریس کام کرنے آتے ہیں۔''
25 ''غصے میں کیفیت؟''
''چلاتا ہوں۔''
26 ''خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟''
''ہر بات اچھی لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دنیا میں خدا کی حسین تخلیق خواتین ہیں۔ خواہ وہ ماں ہو۔ بہن ہو یا بیوی ہو۔''
27 ''پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟''
''نہیں بالکل نہیں۔''
28 ''گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟''
''ابا کے۔''
29 ''کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟''
''شادی' بیٹی اور بہت سی کامیابیاں۔''
30 ''ساری دنیا میں پسندیدہ ملک؟''
''آسٹریلیا۔''
31 ''شاپنگ میں پہلی ترجیح؟''
''بیٹی اور بیگم کے لیے ہی شاپنگ کرتا ہوں۔ اپنے لیے ونڈو شاپنگ کرتا ہوں۔''
32 ''ایک دعا جو ضرور مانگتا ہوں؟''
''کہ مجھے میرے والدین کی صحت مند اور تندرست زندگی میں خدمت کا موقع دے۔''
33 ''کس معاملے میں ڈھیٹ ہیں؟''
''تعریف کے بجائے تنقید کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔''
34 ''کنجوس ہیں؟''
''نہیں.... جو آرہا ہے اسے خرچ ہونا چاہیے۔ کل کے لیے نہیں سوچتا۔''
35 ''بہترین تحفہ؟''
''مجھے میرے رب نے بیٹی کی صورت میں بہترین تحفہ دیا ہے۔''
36 ''کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟''
''کام سے فارغ ہو کر لاہور جانا۔''
37 ''آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟''
''نہیں.... اٹھنے کے بعد اونگھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔''
38 ''مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟''
''کچھ کہہ نہیں سکتے۔ کبھی اپنے بہت اچھے ہو جاتے ہیں اور کبھی پرائے۔''
39 ''چھٹی کا دن کہاں گزارنے کو دل چاہتا ہے؟''
''اپنے بستر پر۔''
40 ''لباس میں کیا پسند ہے؟''
''آرام دہ۔''
41 ''عورت ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟''
''ذہین ہونی چاہیے۔''
42 ''گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟''
''اپنے کمرے میں۔''
43 ''کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟''
''اپنی بیگم کے۔''
44 ''بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟''
''میں ٹی وی کے پروگراموں سے دل بہلاتا ہوں۔ ڈرامے دیکھتا ہوں اور بہت کچھ سیکھتا بھی ہوں۔''
45 ''کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟''
''جی بالکل دو لوگ ایسے تھے۔ میں نے ان کا نام محفوظ کر

لیا ہے کہ بات نہیں کرنی۔"
46 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"اچھی لگتی ہے۔"
47 "پاور میں آجائیں تو؟"
"ایک کشتی میں سارے سیاست دانوں کو بٹھا کر بیچ دریا میں ڈبو دوں گا۔"
48 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"جوتے۔"
49 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کہ اپنا خیال رکھا کرو۔"
50 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"میرے خیال میں بچپن کا دور۔"
51 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"کوشش بہت کرتا ہوں مگر پتا نہیں کیوں لیٹ ہو جاتا ہوں۔"
52 "کن لوگوں پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"اپنے ماں باپ' اپنی بیوی اور بیٹی پر۔"
53 "اپنی کمائی سے کیا قیمتی چیز خریدی؟"
"میں جوتے ہی خریدتا ہوں .... مجھے وہ ہی قیمتی لگتے ہیں۔"
54 "کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی' ٹیبل یا اپنا بیڈ"
"اپنا بیڈ۔"
55 "ہاتھ سے کھاتے ہیں یا چھری کانٹے سے؟"
"ہاتھ سے۔"
56 "عام ریسٹورنٹ سے کھانا کھاتے ہیں یا فائیو اسٹار سے؟"
"عام ریسٹورنٹ سے۔"
57 "ساری دنیا سو جائے اور آپ جاگ رہے ہوں تو کیا چیز لینا چاہیں گے؟"
"کچھ نہیں .... بلکہ سب کو اٹھا دوں گا۔"
58 "انٹرنیٹ سے اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"زیادہ نہیں بس معلومات کی حد تک۔"



59 "ایک دیرینہ خواہش؟"
"باپ ماں کی خدمت اور بیٹی کو اعلا تعلیم یافتہ کرنا۔"
60 "دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"
"دیسی۔"
61 "ایک کھانا جو آپ بھی پکا لیتے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں پکا سکتا۔"
62 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"میرے خیال میں مرد۔"
63 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں ڈرتا ہوں تو صرف اپنی بیماری سے کہ کہیں میں بیمار نہ ہو جاؤں۔"
64 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"جی جی اندھی ہوتی ہے۔"
65 "دکھ ہوتا ہے اس وقت....؟"
"کہ جب کوئی جدوجہد کو تسلیم نہ کرے۔"
66 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی .... مگر میں ان رسموں کے خلاف ہوں۔ یہ فضول خرچی ہے۔"
67 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"کیش۔ اگر تحفہ دینا ہے تو پوچھ کر دیں۔"

68 "ناشتہ کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
"بیگم کے ہاتھ کا۔"
69 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"منٹو سے۔"
70 "اپنا نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟"
"تبدیل نہیں کیا اور نہ ہی سب کو دیتا ہوں۔"
71 "گھر سے نکلتے وقت کیا چیزیں لازمی لیتے ہیں؟"
"گھڑی والٹ فون۔"
72 "زندگی میں کیا مشکل ہے؟"
"خوشی کو ظاہر کرنا.... میں آسانی سے کر دیتا ہوں مگر لوگ نہیں کرتے۔"
73 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"فوراً۔"
74 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"دل کی..."
75 "آپ کی اچھی عادت؟"
"سچ بولنا.... جبکہ نقصان بھی اٹھاتا ہوں۔"
76 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"بہت غصے میں' اکثر کھانا پینا بھی چھوڑ دیتا ہوں۔"
77 "مارننگ شو' آپ کے تاثرات؟"
"میرا خیال ہے کہ مارننگ شو بند ہو جانے چاہئیں۔"
78 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب مسئلہ بنتی ہے جب آپ کسی سے چھپنا چاہتے ہوں۔"
79 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"والٹ اور فون۔"
80 "لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا؟"
"کروٹیں بدلتا ہوں۔"
81 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"ہری مرچیں۔"
82 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب چھٹیاں ہوں اور میں آفس میں ہوں تب۔"
83 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو اٹھ جاتا ہوں۔"
84 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"غصہ۔"
85 "چوبیس گھنٹوں میں کب اپنے آپ کو فریش محسوس کرتے ہیں؟"
"شام سے رات تک۔"
86 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"بیٹی سے ملوں۔"
87 "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"زندگی میں سکون محسوس ہوتا ہے۔"
88 "کیا کر گزرنے کی خواہش ہے؟"
"بہت کچھ' مجھے بہت شہرت حاصل کرنی ہے۔"
89 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"20 سے 25 روپے۔"
90 "اچانک چوٹ لگ جائے تو؟"
"بھولنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ درد کو جتنا محسوس کرو اتنا زیادہ ہوتا ہے۔"
91 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"
"سوئٹزر لینڈ۔"
92 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟"
"تو میں اس کو قبول کروں گا' ویسے ابھی تو شروع ہوئی ہے۔"



ہم سارا سال گوشت کھاتے ہیں۔ سارا سال جانور ذبح ہوتے ہیں۔ گائے بھینس بھیڑ بکریاں اکثر گلی کوچوں میں اپنے مالک کے ساتھ گھوم پھر رہی ہوتی ہیں۔ ہم کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ادھر ذی الحج کا چاند نظر آیا منڈیاں سج جاتی ہیں اور جانوروں سے محبت امڈ آتی ہے۔ مہنگے سے مہنگا جانور خرید کرلاتے ہیں اور نت نئی ڈشوں کی ترکیبیں سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غریب غربا کے لیے یہ قربانی کتنے فیصد ہوتی ہے یہ الگ بحث ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ایک سروے آپ کی خدمت میں.... صرف دو سوالوں کے ساتھ۔

(1) جانور کی خریداری میں آپ خود کتنا حصہ لیتے/لیتی ہیں۔

(2) عید کے دن کوئی خاص ڈش جو آپ خود پکاتے/پکاتی یا پکواتے ہیں؟

عیدِ قرباں کی رونقیں

شاہین رشید

امبر ارشد :۔ (آرٹسٹ)

(1) بقر عید تو بہت اسپیشل ہوتی ہے سچ میں۔ بہت مزہ آتا ہے اور میں اگرچہ میچور ہو گئی ہوں۔ ایک عدد بیٹے کی ماں بھی ہوں۔ مگر میرے اندر بچپنا تو ابھی بھی باقی ہے۔ میں اس عید پہ بہت انجوائے کرتی ہوں اور جب آوازیں آتی ہیں کہ گائے آگئی' گائے آگئی۔ تو بھاگ کر باہر جاتی ہوں اور بچوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہوں' اس وقت تک جب تک گائے اور دیگر جانور سوزوکی سے اتر نہیں جاتے اور باندھ نہ لیے جائیں۔

ہمارا اپارٹمنٹ تو ماشاء اللہ بہت بڑا ہے اور وہاں ہر سال تقریباً "300 کے قریب گائے اور بکرے آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے چھوٹی سی منڈی لگی ہوئی ہے تو مجھے بہت مزہ آتا ہے۔ اور "منڈی" تو میں ضرور جاتی ہوں' جبکہ میرے میاں صاحب منع بھی کرتے ہیں کہ مت جایا کرو' تو کبھی تو شوٹ کے بہانے سے بھی چلی جاتی ہوں اور پھر گھر آکر میاں صاحب کو ساری روداد بتاتی ہوں۔

گزشتہ سال جب میں گئی تھی تو میں نے فیس بک پہ تصاویر بھی لگائی تھیں۔ تو جناب میں بہت شوق سے منڈی جاتی ہوں اور سب کے ریٹ بھی پتا کرتی ہوں' ہاں تھکن بہت ہوتی ہے' مگر گھر آکر ساری تھکن دور ہو جاتی ہے جب ہم گائے لے کر آتے ہیں تو میاں صاحب سوزوکی پہ ہوتے ہیں اور ہم پیچھے پیچھے اپنی گاڑی پہ ہوتے ہیں اور مزے کی بات بتاؤں کہ میں سب بھول جاتی ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں' ایک ماڈل ہوں' صبح اٹھ کر گائے کا چارہ بناتی ہوں اور اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں' بہت خدمت کرتی ہوں گائے کی' یہ تو آفس چلے جاتے ہیں تو میرا بیٹا ابوبکر بھی بہت خوش ہوتا ہے کہ مما Cow کے پاس لے جاتی ہیں اور کھانا کھلا رہی ہیں۔ گھر میں جو گندگی ہوتی ہے اس پر امی بہت چیختی ہیں کہ گھر صاف کرلو۔ مگر ہم تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ خیر پھر گھر بھی صاف کرلیتی ہوں۔ تو بھئی مجھے تو بقر عید میں ہر کام میں مزہ آتا ہے۔ اور پھر گائے کو کٹتے ہوئے بھی دیکھتی ہوں۔ گائے کو ٹہلانے کا کام محلے کے بچوں کے سپرد کر دیتی ہوں۔

(2) ہم ہمیشہ سے ہی عیدالاضحیٰ کے دن کوکنگ خود کرتے ہیں۔ ہمارے ڈیڈی نے ہمیں خاص ہدایت کی ہوئی تھی کہ کھانا گھر کی خواتین ہی پکائیں گی' اور



ہمارے یہاں ماشاء اللہ تین دن دعوتیں ہوتی ہیں۔ تو جناب پہلے دن پلاؤ بنتا ہے اور پلاؤ کے ساتھ شامی کباب کا ہونا لازمی ہے۔ شام کو کڑاہی بناتی ہوں۔ اگلے دن میں بریانی بناتی ہوں جو کم سے کم چار کلو کی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ کچے قیمے کے کباب ہوتے ہیں۔ میں ہر چیز پکا لیتی ہوں۔ بنا لیتی ہوں سوائے میٹھے کے 'کیونکہ مجھے میٹھا پسند نہیں ہے۔ باقی جو کچھ کہیں میں بنا لوں گی۔

فصیح باری خان : ۔ (معروف رائٹر)

(1) جھوٹ نہیں بولوں گا۔ قربانی کے جانور لانے کی ذمہ داری میں نے اپنے بھائی کو دی ہوئی ہے۔ میں اس معاملے میں بالکل بھی تعاون نہیں کرتا اور بالکل بھی حصہ نہیں لیتا۔

(2) مجھے ہنٹر بیف پسند ہے۔ خود تو میں کچھ بھی نہیں پکا سکتا۔ اس لیے یہ ذمہ داری بھی دوسروں کو دی ہوئی ہے۔

جناول پذیر : ۔ (آرٹسٹ)

(1) میں جانور کی خریداری میں حصہ نہیں لیتی اور نہ ہی منڈی جاتی ہوں۔

(2) خاص ڈش دم کا قیمہ ہے، جو میں پکاتی ہوں۔

دانش تیمور : ۔ (آرٹسٹ)

(1) جانور کی خریداری میں پہلے تو بہت دلچسپی لیتا تھا اور اب بھی لیتا ہوں 'مگر اتنا نہیں جتنا پہلے لیا کرتا تھا' کیونکہ اب ٹائم نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے سارے جانوروں سے بہت پیار ہے 'خواہ گائے ہو یا بکرا ہو۔ اب چونکہ خریداری میں حصہ نہیں لے سکتا تو یہ ضرور کرتا ہوں کہ جب جانور گھر آتے ہیں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کا بہت خیال رکھوں اور دوسروں کو بھی خاص ہدایت دیتا ہوں کہ خیال رکھا جائے۔

(2) مجھے عید کے دن یعنی پہلے دن کلیجی کھانا اچھا لگتا ہے تو اس لیے فرمائش کرکے پکواتا ہوں۔

اریج فاطمہ : ۔ (آرٹسٹ)

(1) مجھے جانوروں کی بدبو سے ذرا پرابلم ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نہ میں جانوروں کے قریب جاتی ہوں اور نہ ہی کبھی منڈی جانے کا سوچ سکتی ہوں اور گھر میں جانور آئے تو میں اس کے قریب نہیں جاتی' ایک بدبو کی وجہ اور دوسرے اس وجہ سے کہ پھر جانور سے پیار ہو جاتا ہے اور پھر میں اسے ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔

(2) اور میں بیف نہیں کھاتی مٹن پھر بھی کھا لیتی



یہ میرے شوہر کا کام ہے' وہ چلے جاتے ہیں اور خرید کر لے آتے ہیں۔

(2) پکانے کا ڈیپارٹمنٹ میرا ہے اور ماشاء اللہ سے سب ہی کچھ پکتا ہے اور بڑی ورائٹی ہوتی ہے اس عید پر' مطلب عید الاضحیٰ پہ اور پکاتی وہی چیزیں ہوں جو سب کو پسند ہوتی ہیں۔ جیسے "بریانی' کڑاہی' قورمہ" اور "چپلی کباب" اور پکاتی تو میں خود ہی ہوں۔ کیونکہ میرے ہاتھ کا ذائقہ سب کو ہی پسند ہے۔

وجیہہ ثانی :۔ (نیوز کاسٹر)

(1) عید کے جانور کی خریداری چونکہ سنت ابراہیمی ہے تو ضرور کرتے ہیں۔ بچپن میں بہت شوق تھا' منڈی جاتے تھے اپنی پسند سے جانور خریدتے تھے۔ اب وقت کم ملتا ہے۔ مگر پھر بھی کوشش ہوتی ہے کہ منڈی جائیں اور جانور خود خرید کر لائیں۔ گزشتہ سال مجھے یاد ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر منڈی گیا تھا اور اپنی پسند سے جانور خرید کر لایا تھا اور صرف خریداری کا ہی شوق نہیں ہے بلکہ جب تک جانور گھر پہ ہوتا ہے اس کی خوراک کا بھی بہت خیال رکھتا ہوں کہ وقت پہ چارہ ملایا نہیں اور ہاں یہ بھی آپ کو بتاؤں کہ بچپن سے ہی مجھ میں ایک اچھی عادت ہے کہ "قربانی اپنے ہاتھ" سے کرتا ہوں۔

(2) قربانی اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں مگر کھانا بالکل





ہوں تو خود تو نہیں پکاتی لیکن کلیجی ضرور پکتی ہے گھر میں۔ تو وہ میں کھا لیتی ہوں۔

عاطف حسین :۔ (معروف ڈائریکٹر)

(1) قربانی کا جانور خود لینے جانا پڑتا ہے۔ (کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے) اللہ تعالیٰ کی محبت میں قربانی کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ ہم نہیں جائیں گے۔ اپنی فیملی میں' اپنے بچوں کو اپنی نئی نسل کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے تو پھر آگے چل کر انہیں بھی اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا۔ تو جو آج ہم کریں گے وہی آگے چل کر ہماری نسلیں بھی کریں گی۔ کیونکہ بڑے ہی ان کے لیے رول ماڈل ہوتے ہیں۔

(2) سچ پوچھیں تو مجھے تو پورا سال بقر عید کا انتظار رہتا ہے' اس لیے قربانی کی کلیجی کا جو مزہ ہے وہ الگ ہی ہے۔ عام دنوں میں ایسی لذت والی اور اچھی کلیجی نہیں ملتی۔ قربانی کے دن ہم لوگ ناشتہ نہیں کرتے کیونکہ قربانی کے فوراً" بعد کلیجی بنتی ہے اور ہم پوری فیملی مل کر کھاتے ہیں۔

صائمہ قریشی :۔ (آرٹسٹ)

(1) قربانی کے جانور کی خریداری میں' میں حصہ نہیں لیتی۔ کبھی بھی قربانی کے جانور خریدنے نہیں گئی'

ہی نہیں کرتا کچھ کھانے کو تو میں تو عید کے دن کھٹی دال اور چاول بہترین کھانا لگتا ہے اور میرے میاں صاحب بھی میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور ایسا شادی کے بعد نہیں ہے بلکہ شادی سے پہلے بھی ان کی بھی یہی سوچ تھی۔۔۔ بقر عید منانا چونکہ ایک مذہبی فریضہ ہے اور مذہبی لحاظ سے اور اخلاقی لحاظ سے ہمیں اس میں حصہ لینا چاہیے چنانچہ قربانی کی نیت کا جو پیسہ ہوتا ہے وہ ہم کسی ویلفیئر ٹرسٹ میں دے دیتے ہیں۔



مصطفیٰ چوہدری :۔ (آرٹسٹ)

(1) جب چھوٹے تھے تو اپنے بڑوں کے ساتھ جانوروں کی خریداری کے لیے ضرور جایا کرتے تھے مگر اب چونکہ بڑے بھی ہو گئے ہیں اور مصروفیات بھی زیادہ ہو گئی ہیں تو ٹائم نہیں ملتا لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ شہر کے اندر یا گھر کے قریب جو منڈی لگتی ہے' وہاں سے لے لیں اور میرے جو چھوٹے بھانجے بھانجیاں ہیں انہیں بہت شوق ہے تو ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے بڑوں کے ساتھ جایا کرتے تھے۔

(2) اور جناب بقر عید کے دن کا گوشت تو مزے دار اور فریش ہوتا ہے تو ہر پکوان اچھا لگتا ہے اور میں تو پورے سال بقر عید کا انتظار کرتا ہوں کہ اچھا گوشت کھانے کو ملے۔ ویسے عموماً" پہلے دن تو کلیجی ہی کھانے



بھی اپنے ہاتھ سے نہیں پکاتا۔ کوکنگ کے معاملے میں بالکل "زیرو" ہوں' میں آملیٹ بنا سکتا ہوں' انڈا فرائی کر سکتا ہوں اور چائے بھی بنا سکتا ہوں۔ مگر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کوکنگ کروں' ماشاء اللہ میری بیگم بہت اچھی کک ہے۔ امی اور بیگم مل کر پلان کرتے ہیں کہ عید پر کیا بنے گا اور ان کی بدولت عید پر چٹ پٹے کھانے کھانے کو مل جاتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتے ہیں۔

کیف غزنوی :۔ (آرٹسٹ)

(1) میرا جواب آپ کو بہت مایوس کرے گا۔ کیونکہ میں بقر عید اس طرح نہیں مناتی جس طرح ہمارے پاکستان میں ایک روایتی انداز میں منائی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے سات سال کی عمر میں اپنے گھر کے باہر جانور کو ذبح ہوتے دیکھا تھا تو وہ میرے لیے ایک بہت ہی ڈراؤنا تجربہ تھا' اور اس کے بعد سے ہی میں نے اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے سے روک دیا تھا اور میرے گھر والوں نے بھی میرا ساتھ دیا تھا کہ جس چیز سے میں اتنا خوفزدہ ہو جاتی ہوں وہ کام میرے سامنے نہ ہو"۔

(2) جہاں تک گھر میں کھانا پکانے کی بات ہے تو عید کے دن بہت سادا کھانا پکتا ہے۔ کیونکہ گھر کے ارد گرد جانوروں کے خون کی بہت بدبو ہوتی ہے لہٰذا دل

جاسکتا ہے۔

ظفر معراج : ۔ (ڈرامہ نگار)

(1) میرا تعلق تو ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے، جس میں لوگ آج بھی مالداری (cattle farming) پہ گزارہ کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں جانوروں کی خریداری کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں قربانی کا جانور "پالا" جاتا ہے۔

(2) میں سبزی خور انسان ہوں۔ البتہ مچھلی شوق سے کھاتا ہوں۔ اس لیے گوشت خوری سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔ مگر "دنبے" کے گوشت کا پلاؤ (جس کو کابلی پلاؤ بھی کہتے ہیں) ضرور پکواتا ہوں اور باقاعدہ دعوت کرتا ہوں اور سب کو بلاتا ہوں۔ مجھ سے قربانی کا گوشت کھایا بھی نہیں جاتا۔ عجیب بھاری سا لگتا ہے۔

محسن عباس حیدر : ۔ (ڈی جے + آرٹسٹ 'مذاق رات)

(1) میں بچپن سے ہی قربانی کے جانوروں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب قربانی ہوتی تھی تو میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کافی دن پہلے جانور لے آتے تھے اور پھر اس سے بہت مانوس بھی ہو جاتے تھے' کیونکہ صبح اٹھ کر اس کو





کو دل چاہتا ہے اور وہی پکتی بھی ہے۔ باقی کوئی پکوان ہو۔ یا بار بی کیو ہو مزہ آتا ہے کھانے میں۔

اقبال بانو : ۔ (ناول و افسانہ نگار + ڈرامہ رائٹر)

(1) ہم نے کیا حصہ لینا ہمارے تو اپنے ڈیرے پہ سب جانور ہوتے ہیں' جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ میرے بیٹے کو بہت شوق ہے جانوروں کا تو اس کی خوشی کے لیے عید سے دو دن پہلے بکرا اور گائے جو قربانی کی نیت کے ہوتے ہیں' انہیں گھر لے آتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو ویسے بھی کوئی خاص مہمان آجائے تو ہم بکرا ذبح کر لیتے ہیں اس کی خاطر داری کے لیے' عید کے دن عید کی نماز پڑھ کر قصائی آجاتا ہے اور یوں قربانی ہو جاتی ہے۔

(2) عید کے دن سب سے پہلے کلیجی بناتے ہیں۔ شام کو پائے یا پھر اگلی صبح کے لیے پائے پکا لیتے ہیں۔ بقر عید کے دن نمک والا گوشت بھون کر پکاتے ہیں جو کہ ہمارے گھر میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ یخنی والا پلاؤ بھی پکتا ہے اور سب کچھ میں خود پکاتی ہوں اور میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کلیجی تو میرے سسرال والوں کو بہت پسند ہے۔ سسرال والے کہتے ہیں کہ اقبال بانو سے اچھی کلیجی تو کوئی پکا ہی نہیں سکتا۔ بار بی کیو نہیں کرتے کیونکہ وہ تو عام دنوں میں بھی کہیں سے بھی جا کر کھایا



چارہ ڈالنا۔ اس کو تیار کرنا اور پھر اسے کھانے پھرانے لے جانا۔ تو اس سے بہت دوستی ہو جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ ہمارے گھر کا ہی فرد ہو۔ تو آج بھی وہ روایت اور جذبات قائم و دائم ہیں۔ اور اب بھی میں جب بقر عید کے دنوں میں گھر جاتا ہوں تو سب میرے منتظر رہتے ہیں کہ محسن آئے تو جانور کی خریداری کی جائے اور پھر میں پوری بارات لے کر جاتا ہوں۔ گھر کے بڑوں کے ساتھ بھانجے بھانجیوں کے ساتھ اور جانور خرید کر لاتے ہیں۔ یہ مذہبی فریضہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اس سے یکجہتی کا بھی درس ملتا ہے اور قربانی کے بعد گوشت کی تقسیم بچوں کو درس دیتی ہے کہ قربانی کا اصل مقصد کیا ہے۔ حقوق العباد کیا ہوتے

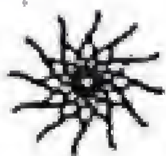


ہیں۔ منڈی میں لوگوں کے جوش و جذبات دیدنی ہوتے ہیں۔ ادھر گھر کی خواتین بھی انتظار میں ہوتی ہیں کہ کب جانور آئیں اور کب ان کی خاطر کریں۔

(2) ہمارے گھر میں سب سے پہلے کلیجی گردے بنائے جاتے ہیں۔ پہلے میری والدہ بنایا کرتی تھیں۔ اب ان کے انتقال کے بعد یہ فریضہ بہنیں اور خالہ انجام دیں گی۔ (والدہ کے انتقال کو چند ہی ماہ ہوئے ہیں ان کی یاد بہت ستائے گی) باربی کیو کا اہتمام چھت پر ہوتا ہے۔ مٹن کڑاہی بھی بنائی جاتی ہے' میں بہت خوش خوراک آدمی ہوں اس لیے فرمائش کر کے



پکوان بنواتا ہوں۔ تو بڑا مزہ آتا ہے۔ تو جناب خوش رہنا خوش رکھنا ہمیں دین اسلام سکھاتا ہے۔ تو عید الفطر ہو۔ رمضان المبارک ہو یا عید الاضحیٰ ہو بچپن سے ہی میں بہت اہتمام کے ساتھ مناتا ہوں۔



حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا' اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے' کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا' وہ شوق' وہ جستجو' وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی' دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی' ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے' یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے' ہم جن کو پسند کرتے ہیں' جن سے لگاؤ رکھتے ہیں' ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں' ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے' سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے' خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے' اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں' مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

حنا یاسمین

میں پہلی دفعہ اس ادارے کے کسی سروے میں شرکت کر رہی ہوں۔ جیسے میں پچھلے پندرہ سالوں سے جانتی ہوں اور پہلی دفعہ کوئی کام کرنے کی خوشی اتنی انمول ہوتی ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے بہت ساری دعاؤں

کے ساتھ اس سروے میں ترتیب شدہ سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

1۔ لکھنے کا شوق مجھے مطالعے کے شوق نے ڈالا۔ مستنصر حسین تارڑ۔ اشفاق احمد' نسیم حجازی کو میں نے چھوٹی عمر میں تب پڑھ لیا تھا جب مجھے لفظوں سے اتنی آشنائی نہیں تھی۔ میری چھوٹی سی دنیا میں کہانیوں کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس دنیا میں بسنے والے ہر کردار کے محسوسات میرے اندر اترا کرتے تھے۔ سنڈریلا۔۔۔ عمرو عیار۔۔۔ سندباد۔۔۔ سے لے کر عمران سیریز۔ جاسوسی۔۔۔ سسپنس ڈائجسٹ سے لے کر خواتین کے تمام ڈائجسٹ میں نے پڑھے۔ اپنے پڑھنے کے ٹیسٹ کو مزید تب میں نے بدلا ہوا محسوس کیا جب میں نے ہارڈی' آسکر وائلڈ' سلویا پلاتھ وغیرہ کو پڑھا۔ بس ان ہی کرداروں کے اندر گھومتے ہوئے مجھے اپنے اردگرد کے کردار اکساتے کہ میں بھی ان پہ لکھوں۔ خصوصاً "کینٹو بری ٹیل میں مصنف نے جس طرح اپنے دور کے کرداروں کی حرکات و سکنات' نشست و برخاست' لباس' عادات' خیالات کو موضوع بحث بنایا۔ مجھے اور انسپائریشن ملنے لگی کہ کچھ لکھوں۔۔۔ بھلا میں لکھ سکتی ہوں کہ نہیں۔۔۔؟ میرے گھر میں سب کو پڑھنے کا شوق ہے۔ لکھنے کا شوق صرف میرے اندر ہی آیا۔

2۔ میرے گھر والے میری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ خاص طور پر میرے ایک بھائی جنہوں نے میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ میری بہن 'فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' عنیزہ سید کی اسٹوریز بڑی دلچسپی سے پڑھتی رہی ہے۔ اس طرح میرے کزنز بھی میری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ میری ہونے والی نند اور فیانسی بھی۔۔۔ باجی اور بھائی تو باقاعدہ تبصرہ کرتے ہیں۔ کسی جملے کو پسند بھی کریں گے' کسی پر اعتراض بھی۔۔۔ اپنی بڑی اچھی آرا بھی دیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ میں بڑی منتیں کر کرکے ان کو اپنی اسٹوریز پڑھواتی ہوں۔۔۔ ہاہاہا۔

3۔ تیسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے بڑی شرمندگی سی ہو رہی ہے آمنہ آپی! چلیں کوشش کرتی ہوں۔ در حقیقت میں نے بہت کم لکھا ہے۔ میرے کریڈٹ پر چند ہی کہانیاں ہیں' پر یہ بات سچ ہے کہ ڈائجسٹ میں چھپنے والے خطوط میں قاری بہنوں نے ہمیشہ میری کہانیوں کی تعریف ہی کی ہے۔ میں نے ابھی تک اپنی کسی کہانی پر کوئی تنقیدی جملہ نہیں پڑھا۔ فیس بک پر ہونے والی ووٹنگ میں میرے ناول "کن فیکون" کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ میرا پہلا ناول تھا اور ابھی تک پہلا ہی ہے۔ آرمی کالج میں انٹرمیڈیٹ کو کیمسٹری پڑھانے کے چکروں میں مجھ سے لکھا نہیں گیا۔ سارا دن کیمیکلز کی دنیا میں رہ رہ کر ادبی ذوق کیمسٹری فارمولاز' تھیوریز میں ہی گم ہو گیا۔ اب الحمدللہ فراغت نصیب ہوئی ہے تو میں ضرور لکھوں گی۔

4۔ مجھے نمرہ احمد' عمیرہ احمد' تنزیلہ ریاض' نسیم حجازی بہت پسند ہیں۔ نسیم حجازی تو میرے موسٹ فیورٹ ہیں۔ اس طرح شعیب منصور نے چاہے لکھا نہیں پر ان کی فلمیں اور ان کے ڈائیلاگز مجھے بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔ سمیرا حمید کو پہلی دفعہ "یارم" میں پڑھا' بڑا با کمال لکھتی ہیں۔ بہت اچھے الفاظ' نمرہ نے تو "جنت کے پتے" کو شاہکار بنا دیا۔ عالیہ بخاری کا معاذ والا ناول۔۔۔ سیرہ۔۔۔ اس طرح رخسانہ نگار کا زندگی اک روشنی۔۔۔ ماہم یک شہر آرزو بھی بہت یاد آتے ہیں۔ رفعت سراج کا دل' دیا' دہلیز اور شازیہ چوہدری کا شہر دل کے دروازے۔۔۔ عمیرہ' کا امربیل اور فرحت اشتیاق کا "وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر" ہارڈی کا لاڈم بیڈی۔۔۔ اور اینٹون چی کوو کا cherry orchaed The ۔۔۔ دل کو چھو لینے والے۔۔۔ مسمرائز کر دینے والے ناول تھے۔ مجھے پوری جزئیات اور ڈائیلاگز کے ساتھ یاد ہیں' پر صرف پسندیدہ ڈائیلاگز۔۔۔

5۔ مجھے بہت سارے اقتباس پسند ہیں۔۔۔ پر کچھ لکھ

دیتی ہوں۔

"حیا! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں یہ ضروری ہے اور وہ ضروری ہے۔ میں تمہیں بتاؤں' زندگی میں کچھ بھی ضروری نہیں ہوتا' نہ مال' نہ اولاد' نہ رتبہ' نہ لوگوں کی محبت۔ بس آپ ہونے چاہئیں اور آپ کا اللہ سے ایک ہر پل بڑھتا تعلق ہونا چاہیے۔" (جنت کے پتے' نمرہ احمد)

"اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں' وہ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں.... وہ ہر بات نہیں کرلیتیں"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

(نمرہ احمد' جنت کے پتے)

پسندیدہ اشعار

بڑے زور و شور سے چل رہا ہے کاروبار محبت
کہیں چاہتیں بک رہی ہیں کہیں لوگ بدل رہے ہیں

اس کے ساتھ میں اجازت چاہوں گی۔ خواتین ڈائجسٹ اور تمام قاری بہنوں کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ۔۔۔ اللہ ہمارے آنے والے لمحوں کو ہمارے لیے آسان بنائے اور چلتی سانسوں کو آزمائشوں کے دھوئیں میں نہ سلگنے دے.... آمین۔

نبیلہ ابر راجہ

1۔ لکھنے کا شوق مجھے گھر کے ماحول سے منتقل ہوا۔ سب ہی پڑھنے کے شوقین تھے اور رہی بات لکھنے کی صلاحیت کی تو وہ میرے علاوہ ابھی تک کسی اور کو عطا نہیں ہوئی ہے (میرے خاندان میں) لیکن میری بیٹی ایمان کو لکھنے کا شوق ہے۔ تھری کلاس میں اس نے بچوں کے لیے پہلی کہانی لکھی اور فورتھ کلاس میں اس نے میرے لیے پہلی نظم لکھی۔ اسکول میں ہونے والے مختلف مضمون نویسی کے مقابلوں میں ایمان نے بہت سے انعامات جیتے اور تعریفیں وصول کی ہیں اور میرے علاوہ کسی بہن بھائی کو لکھنے کا شوق نہیں ہے۔

2۔ میرے خاندان والے خاص طور پہ کزنز میری تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں اور اگر میں کہیں ان کے ساتھ جاؤں تو بہت فخر سے تعارف کرواتی ہیں۔ ددھیال' ننھیال دونوں طرف یہی صورت حال ہے۔ سب خوش ہوتے ہیں اور اب سسرال میں بھی میری ساس' دیورانیاں' دیور اور دیگر رشتہ دار' خوشی خوشی میرے بارے میں سب کو بتاتے ہیں کہ ہماری بہو رائٹر ہے اور تحریروں پہ بہت کچھ سننے کو ملتا ہے کہ تم مستقل مزاجی سے نہیں لکھتیں اور اس طرح کے بہت سے جملے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

3۔ ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں لکھا جسے لکھ کر اطمینان محسوس کیا ہو۔ اب تک کی لکھی گئی تحریروں میں مجھے "اب دل کو بھی سمجھانا ہے' عجیب مسافر دشت تھے' دو انچ کی چوڑی" اور "میرا بچپن میری عیدیں" کافی پسند ہیں۔

4۔ لمبی فہرست ہے۔ عمیرہ احمد' عنیزہ سید' رفعت ناہید سجاد' فائزہ افتخار' فارحہ ارشد' سائرہ رضا' صائمہ اکرم چوہدری اور آج کل سمیرا حمید کو شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ سمیرا حمید کا شعاع میں شائع ہونے والا ناول "محبت من محرم" میں نے خاص طور پہ اپنی بیٹی ایمان کو پڑھنے کے لیے دیا۔ کہانی کے مرکزی کردار کی جدوجہد مجھے بہت پسند آئی۔

5۔ پسندیدہ اقتباس

"خدا جب پتھریلے راستے ہمارے مقدر میں لکھتا ہے تو ان راستوں پہ چلنے کے لیے مضبوط جوتے بھی دیتا ہے۔"

پسندیدہ شعر

زندگی ریشم کم خواب نہیں ہے اے دوست
تجھے جینا ہے تو پتھر کا جگر پیدا کر!



خامشی کو بیاں ملے

امت الصبور

سندس خلیل.....لاہور

(1) تعلیم' تعارف اور مشاغل؟

اپنا آپ کسی کے سامنے متعارف کروانا ہمیشہ سے میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف رہا ہے۔ بہر حال اس فانی زندگی میں بہت سے لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب تعارف لازمی امر بن جاتا ہے جیسا کہ "خواتین ڈائجسٹ" کا یہ سلسلہ "میری خاموشی کو زباں ملے" تو جناب! علوم و فنون اور تعلیمی لحاظ سے میں ابھی طفل مکتب ہوں اور حال ہی میں ایف ایس سی (فرسٹ ایئر) کے امتحانات دے کر فارغ ہوئی ہوں۔ اب بہتر نتائج کا انتظار ہے۔ میرے مشاغل میں مطالعہ کتب سر فہرست ہے۔ فارغ اوقات میں میرے نزدیک کتاب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں۔ اس کے علاوہ سہیلیوں اور کزنوں کو SMS یعنی ہوائی پیغامات بھیجنا بھی میرا اہم مشغلہ ہے۔

(2) خوبیاں' خامیاں۔

ابھی تعارف کا کٹھن مرحلہ طے کیا ہی ہے اور ساتھ ہی ایک اور مرحلہ درپیش آ گیا یعنی کہ اپنی خوبیاں اور خامیاں بتانا۔ اب اگر میں اپنی تعریفیں خود کرنا شروع کر دوں تو پھر تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف بات ہو گئی نا۔ تعریف تو وہی ہے جو دوسرے آپ کی کریں۔ خیر میرے عزیز' دوست اور اہل خانہ میری ذہانت (جو کہ صرف پڑھائی تک محدود ہے) کی برملا تعریف کرتے ہیں۔ مجھے اپنی ایک عادت بہت پسند ہے کہ میں بات دل میں نہیں رکھتی بلکہ منہ پر کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ اسی وجہ سے میرا حلقہ احباب کافی تنگ ہے۔ خامیاں تو ہر بشر کی طرح مجھ میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً "میں بھلکڑ ہوں' غصے کی تیز ہوں اور بقول میری والدہ محترمہ "بلا کی ــــ لاپروا اور بے وقوف ہوں۔" میرا خیال ہے کہ اگر میں ان خامیوں پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالوں تب یہ اپنی جگہ پر براجمان مسکرا رہی ہوں گی۔

(3) خواتین سے وابستگی؟ کون سی تحریریں ہیں جو فراموش نہیں کر سکیں؟

خواتین ڈائجسٹ سے میری وابستگی تقریباً "آٹھ" سالوں سے ہے اور مجھے اس رسالے کے توسط سے دنیا کے کئی رنگ ڈھنگ پتہ چلے۔ سب سے پہلے جو ناول میں نے پڑھا وہ "فرحت اشتیاق" کا خوب صورت ناول "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" تھا جو آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ عمیرہ احمد کا "من و سلویٰ" میں نے بہت شوق سے پڑھا اور وہ بھی میرے دل پر چھا گیا۔ میری والدہ محترمہ نے تو اس کی آخری قسط کو اپنے دل پر لے لیا اور "زینب" کے انجام سے دل گرفتہ ہو کر وہ بیمار پڑ گئیں۔ اس ناول کے بعد میں نے "پیر کامل" اور "لاحاصل" بھی پڑھا۔ عمیرہ احمد کی بات ہی سب سے الگ ہے اور ان کی تعریف میں الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ نگہت سیما کا "زر گزیدہ" "برزخ" اور "نجات دہندہ" بھی اپنی مثال آپ ہے۔

(4) پسندیدہ شعر' نظم' پسندیدہ کتاب؟

پسندیدہ اشعار تو بہت سے ہیں خاص طور پر "پیر کامل" کے آغاز میں لکھا گیا یہ شعر بھلائے نہیں بھولتا۔

میرے ہاتھوں اور ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
کہ میں نے اسم محمد کو لکھا بہت اور چوما بہت

اس سال دو کتابیں پڑھیں جو دونوں ہی لازوال ہیں "پیر کامل" اور "لاحاصل" اس کے علاوہ مجھے حفیظ جالندھری کی "شاہنامہ اسلام" بہت پسند ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں دل کی گہرائیوں سے پڑھتی ہوں۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میری من پسند نظمیں ہیں

☆

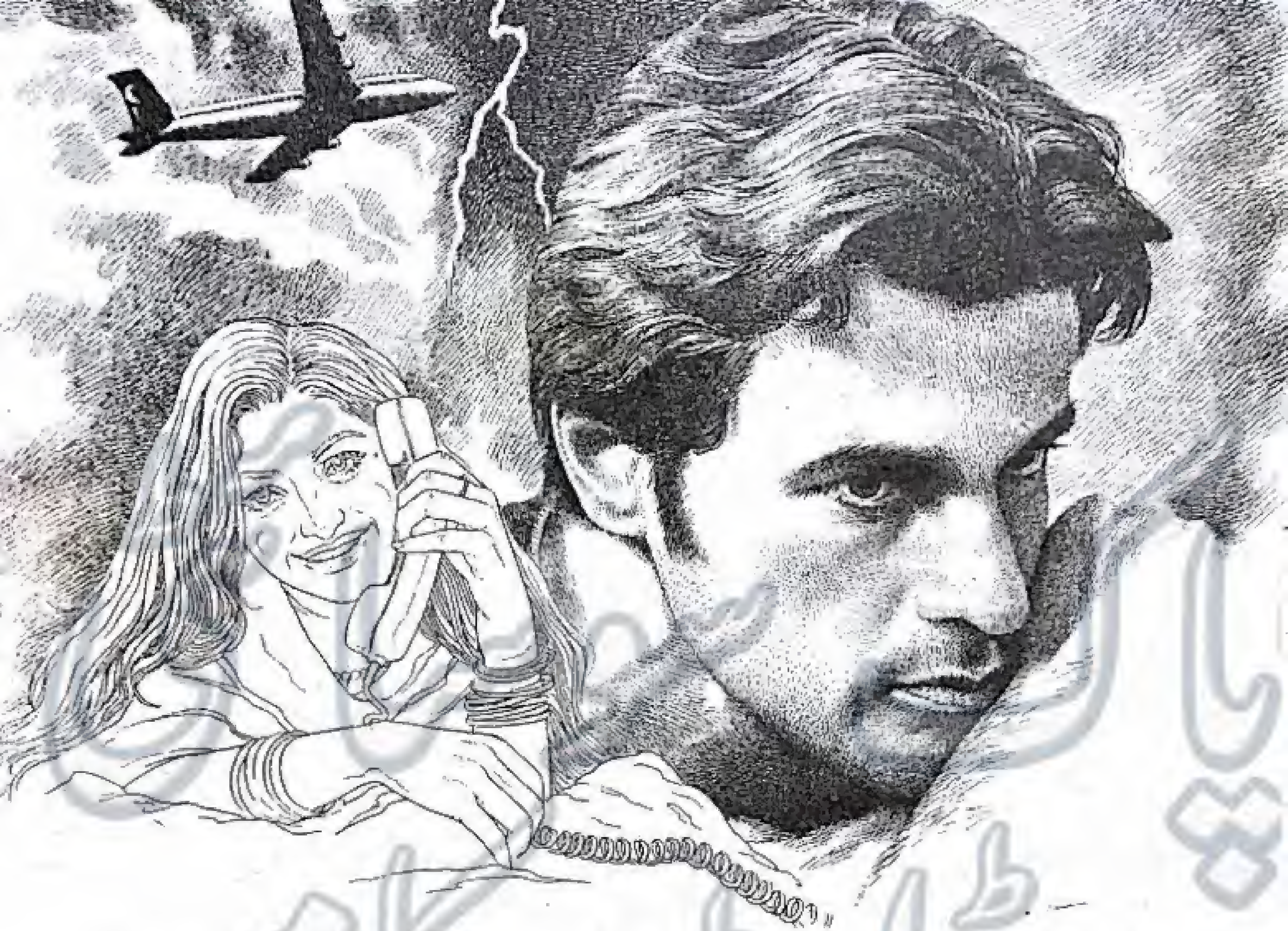
عمیرہ احمد



آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی نیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

بارہویں قسط

حاصل و محصول

کھڑکی سے سالار نے واشنگٹن میں ڈوبتے ہوئے سورج پر ایک آخری نظر ڈالی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاعیں جہاز کے دودھیا پروں کو بھی ایک روپہلا رنگ دے رہی تھیں۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ ہوا میں معلق۔۔۔ نہ آسمان پر نہ زمین پر۔ اور یہی کیفیت سالار سکندر کی بھی تھی۔

واشنگٹن ایئرپورٹ سے اس چارٹرڈ طیارے نے کچھ دیر پہلے کنشاسا کے لیے ٹیک آف کیا تھا جہاز میں عملے کے افراد کے علاوہ صرف دو اور افراد تھے جو اس کا اسٹاف تھا۔ 37 سال کی عمر میں وہ ورلڈ بینک کا کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور اس کی تعیناتی چار دن پہلے ہوئی تھی۔

ورلڈ بینک کے بورڈ آف گورنرز کے ایک ہنگامی اجلاس نے متفقہ طور پر اسے افریقہ کے لیے ورلڈ بینک کا نیا نائب صدر۔۔۔ نیا چہرہ۔۔۔ چنا تھا۔ یہ عہدہ ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار کسی غیر افریقی کو دیا گیا تھا اور دینے کی وجوہات ساری دنیا کے سامنے تھیں۔ سالار کی زندگی میں وہ "صدیوں جیسے چند دن" نہ آئے ہوتے تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ اپنے اس "حاصل" پر فخر کرتا۔ اسے کامیابی کی انتہا محسوس کرتا۔۔۔ آگے کے مقاصد نئے سرے سے طے کرتا۔۔۔ اپنی امنگوں کا دائرہ بڑھا دیتا۔۔۔ نئے مقاصد۔۔۔ ترقی کی بھوک اور بڑھتی۔۔۔ ناموری کی خواہش سرکنڈوں کی رفتار سے بڑھتی۔۔۔ اس کا طرز زندگی پہلے دن سے یہی رہا تھا۔ دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں نے اسے یہی پڑھایا تھا۔ دنیا کی بہترین کمپنیز اور آرگنائزیشنز میں کام کرنے کے تجربے نے اسے یہی سکھایا تھا۔ آگے بڑھتے جانا' کامیابی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جانا۔ ایک کامیابی کی اینٹ پر دوسری کامیابی کی اینٹ رکھنا۔ اس سے بڑی کامیابی کی اور زینہ بناتے جانا۔۔۔ آگے۔۔۔ آگے۔۔۔ اور آگے۔۔۔ اوپر۔۔۔ اوپر۔۔۔ سب سے اوپر۔۔۔ ترقی۔۔۔ اور ترقی۔۔۔ اتنی ترقی کہ انسان صرف سی وی میں درج فتوحات اور کامیابیوں سے پہچانا جائے۔ کسی معمولی انسان کی طرح شناختی کارڈ میں لکھے نام' ولدیت اور ایڈریس سے نہیں۔۔۔

وہ بھی ایسا ہی تھا۔ دین کی طرف رغبت رکھنے کے باوجود دنیا کی ہوس سے پیچھا نہ چھڑانے کی اہلیت رکھنے والا۔۔۔ وہ بھی ناموری چاہتا تھا۔۔۔ نہ ماننے کے باوجود بے پناہ عروج اور کامیابی کا کیڑا اس کے وجود کو بھی گھن کی طرح لگا ہوا تھا مگر اس کو کبھی دیکھا نہیں تھا کیوں کہ کیڑے نے اس کے وجود کو کھوکھلا کر کے ابھی اسے منہ کے بل گرایا نہیں تھا۔

اور ان چند دنوں نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر کو بیٹھ کر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ زندگی میں چاہتا کیا تھا۔ پہلے امامہ تھی جس کا نہ ملنا اس کے وجود کو ٹیس زدہ کیے رکھتا تھا۔ اس کو لگتا تھا۔ وہ بے کلی' بے قراری صرف محبت کے نہ ملنے کی وجہ سے ہے۔ وہ خالی ہاتھ اور خالی دل تھا اس لیے تکلیف میں تھا' لیکن اب کیا تھا جو زندگی میں بے سکونی کے اس پودے کو بنجر نہیں ہونے دے رہا تھا جو پتا نہیں کس مقام پر اس کے وجود کے اندر اگ آیا تھا۔

سب کچھ جو پاس تھا۔۔۔ خاک تھا۔ جو مٹھی میں تھا۔۔۔ ریت تھا۔ جو نظر میں تھا' فریب تھا۔۔۔ اور ان سب کے بیچوں بیچ وہ شخص۔۔۔ دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں سے ایک۔۔۔ بہترین مذہب کی پیروی کرنے والا۔۔۔ آخری آسمانی کتاب کا حافظ۔۔۔ ترقی اور کامیابی کے مینار پر کھڑا خود کو ویسے ہی معلق محسوس کر رہا تھا جیسے وہ جہاز جس میں وہ اس وقت بیٹھا' وہاں جا رہا تھا جہاں سے مغربی دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے شہریوں کو نکال چکے تھے۔

چار دن پہلے اس رات اس ہوٹل کے کمرے میں امامہ کی کال نہیں آئی تھی۔ پھر اس کے بعد میسجز' کالز کا سیلاب آ گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں اسی ہوٹل میں ایک ڈیلیکس کمرے سے اسے رائل سویٹ میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہترین سیکورٹی دی گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی "زندگی" کو "خطرہ" تھا۔

امریکا کا ہر چھوٹا بڑا چینل اس وقت یہی ایک خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلا رہا تھا کہ سالار سکندر کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ غائب کیوں تھا؟ وہ اس ساری صورت حال کے بارے میں کوئی بیان کیوں نہیں دے رہا تھا؟ پیٹرس ایباکا کے بارے میں کیوں خاموش تھا؟ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ اور پروجیکٹ کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہہ رہا تھا' جو متنازعہ تھا؟

اور سالار سکندر چینلز پر چلنے والی ان بریکنگ نیوز اور الرٹس کے درمیان ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کے لیے تیاری کر رہا تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کی درخواست پر ہو رہی تھی۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز سے ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کی بھیک مانگتے مانگتے "کتا" بن کر وہاں سے نکلا تھا اور اب اسی صدر کی منت بھری درخواست پر وہاں صدر کے ذاتی استعمال میں آنے والی کاروں میں سے ایک' شوفر سمیت لیموزین میں بادشاہوں کی طرح سیکورٹی اور پروٹوکول کے ساتھ وہاں بلایا جا رہا تھا۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لیموزین میں بیٹھا تھا نہ زندگی میں پہلی بار سیکورٹی اور پروٹوکول کے "لوازمات" چکھ رہا تھا' مگر زندگی میں میں پہلی بار اسے اس گھٹن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس کے سینے کو پنجرے میں قید پرندہ کر رہی تھی۔۔۔ بے بس۔۔۔ پھڑپھڑاتا۔۔۔ قید میں آزادی کے لیے بے قرار۔۔۔ آسمان کی کھلی فضا کو حسرت سے دیکھتا۔۔۔ دل تھا کہ لگتا تھا بند ہو کر ہی دم لے گا۔۔۔ سانس تھا کہ بند ہونے کے لیے مچلتا پھر رہا تھا اور وہ اس کیفیت اور حالت میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملنے جا رہا تھا جب کہ وہ وہاں کبھی دوبارہ تھوکنے کے لیے بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔

ہیڈ کوارٹر کے باہر پریس موجود تھا' اپنے مشین گنوں جیسے کیمروں اور مائیکس کے ساتھ۔۔۔ بجلی کی طرح فلیش لائٹس کے جھماکوں کی تیاری اور انتظامات کے ساتھ۔۔۔ انہیں اطلاع کس نے دی تھی؟ اس کے اس دن وہاں آنے کی؟

یہ سالار سکندر کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔۔۔ وہ سرکس کا وہ جانور تھا جسے بینک اور سی آئی اے اب نچا کر تماشا لوٹنا چاہتے تھے اور سرکس کا جانور اس لیموزین سے فلیش لائٹس اور سوالوں کے نعروں کے درمیان اترتے ہوئے اپنی اگلی حکمت عملی ترتیب دے رہا تھا۔۔۔ اسے اگر ناچنا ہی تھا تو اپنی شرطوں پر۔۔۔ پتلی بننا تھا تو شرائط کسی کی انگلی کی نہیں۔

وہ لیموزین سے اتر کر اپنے کھلے کوٹ کے بٹن بند کرتا' فلیش لائٹس کے جھماکوں سے کچھ فاصلے پر ڈرائیو وے کے دونوں اطراف میں لگی ہوئی وارننگ ٹیپ کے پار کیمرہ مینوں اور جرنلسٹس کی بھیڑ کی طرف ایک نظر بھی ڈالے بغیر عملے کے ان افراد کی رہنمائی میں لمبے لمبے قدموں کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ جنہوں نے کار سے اترنے پر اس کا استقبال کیا تھا۔

کچھ نئے لوگوں کے علاوہ بورڈ روم میں وہ سب لوگ موجود تھے جن سے وہ کچھ دن پہلے بھی ملا تھا۔۔۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے اس کا باطن ویسے ہی ان لوگوں کا ظاہر۔۔۔

اس کا استقبال بورڈ روم میں ایک ہیرو کے طور پر تالیاں بجا کر خیر مقدمی نعروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی ہیرو تھا جو جنگ جیت کر کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی خدمات کے بدلے میں کوئی بڑا اعزاز لینے آیا تھا۔۔۔ ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں اور نرمی تھی۔ آنکھوں میں ستائش اور ہونٹوں پر داد و تحسین۔۔۔ گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقے کرتے ہوئے سالار سکندر صرف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ "گھر" کے "کیا" آیا تھا جس کے لیے ایسا استقبال کیا گیا تھا۔ وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ اس بیضوی شکل کی میز پر پریذیڈنٹ کی سیٹ کے داہنی جانب پہلی نشست پر بٹھایا گیا تھا جن کی گردن کا سریا اور لہجوں کی رعونت نے اس کی عزت نفس کی دھجیاں اڑائی تھیں۔

انسان کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ وہ بھولتا نہیں ہے نہ برائی نہ اچھائی۔۔۔ نہ کم ظرفی نہ ایثار۔۔۔ نہ بے

مہری نہ احسان۔۔۔ نہ عزت نہ ذلت۔۔۔ سالار سکندر بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ایک "انسان" تھا جو کچھ ہو چکا تھا' وہ پتھر پر لکیر تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا' وہ پانی کی پھوار تھا۔

اس کی آمد کے ٹھیک پانچ منٹ بعد ورلڈ بینک کا صدر بورڈ روم میں آگیا تھا۔ سالار سکندر بھی باقی سب کی طرح اس کے احترام اور استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

"ورلڈ بینک کو آپ پر فخر ہے۔" اس کے ساتھ ہی استقبالی کلمات کی ادائی کے بعد صدر کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے کو سن کر سالار سکندر کا دل قہقہے مار کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ اسے سکندر عثمان یاد آئے تھے۔ اس کے بچپن میں اسکول میں اس کے ٹیچرز سے ملتے ہوئے وہ اپنی اس پانچویں "خبیث اولاد" کی عزت انہیں الفاظ میں کرتے تھے کیوں کہ سائیکاٹرسٹ نے انہیں سختی سے سمجھایا تھا کہ ان کے ملامتی جملے ان کے اس غیر معمولی ذہین بیٹے کے دماغ اور نفسیات پر برے اثرات چھوڑ سکتے ہیں اور اپنی اس پانچویں اولاد کے کارناموں پر جلنے کڑھنے کے باوجود سکندر عثمان اسے آئی لو یو بھی کہتے تھے اور آئی ایم پراوڈ آف یو (مجھے تم پر فخر ہے) بھی۔۔۔۔

ورلڈ بینک کا صدر سالار سکندر کا باپ نہیں تھا مگر امریکا تھا اور اس وقت اگر بینک کے صدر کو اپنے عہدے کے لالے پڑے ہوئے تھے تو امریکا کو افریقہ میں اپنے مفادات اور اس ساکھ کے جس اچھی ساکھ کا اسے وہم تھا۔ سالار سکندر انہیں اس وقت وہ مسیحا لگ رہا تھا جو "سب کچھ" کر سکتا تھا کم از کم افریقہ میں۔۔۔ قدرت نے بیٹھے بٹھائے اس کے ہاتھ میں Hidas' touch دے دیا تھا کہ وہ وہاں جس چیز کو چھوتا وہ سونا ہو جاتی اور انہیں اس وقت سالار سکندر کی زندگی چاہیے تھی۔ اس کی زندگی "اس کی موت نہیں۔۔۔ اس کا ساتھ۔۔۔ اس کی مخالفت نہیں۔

پریذیڈنٹ کے جملے پر بورڈ روم کے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں یوں جیسے وہ پریذیڈنٹ کی تعریف کی تائید کر رہے ہوں۔ سالار نے شکریہ ادا کیا تھا اور پریذیڈنٹ کے سیٹ سنبھالنے کے بعد سب لوگوں کی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

پریذیڈنٹ نے کانگو کی صورت حال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا اور وہاں ورلڈ بینک کے ملازمین پر ہونے والے حملوں میں زخمی اور مارے جانے والے لوگوں کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی تھی اور اس کے بعد پیٹرس ایباکا کو شان دار خراج عقیدت پیش کیا تھا چند جملوں میں اور پھر وہ سالار سکندر کی رپورٹ پر آگیا تھا جو بینک کے بورڈ آف گورنرز نے "پڑھ" لی تھی۔ نہ صرف "پڑھ" لی تھی بلکہ اس رپورٹ کی تمام سفارشات کو مانتے ہوئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا تھا جو اس پروجیکٹ کو وقتی طور پر معطل کرتے ہوئے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے گا۔

سالار سکندر نہ حیران ہوا تھا نہ متاثر۔۔۔ اسے اندازہ تھا ورلڈ بینک اس سے کم میں کانگو میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں وہ پروجیکٹ اب ان حالات میں ختم کرنا ہی تھا اور اگر وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ بورڈ آف گورنرز نے وہ رپورٹ "اب" پڑھی تھی اور اس کو فوری طور پر متفقہ طور پر منظور کر لیا تھا تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ نقصان کو کنٹرول کرنے کے لیے اختیار کی جانے والی سی آئی اے کی حکمت عملی کا پہلا حصہ تھا۔ یہ پنڈورا باکس ان کی وجہ سے کھلا تھا اب اس کو انہیں ہی بند کرنا تھا۔ وہ جس جارحیت کو بہترین حکمت عملی مان کر چلے تھے ناکام ہو گئی تھی تو انہیں اب بیک فٹ پر جا کر دفاعی حکمت عملی اختیار کرنی پڑ رہی تھی۔

سالار سکندر خاموشی سے پریذیڈنٹ کی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو کے اختتام پر سالار سکندر کو دی جانے والی نئی ذمہ داریوں کا اعلان کیا تھا۔ بورڈ روم میں بجتی ہوئی تالیوں میں وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی بے وقعت خدمات کے صلے میں ملنے والے اہم ترین عہدہ کی قدر و قیمت اندازہ لگا رہا تھا۔

اس کی پریزنٹیشن جو اس نے کچھ دن پہلے اسی بورڈ روم میں پیش کرنے سے بھی کئی ماہ پہلے ورلڈ بینک کو بھیجی

تھی اور جس پر اسے خاموشی سے رپورٹ واپس لینے یا عہدہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب بورڈ روم میں دوبارہ چلائی جارہی تھی اور بورڈ روم میں بیٹھا ہوا ہر شخص اس رپورٹ میں پیش کیے جانے والے حقائق اور سلائیڈز کو دیکھ کر یوں حیران و مضطرب نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار اس رپورٹ سے اور اس رپورٹ کے اندر پیش کیے جانے والے حقائق سے متعارف ہو رہا ہو۔ اگر وہ ایکٹرز تھے تو کسی تھرڈ کلاس تھیٹر کمپنی کے اور اگر منافق تھے تو اعلا معیار کے۔۔۔

سالار کو وہاں بیٹھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کے طاقت ور ترین مالیاتی ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں کسی گھٹیا تھیٹر میں چلنے والے مزاحیہ ڈرامے کے سامنے بیٹھا ہے۔ جس میں ہر ایکٹر اوور ایکٹنگ کر رہا تھا اور مشین میں ریکارڈ قہقہے اور تالیاں ہر ہر جملے اور ایکسپریشن پر بج بج کر اسے ماسٹر پیس ثابت کرنے پر تلے تھے۔

"میں صدر اور بورڈ میں موجود تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کا موقع دیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ اس رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے اس میں پیش کی جانے والی تمام سفارشات کو مان لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس قدم کے اٹھانے سے ورلڈ بینک کو ایک بار پھر کانگو میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں مدد ملے گی۔"

میٹنگ پر سالار سکندر کو بات کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور اس نے بہت مختصریات کی تھی۔ ٹو دا پوائنٹ، فارمل۔۔۔ پروفیشنل۔۔۔ جذباتیت کے بغیر۔۔۔ اور اسی دوٹوک انداز میں جس کے لیے وہ مشہور تھا۔

"میں شکر گزار ہوں کہ ورلڈ بینک اور بورڈ آف گورنرز نے مجھے نائب صدر کے لیے منتخب کیا لیکن میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے یہ عہدہ نہیں سنبھال پاؤں گا۔ مجھے یقین ہے ورلڈ بینک کی ٹیم میں اس عہدے کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں لوگ موجود ہیں۔"

صدر نے اس کے آخری جملوں پر بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔ اسے توقع تھی اور صرف "اسے" نہیں "انہیں" توقع تھی کہ سالار سکندر کا جواب اس آفر پر کیا آئے گا لیکن اس کے باوجود اسے بے چینی ہوئی تھی۔ اس وقت انہیں اپنی ساکھ بچانا تھی اور یہ کام اس وقت سالار ہی کر سکتا تھا۔

وہ میٹنگ اس کے بعد دو تین منٹ کے اندر ختم ہو گئی اور اس کے بعد سالار ورلڈ بینک کے صدر سے اکیلے میں ملا تھا۔ وہاں کا ماحول الگ تھا، جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی کچھ اور تھیں۔

"مجھے اپنے کمرے سے چوری ہونے والی تمام چیزیں چاہئیں۔ لیپ ٹاپ۔۔۔ ٹریول ڈاکومنٹس۔۔۔ میرے باقی ڈاکومنٹس۔"

سالار سکندر نے اس کمرے میں میٹنگ کے شروع میں ہی ایجنڈا سیٹ کیا تھا۔ اب اس کا کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا تھا اور وہ باتیں منوانے ہی آیا تھا۔

"آپ کے کمرے سے چوری ہو جانے والی چیزوں سے ورلڈ بینک کا کیا تعلق۔۔۔"

صدر نے انجان بننے کی پہلی اور آخری کوشش کی تھی۔ سالار نے بات کاٹ دی تھی۔

"اگر میری چیزیں نہیں مل سکتیں تو پھر مجھے کسی بھی ایشو پر بات کرنے کے لیے یہاں نہیں بیٹھنا۔۔۔"

صدر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا پھر اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے اسے جیسے چمکارا۔

"میں ہدایات جاری کرتا ہوں کہ فوری طور پر آپ کے نقصان کی تلافی کی جائے اور آپ کے ڈاکومنٹس کا متبادل۔۔۔"

سالار نے اسی اکھڑپن سے اس کی بات کاٹی تھی۔ "مجھے اپنی چیزیں چاہئیں۔۔۔ نہ نقصان کی تلافی چاہیے نہ کوئی متبادل۔۔۔ مجھے اپنے اوریجنل ڈاکومنٹس چاہئیں۔"

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد صدر نے ہتھیار ڈالے اور کہا۔

"ٹھیک ہے مل جائیں گے... لیکن ورلڈ بینک اور امریکا کو کانگو میں آپ کی ضرورت ہے۔" ایک شرط اس نے منوائی تھی ایک شرط انہوں نے رکھ دی تھی۔

"میں کسی کی کٹھ پتلی بن کر کانگو میں وہاں کے انسانوں کا استعمال نہیں کر سکتا نہ کروں گا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ کانگو میں جا کر وہ کریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔" صدر نے کہا۔

"میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ کہیں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"نائب صدر کے طور پر آپ کو لامحدود پاور زدیے جائیں گے اور فوری طور پر مطلع بھی کر دیا جائے گا آپ اس پروجیکٹ کو روکنا چاہتے ہیں یا وہاں چلنے والے کسی بھی پروجیکٹ کو... آپ کو ہیڈ کوارٹر کی منظوری کی ضرورت نہیں... آپ کو اختیار دیا جائے گا کہ آپ یہ فیصلہ خود کر سکیں گے۔"

چند لمحوں تک سالار بول نہیں سکا۔ یہ جال تھا تو پکا تھا پھانسہ تھا تو اچھا... وہ ماتھے پر بلوں کے ساتھ ہونٹ کاٹتا میز کے دوسری طرف بیٹھے اس شخص کو دیکھتا رہا جس کی کرسی کسی بھی وقت جانے والی تھی اور یہ اندازہ صرف صدر ہی کو نہیں سب کو تھا مگر وہ ایک باعزت راستہ چاہتا تھا۔ لاتیں کھا کر جانے کے بجائے باتوں کے ذریعے جانا چاہتا تھا۔

"جتنے اختیارات آپ مجھے دے کر کانگو میں بھیجنا چاہتے ہیں' اتنے اختیارات آپ کسی کو بھی دے کر کانگو بھیج دیں وہ صورت حال سنبھال لے گا۔" سالار نے کچھ لمحے خاموشی کے بعد کہا۔

"ایشو اختیارات کا نہیں ہے نیت کا ہے... جو تم افریقہ میں کرنا چاہتے ہو' کوئی دوسرا نہیں کرنا چاہے گا۔" سالار اس شخص کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"کچھ وقت لو... سوچو... پھر فیصلہ کرو۔" اسے قید کر کے آزاد کیا گیا تھا۔

اس نے واپسی پر بھی میڈیا سے بات نہیں کی۔ الجھن تھی کہ اور بڑھی تھی... گھٹن تھی کہ سوا ہوئی تھی۔ واپسی کا راستہ بھی اس لیموزین کے کانٹوں پر طے ہوا تھا۔

ہوٹل میں واپس آتے ہی اس نے کمرے میں ٹی وی پر نہ صرف ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر جاتے' اپنی فوٹیج دیکھ لی تھی بلکہ نیوز چینلز پر اپنی تعیناتی کی بریکنگ نیوز بھی دیکھ لی تھی۔ "وہ" اس کے لیے "انکار" مشکل سے مشکل تر بنا رہے تھے... جال کی ڈوریاں کستے جا رہے تھے۔ اس کا سیل فون منٹوں میں مبارک باد کے پیغامات اور کالز سے بجنے لگا تھا۔

پہلے اس فون کا نہ بجنا قیامت تھا اور اب بجے چلے جانا عذاب اور اس سب کے بیچوں بیچ اس نے امامہ کو کال کی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خبر اس تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔ اس کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا؟ اسے یاد تھا اس نے امامہ کے ساتھ پہلے عمرے کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا وہ بینک کی ملازمت چھوڑ دے گا' نوکری اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ وہ نوکری کبھی بھی' کہیں بھی حاصل کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے اس نے کبھی یہ غور نہیں کیا تھا کہ وہ جن جگہوں پر کام کرتا رہا تھا۔ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ "سود" سے منسلک رہے تھے۔ بڑے بڑے مالیاتی ادارے... آرگنائزیشن وہ سب جو دنیا کی اکنامک پلس چلاتے تھے۔ وہ سود کے خون سے ہی چلاتے تھے۔ فلاحی کام ہو یا سماجی ذمہ داری... پر خیرات کا رستہ بھی وہیں سے نکلتا تھا اور سالار سکندر اس سب کا حصہ تھا۔ اس بین الاقوامی مالیاتی نظام کا ایک پرزہ تھا جو سود کے پیسے سے چل رہا تھا... وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا اسے "احکامات" کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ اعتراف کرتا تھا اسے تمام "حدود" کا پتا تھا اور وہ "حدود" توڑنے کا گناہ گار چلا آ رہا تھا... زندگی میں بہت دفعہ رزق ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ ہم کھانے والے پیٹ کا سوچیں کمانے والے ہاتھ کا نہیں... سالار کو رزق کی مجبوری

نہیں تھی مگر کامیابی کی بھوک ضرور تھی... احساس کیے بغیر...
امامہ نے پہلی دفعہ بڑی ڈھٹائی سے اس شیشے کے گھر کو توڑا تھا جو اس نے اپنے گرد بنایا تھا۔ اسے وہ عکس دیکھنے پر مجبور کیا تھا جسے وہ اپنا نہیں مانتا تھا... وہ اعتراف نہیں کرتا تھا لیکن شرمسار ہو گیا تھا... پریشان بھی... لیکن پھر اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس کا بینک کے ساتھ کانٹریکٹ ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے دوبارہ ری نیو نہیں کرے گا۔
امریکا جا کر اس نے پی ایچ ڈی کے ساتھ جس مالیاتی ادارے میں جز وقتی اکاؤنٹنٹ کی نوکری کی تھی۔ وہ کوئی انویسٹمنٹ بینک نہیں تھا، لیکن کہیں نہ کہیں وہ بھی سود کے کاروبار سے مبرا نہیں تھا، لیکن سالار اپنے آپ کو یہ تسلی دلاتا تھا کہ وہ وہاں ایک اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ ادارہ اس سے سود سے منسلک کوئی کام نہیں لے رہا مگر ضمیر کہیں نہ کہیں ایک سوئی اسے چبھوتا رہتا تھا... اس کی تنخواہ وہیں سے آتی تھی، جہاں سود کا منافع آتا تھا۔
ورلڈ بینک کو جوائن کرنے کے فیصلے سے امامہ خوش نہیں تھی، اس کا اعتراض وہی تھا اور وہیں تھا۔
"تم بے شک ورلڈ بینک کے پروجیکٹس سے منسلک ہو رہے ہو لیکن ورلڈ بینک کرتا تو سود کا کاروبار ہی ہے نا... چھوٹے بینک افراد کا استعمال کرتے ہیں ورلڈ بینک قوموں کا... تم مجھے بتاؤ فرق کیا ہوا...؟ آسان قرضہ... سستا قرضہ... لونگ ٹرم قرضہ... شارٹ ٹرم قرضہ... آسان شرائط کا قرضہ... کوئی ایسا قرضہ ہے ورلڈ بینک کے پاس جس پر وہ سود نہ لیتا ہو...." اس نے سالار کے ساتھ بحث کی تھی۔
جبریل ابھی ایک سال کا تھا... سالار کو لگا تھا زندگی یک دم پر سکون ہونے لگی ہے... ایک خوش حال خاندان... زندگی کا وہ فیز جو وسیم اور سعد کی حادثاتی موت کے بعد امامہ کے ڈپریشن اور پاکستان چلے جانے کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ختم ہوتا چلا گیا تھا اور تب جو موقع سالار کو ورلڈ بینک کی صورت میں ملا تھا وہ اس کے تجربے اور عمر کے حساب سے، بہت شاندار تھا۔ وہ امامہ کے اعتراضات پر بے حد ناراض ہوا تھا۔
"اگر ہم اسی طرح ایک ایک چیز میں مین میخ نکالتے رہیں گے تو پھر اس معاشرے اور سسٹم میں تو کہیں بھی کام نہیں کر سکیں گے کیوں کہ یہ تو پورا معاشرہ سود پر کھڑا ہے اور وہ ہمارے لیے اپنے سسٹم کو نہیں بدلیں گے۔" اس نے امامہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"پھر تو ہمیں حلال کھانے کی کوشش بھی ترک کر دینی چاہیے۔ پھر تم سپر اسٹور میں ڈبوں پر ان کے اجزا کیوں چیک کرتے رہتے ہو...؟ بس یہ سمجھ کر کھا لینا چاہیے یہ سب کچھ کہ یہ ہمارا نہیں ان کا معاشرہ ہے اور وہ اپنے سپر اسٹور میں وہ چیزیں رکھیں گے جو انہیں پسند ہیں۔"
امامہ نے چند لمحوں کے لیے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ بحث جاری رکھنے کے بجائے وہاں سے اٹھ گیا تھا لیکن امامہ کے ناخوش ہونے کے باوجود اس نے ورلڈ بینک جوائن کر لیا تھا اور ورلڈ بینک جوائن کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس نے اپنا ایگری منٹ اور جاب پروفائل کے کاغذات امامہ کو زبردستی پڑھ پڑھ کر سنائے تھے۔ اس نے سب کچھ سننے کے بعد ان پیپرز کو واپس لفافے میں ڈال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا۔
"تم سود کے پیسے سے انسانیت کی خدمت اور بہتری کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ اس میں فلاح ہے... نہیں ہے... سود کا ثمر انسانوں کی زندگی بدل سکتا ہے، مگر تباہی میں... بہتری میں نہیں۔"
اس کی سوئی جہاں اٹکی تھی وہیں اٹکی رہی تھی... امامہ ضدی تھی، سالار کو اس کا اندازہ تھا... وہ خود بھی ضدی تھا لیکن ان کی ضد کبھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئی تھی... کہیں نہ کہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی دوسرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا... وہ پوائنٹ آف نو ریٹرن پر کبھی نہیں گئے تھے... اس ایک ایشو پر بھی اس سے شدید نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود امامہ نے ہر بار روزگار کے سلسلے میں اس کے انتخاب کو بہ امر مجبوری قبول تو

کیا تھا لیکن اس نے کبھی اس روزگار کے بارے میں زبان بندی نہیں کی تھی اور اس کی یہ برملا تنقید سالار کو خفا بھی کرتی تھی اور کمزور بھی۔۔۔۔
اس دن بھی امامہ کو فون کرتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ اس سے کیا سننے جا رہا ہے لیکن خلاف توقع امامہ نے اس کے نئے عہدے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اس سے جبریل اور عنایہ کی باتیں کرتی رہی۔ حمین کے بارے میں بتاتی رہی۔۔۔ یہاں تک کہ سالار کا احساس جرم حد سے گزر گیا۔ وہ جیسے چاہتا تھا کہ وہ اسے ملامت کرے۔ کوئی تو مبارک باد دینے کے بجائے اس کے ضمیر کو کچوکے لگائے۔
"تمہیں پتا ہے ورلڈ بینک نے مجھے وائس پریذیڈنٹ۔۔۔"
امامہ نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "ہاں۔" اس نے یک حرفی جواب دیا۔
"تو؟" سالار کو اس یک حرفی جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔
"تو کیا؟" امامہ نے مدہم آواز میں پوچھا۔
"تو تم کچھ نہیں کہو گی؟" اس نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔
"یس" ایک اور یک حرفی جواب آیا۔
"کیوں؟" وہ بے قرار ہوا۔
"تم ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرتے ہو۔۔۔ پھر رائے دینے کا فائدہ۔"
سالار ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے مدہم آواز میں کہا۔
"میں نے ابھی آفر قبول نہیں کی۔"
"کر لو گے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔" جواب نے اس کے چودہ طبق روشن کیے اور ساتھ اسے ہنسایا بھی۔
"اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔" امامہ کو اس کی یہ ہنسی اچھی لگی تھی پھر بھی اس نے کہا۔
"میں جب بھی تمہاری بات نہیں مانتا' نقصان اٹھاتا ہوں۔"
سالار نے اس لمحے عجیب اعتراف کیا۔ وہ جیسے اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ورلڈ بینک جوائن کرنے کے حوالے سے اس کی بات نہ مان کر غلط فیصلہ کیا تھا لیکن وہ فی الحال اسے اتنے کھلے لفظوں میں یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑی تھی۔
"بڑی خوشی ہوئی یہ بات سن کر۔۔۔ لیکن میں یہ تو نہ سمجھوں نا کہ تم آئندہ ہمیشہ میری بات مانا کرو گے؟" اس نے سالار پر چوٹ کی تھی۔
"بالکل" جواب تڑاخ سے آیا۔
اس بار دونوں ہنس پڑے' پھر سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔
"یہی وہ بات تھی جو کانگو سے آتے ہوئے تم سے کہنا چاہتا تھا۔"
امامہ کو یاد آیا اسے ایک اعتراف کرنا تھا' واپس آکر۔۔۔
"اوہ۔۔۔ میں نے سوچا' پتا نہیں کیا کہنا چاہتے تھے تم۔" وہ دھیرے سے ہنسی' پھر اس نے کہا۔
"ایسا کیا ہوا ہے کہ تم یہ بات کہہ رہے ہو مجھ سے۔۔۔ یا تب کہنا چاہ رہے تھے۔"
وہ یقیناً" بے وقوف نہیں تھی۔ سالار کی سمجھ میں نہیں آیا اس بات کا کیا جواب دے۔۔۔ جواب دے بھی یا نہیں۔۔۔ جو پچھتاوا پیٹرس ایباکا سے ملاقات اور اس پروجیکٹ کے بارے میں ان حقائق کو جان کر شروع ہوا تھا وہ امریکہ میں پہنچ کر احساس جرم میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔
"تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے؟" امامہ نے اس کی خاموشی کو پہلی کی طرح پوچھا۔

"ابھی نہیں۔۔۔" اس نے جواب دیا۔
"یہاں کب آؤ گے؟" امامہ نے بات بدل دی تھی۔
"ابھی فلائٹس بند ہیں کنشاسا کے لیے۔۔۔ ایئرپورٹ عارضی طور پر بھی فنکشنل نہیں ہے۔ میں کوشش کررہا ہوں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں لیکن تم پریشان تو نہیں ہونا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔
"اب نہیں ہوں اور تم بھی پریشان مت ہونا۔۔۔ ہم سب محفوظ ہیں اور مجھے اور حمین کو علاج کی تمام سہولیات مل رہی ہیں۔"
امامہ نے اس کے لہجے میں نمودار ہوتی ہوئی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود سرجری اور حمین کے پری میچور ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتی تھی' کم از کم ایک ماہ تک۔۔۔ ورنہ سالار خود وہاں جانے کے بجائے اسے وہاں سے نکلوانے کی کوشش کرتا۔
سالار نے بہت مطمئن ہوکر کچھ دیر جبریل اور عنایہ سے بات چیت کی اور اس کے بعد کال ختم کرکے وہ اس لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا اور ان کاغذات کی طرف' جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک سربمہر تھیلے میں ایک شخص اس کے کمرے میں اسے دے گیا تھا۔ سب کچھ بالکل محفوظ حالت میں تھا' کوئی چیز ڈیلیٹ یا غائب یا بدلی نہیں گئی تھی۔ اس کے باوجود سالار کو اپنے ان باکس میں جاتے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی اس سے پہلے بھی وہاں تھا یا شاید اس وقت بھی وہ مانیٹر ہورہا ہوگا کیونکہ اس کے ان باکس میں موجود سات گھنٹے پہلے تک آنے والی ہر ای میل' کھولے اور پڑھے جانے کی نشاندہی کررہی تھی۔
وہ اپنے فون سے اپنے ان باکس کو access نہیں کرپا رہا تھا' ورنہ شاید یہ بات اسے پہلے ہی پتا چل جاتی۔ شاید ورلڈ بینک کے صدر کے ساتھ ملاقات میں اس نے ان چیزوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کیا ہوتا تو اس کا ہیکڈ ای میل ایڈریس کبھی دوبارہ اس کے لیے accesible نہ ہوتا۔
اسے اب غصہ نہیں آرہا تھا' نہ ہی بے بسی کی کسی کیفیت کو اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔ جو بلائیں اسے چمٹ چکی تھیں' وہ اس کا اپنا انتخاب تھیں۔ ان باکس میں موجود ای میلز پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک ای میل پر ایک لمحہ کے لیے جیسے اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا تھا۔ وہ پیٹرس ایباکا کی طرف سے میڈیا سینٹر کے باہر سے اسے بھیجا جانے والا آخری پیغام تھا جو بہت لمبا ہوجانے کی وجہ سے ایباکا نے ٹیکسٹ کرتے کرتے اسے ای میل کردیا تھا۔ بوجھل دل کے ساتھ اس نے اس ای میل کو کھول لیا۔
"تمہیں پتا ہے' میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں؟ ٹائم وارنر سینٹر۔۔۔ اور کس لیے۔۔۔؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے اینڈرسن کوپر کے ساتھ تھا' سی این این اسٹوڈیو میں۔۔۔ اس کے شو میں شرکت سے پہلے ابتدائی بات چیت کے ایک سیشن کے لیے۔۔۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم کہو گے "او مائی گاڈ!"
" Man You did it " (یہ تم نے کیا ہے!)
"Yes i did it" ۔ (جی جناب)
سالار نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی لیکن جس چیز نے اس وقت اس کی آنکھوں کو دھندلایا تھا وہ۔۔۔ وہ مسکراہٹیں تھیں۔ ایباکا کے جملے کے اختتام پر جس میں وہ فخریہ انداز میں مسکرایا اور بھنویں اچھال کر آنکھیں گھمارہا تھا۔
"اینڈرسن کوپر سے ملنے کے بعد میں نے سب سے پہلا میسج تمہیں کیا ہے۔۔۔ کیونکہ میں یہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتا اگر مجھے تمہاری صورت میں ورلڈ بینک کی بے ضمیر دنیا میں ضمیر کی جھلک نہ دکھائی دیتی۔۔۔ میں نے کبھی تمہیں یہ نہیں بتایا کہ جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔۔۔

ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔۔۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔۔۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔

میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی ایک پگمیز (بونا) تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا اپنے لوگوں کے لیے۔۔۔ اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔۔۔ ابھی امید تھی۔۔۔ تمہاری صورت میں۔۔۔ اور میں ٹھیک تھا۔۔۔ میں نے امید نہیں چھوڑی جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں تک لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔۔۔ ہم چھوٹے 'کالے' 'بد صورت'۔۔۔ معمولی انسانوں کے بارے میں۔۔۔ جو دنیا میں صرف مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔۔۔ میں نے آج کوڈ پر کو تمہارے بارے میں بھی بتایا۔ وہ تم سے بھی بات کریں گے۔۔۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔۔۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے۔۔۔ "انسانوں" جیسی زندگی "جانوروں" جیسی نہیں۔۔۔ تم جب واشنگٹن پہنچ جاؤ تو مجھے انفارم کرنا۔۔۔ ہم دونوں کو ملنا ہے۔۔۔ کافی دن ہو گئے۔ اسٹاربکس کی کافی اب کے۔۔۔ اس بار بل میں پے کروں گا۔۔۔" ای میل کا اختتام ایک اور مسکراہٹ سے ہوا تھا۔ ایک آنکھ مارتی شرارتی مسکراہٹ سے۔۔۔

سالار سکندر کسی بت کی طرح ان جملوں کو بار بار پڑھتا رہا۔۔۔ بار بار۔۔۔ ہر بار آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اسے لگتا تھا وہ گزشتہ سارے جملے بھول چکا ہے۔۔۔ اس نے درجنوں بار اس رات اس ای میل کو پڑھا تھا۔ پیٹرس ایباکا باتونی تھا۔۔۔ بلا کا باتونی۔۔۔ بات شروع کرتا تو بس شروع ہی ہو جاتا تھا۔۔۔ پتا نہیں کن کن کتابوں اور مصنفین اور فلاسفرز کے حوالے دیتا تھا۔۔۔ سالار سکندر اس کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا اور کبھی کبھار تنگ بھی۔۔۔

آج اس ای میل میں ایباکا نے کسی کتاب، کسی مصنف، کسی فلاسفر کا قول نہیں دہرایا تھا۔۔۔ اس نے صرف وہ کہا تھا جو اس کی اپنی سوچ اپنے احساسات تھے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح جذباتیت سے لتھڑے ہوئے۔۔۔ اس نے اس امید کی بات کی تھی جو وہ کھو رہا تھا اور جو ایباکا کو وہاں تک لے آئی تھی۔۔۔ کبھی کبھار زبان سے الفاظ نہیں الہامی باتیں نکلتی ہیں۔ اس ای میل میں ایباکا نے بھی ایسی ہی ایک بات کہی تھی جو حرف بہ حرف ٹھیک تھی۔۔۔ کانگو کی تاریخ بدل رہی تھی اور اس تاریخ کو ایباکا نے اپنے خون سے بدلا تھا۔

سالار نے اس ای میل کو بند کر دیا تھا۔ اس میں ایباکا نے کوئی اہم بات شیئر کی ہوتی تو اس کے ان باکس سے وہ ای میل غائب ہو چکی ہوتی۔ لیکن اس ای میل نے اس کے دل کے بوجھ کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ جس ترازو کے دو پلڑوں میں جھول رہا تھا اس کا عدم توازن اور بڑھ گیا تھا۔

وہ اس ساری رات مصلے پر بیٹھا گڑگڑاتا رہا تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے آزمائش میں آسانی کی بھیک۔۔۔ سیدھے راستے کی بھیک۔۔۔ جس پر سے وہ ایک بار پھر سے بھٹک گیا تھا اور ان لوگوں میں شامل نہ کرنے کی بھیک۔ جن پر اللہ کا عذاب آتا تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں اسے خوف بھی تھا کہ وہ اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہا تھا اور اگر اولاد اور بیوی اور مال کی آزمائش جان لیوا تھی تو جان لیوا یہ احساس بھی تھا۔

فجر کے وقت اسے ڈاکٹر سبط علی کا خیال آیا تھا۔۔۔ اور خیال نہیں آیا تھا۔۔۔ وہ جیسے دیوانہ وار ان کی طرف لپکا تھا۔۔۔ وہ ایمرجنسی میں ٹکٹ حاصل کر کے اگلی رات ہی پاکستان دوڑا چلا آیا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی اسے ہمیشہ کی طرح ملے تھے گرم جوشی سے۔۔۔ لیکن حیرانی سے۔۔۔ وہ کئی سالوں کے بعد اس طرح اچانک ان کے پاس بھاگتا آیا تھا۔۔۔ انہوں نے اس سے باری باری سب کی خیریت دریافت کی۔

"امامہ ٹھیک ہے؟"

"جی۔۔۔!" وہ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی ان کی اسٹڈی میں اکیلا ان کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔ سر جھکائے۔

"جبریل کیسا ہے؟" انہوں نے اگلا سوال کیا۔
"وہ بھی ٹھیک ہے۔"
"عنایہ؟" "وہ بھی۔"
"اور حمین؟"
"وہ بھی۔" وہ سر جھکائے ایک ایک کے بارے میں بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سبط علی الحمدللہ کہتے رہے، پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے اس سے مدھم آواز میں پوچھا۔
"اور تم؟"
"نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں۔" اس بار سالار سکندر نے سر اٹھایا تھا اور پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ وہ پہلی بار ایسے ٹوٹ کر رویا تھا۔
"مجھ سے ایک گناہ ہوگیا ہے ڈاکٹر صاحب!" اس نے روتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف اسے دیکھتے رہے تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کہا۔
"مجھے مت بتانا۔" سالار نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔
"آپ کو بتانے کے لیے ہی آیا ہوں یہاں۔"
"میں تمہارا گناہ جان کر کیا کروں گا؟ اب روک سکتا نہیں تمہیں۔ پچھتاوا دیکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے اپنے اور اللہ کے درمیان ہی رکھو اسے۔ جو پردہ ہے اسے پڑا رہنے دو۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔ معاف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور معاف کرتا ہے اپنے بندوں کو۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح تحمل سے اسے سمجھایا تھا۔
"میں بتاؤں گا نہیں تو میری گمراہی ختم نہیں ہوگی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ میں کتنی تاریکی میں کھڑا ہوں۔ اندھیرا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مجھے اس تاریکی سے خوف آنے لگا ہے۔"
ڈاکٹر سبط علی نے اسے اس بے چارگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاس وہ جب بھی آتا تھا کسی مشکل میں ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے اسے ایسی حالت میں اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"میں نے سود والا رزق چن کر اللہ کی حد توڑی ہے اور مجھ پر ایک کے بعد ایک پریشانی آرہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں۔"
وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ وہ اعتراف جو ضمیر کرتا رہتا تھا وہ آج پہلی بار کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنی زبان سے کر رہا تھا۔
"توبہ کر لو اور وہ رزق چھوڑ دو۔" انہوں نے بلا توقف بڑی سہولت سے کہا۔
"توبہ آسان ہے مگر دلدل سے نکلنا آسان نہیں ہے میرے لیے۔" انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔
"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا دنیا میں۔ لیکن ممکن بنا لیا جاتا ہے۔"
"میں 37 سال کا ہوں۔ اپنی عمر کے دس سال میں نے دنیا کے بہترین مالیاتی اداروں میں کام کیا ہے۔ سارا رزق سود سے کمایا ہے، وہ بھی جو میں نے اپنی ذات پر خرچ کیا وہ بھی، جو میں نے دوسروں پر خرچ کیا۔ جس رزق سے میں اپنی اولاد اور بیوی کی کفالت کر رہا ہوں۔ وہ بھی سود ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا، میں اب کیا کروں؟"
ڈاکٹر سبط علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اتنے سالوں بعد آپ کو اب یہ احساس کیوں ہوا کہ آپ کا رزق حلال

نہیں حرام ہے؟
ان کا لہجہ اُسے پہلی بار عجیب محسوس ہوا تھا۔
"کیونکہ مجھے سکون نہیں ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ غلط ہوتا جارہا ہے۔ مجھے لگتا ہے شاید میرا رزق میری آزمائشوں کی وجہ ہے۔"
وہ بے بس انداز میں کہہ رہا تھا۔
"آپ کو یاد ہے، جب آپ میرے پاس امامہ کی بیماری کے دنوں میں آئے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کے گھر میں بے سکونی کیوں ہے۔ امامہ آپ سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے اس کے لیے دنیا کی ہر نعمت کا انبار لگا دیا ہے۔ اس پر احسانوں کی حد کردی ہے۔ پھر بھی وہ آپ سے التفات کیوں نہیں رکھتی۔ بے رُخی کیوں برتتی ہے؟ ناشکری کیوں ہے؟ احسان کو کیوں نہیں مانتی؟؟"
وہ ڈاکٹر سبط علی کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا۔ یہ سب اس کی وجہ سے نہیں ہورہا' آپ کی وجہ سے ہورہا ہے۔ اس بے سکونی کی جڑ آپ کے رزق میں ہے۔ وہ رزق وہاں سے آتا رہے گا۔ آپ کی زندگی ایسی ہی رہے گی۔ تب آپ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ میں اب تو بینک میں کام نہیں کرتا۔ اب تو کسی اور ادارے میں کسی اور حیثیت میں کام کرتا ہوں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کی طرح امامہ کی حمایت کررہا ہوں' اس کی کسی غلطی کو تسلیم نہیں کروں گا۔ ہر بات کا قصوروار آپ ہی کو قرار دوں گا۔"
وہ اسی طرح دھیمے انداز میں کہہ رہے تھے۔
"آپ نے تب بھی سوال کیا تھا اور جواب کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ سے بحث نہیں کی تھی کیونکہ آپ بہت پریشانی میں تھے اس وقت۔۔۔ میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جو جواب میں نے تب آپ کو دیا تھا' آج بھی وہی دے رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے آج آپ سوال کرنے میرے پاس نہیں آئے' حل ڈھونڈنے آئے ہیں۔"
وہ مسکرائے اور چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے' پھر انہوں نے دوبارہ بات شروع کی۔
"آپ جس کاروبار سے منسلک رہے وہ کروڑوں لوگوں کے گھروں اور زندگیوں میں بے سکونی اور تباہی لاتا ہے' پھر یہ کیسے ہوتا کہ وہ بے سکونی اور بے برکتی آپ کے دروازے پر دستک دینے نہ آتی۔ اللہ اپنی حدوں کو توڑنے والوں کو پسند نہیں کرتا' وہ مسلمان ہوں یا کافر۔"
سالار نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ٹوک دیا۔
"ڈاکٹر صاحب! مجھے اب امامہ سے کوئی شکایت نہیں ہے' وہ میری زندگی میں پریشانی اور بے سکونی کا باعث نہیں رہی۔۔۔ مجھے گھر کی طرف سے سکون ہے۔"
اس بار ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔
"کیونکہ امامہ کے لیے آپ کے التفات کا وہ عالم نہیں رہا جو اس وقت تھا جب امامہ آپ کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ تب اللہ نے آپ کو اس کی بے التفاتی اور بے رخی کے ذریعے بے سکونی دی کیونکہ اس سے زیادہ تکلیف آپ کو کوئی اور چیز نہیں پہنچا سکتی تھی۔ آج اللہ آپ کو اس چیز سے سب سے زیادہ تکلیف پہنچا رہا ہے' جو آج آپ کے لیے سب سے اہم ہے۔"
وہ گنگ رہ گیا تھا۔ بات درست تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کی طرح اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اس کے دل میں چھپے چور کو عیاں کرتے جارہے تھے۔

"آپ نے وقتی طور پر بینک کی نوکری چھوڑی' بلاواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہونے کی بجائے کچھ عرصہ کے بعد بالواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ سالار سکندر مجھ سے زیادہ اچھی طرح آپ کو پتا ہے کہ حل کیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس حل کی طرف جانے پر آپ کا دل آمادہ نہیں ہے اور کبھی ہو گا بھی نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن میری سمجھ میں واقعی نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔"

اس نے ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کو تسلیم کیا تھا۔ "میں نے پچھلے سال امریکہ میں ایک گھر mortgage کیا ہے۔ اس سال امامہ کی سالگرہ پر میں اس کو وہ گھر دینا چاہتا تھا۔ پانچ بیڈ روم کا گھر ہے۔ پرائیویٹ بیچ کے ساتھ... ساحل سمندر پر... بہت مہنگا... مجھے اگلے کئی سال اس کا mortgage ادا کرتے رہنا ہے۔ اب میرے تین بچے ہیں۔ ایک اسکول جارہا ہے' دو چند سالوں میں اسکول جانے لگیں گے۔ مجھے ان کو بہترین اسکولز میں پڑھانا ہے۔ بہترین تعلیم دلوانی ہے' بہترین یونیورسٹیز میں بھیجنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے باپ نے کیا اور اس سب کے لیے مجھے پیسہ چاہیے۔ مجھے ایک پر آسائش زندگی کی عادت رہی ہے۔ میں ان آسائشات کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ ساری آسائشات اور لائف اسٹائل پیسہ مانگتا ہے اور میں اگر حلال اور حرام کی' سود کی بنیاد پر تفریق اور تمیز کرنے بیٹھوں گا تو پھر میں ان میں سے کچھ بھی نہیں کرسکوں گا... جہاں مجھے ترقی اور کامیابی نظر آتی ہے وہاں سود بھی ہے اور جہاں سود نہیں ہے وہاں ترقی کی وہ رفتار بھی نہیں ہے جس پر میں سفر کرتا رہا ہوں... اب آپ مجھے بتائیں' میں کیا کروں... میں کسی چھوٹی موٹی کمپنی میں کسی چھوٹے موٹے عہدے پر کام کرکے تھوڑا بہت پیسہ بنا کر بچا سکتا ہوں لیکن اس سے میں خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ آرگنائزیشنز جن میں مجھے اسپارک اور سکوپ دکھتا ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے' وہاں کسی نہ کسی شکل میں سود کی آمیزش ہے۔ حرام اور حلال کا فرق نہیں ہے... میں کیا کروں؟ یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی یونیورسٹی میں فنانس اور اکنامکس پڑھا کر زندگی گزار لوں یا کسی کمپنی کا فنانشل آفیسر بن کر زندگی گزاروں۔"

وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ وہ ساری کنفیوژن جو ذہن میں تھی' اب زبان پر آرہی تھی اور زبان پر آکر جیسے اس کے اعصاب کو سکون دینے لگی تھی۔

"آپ میرے رزق کو میرے ہر مسئلے کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی اس رزق سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں... مجھے بھی سود سے نفرت ہے لیکن کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔" وہ اب پھر سے رنجیدہ ہو رہا تھا۔

"میں متبادل راستہ بھی بنانا چاہتا ہوں لیکن اس میں بھی وقت لگے گا۔ تب تک میں کیا کروں... میں آج ورلڈ بینک کو چھوڑتا ہوں تو چند مہینوں میں قصہ پارینہ ہو جاؤں گا... کانگو میں جو ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ یہ پروجیکٹ آج بند ہوا ہے۔ کل پھر چل پڑے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑے تحمل سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔

"سالار! آپ پہلے یہ فیصلہ کریں کہ وہ کیا چیز ہے' جو آپ کے لیے زیادہ پریشان کن ہے... آپ کی اپنی زندگی... یا دوسروں کی زندگی...

ہم دوسروں کی زندگی کو صرف اپنی زندگی پر ترجیح تو نہیں دے سکتے' دو ہی چوائسز ہوں تو ہم صرف اپنی ہی زندگی کو ترجیح دیں گے۔" ڈاکٹر سبط علی نے جیسے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

"میرا ذہن اور زندگی اس وقت کسی دوراہے پر نہیں چوراہے پر آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ دو راستے ہوں تو انسان پھر بھی فیصلہ کرلیتا ہے۔ سو راستوں کا کیا کرے؟" وہ عجیب بے بسی سے ہنسا تھا۔

”آپ مسیحا نہیں ہیں.... نہ ہی اللہ نے آپ کو مسیحا بننے کے لیے پیدا کیا ہے.... آپ کو اللہ نے ایک اچھا انسان اور مسلمان بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پہلے وہ فرائض پورے کریں جو اللہ کی طرف سے اور ان لوگوں کی طرف سے آپ پر عائد ہوتے ہیں جو آپ کی ذمہ داری ہیں' پھر ان لوگوں کی ذمہ داری کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کریں جن کے بارے میں آپ سے کبھی ڈائریکٹ سوال نہیں کیا جائے گا۔“

وہ اس کے دماغ کی گرہوں کو کھولنے لگے تھے۔

”زندگی میں ہم اچھے اور برے فیصلے کرتے ہیں اور ہم ان کی قیمت چکاتے ہیں' آپ اپنے بچوں کے سنہری مستقبل' آسائشوں اور ایک mortgaged گھر کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے سود کھاتے رہنا چاہتے ہیں تو قیمت بھی آپ ہی چکائیں گے.... آپ کسی متبادل راستہ کی تلاش میں مہلت چاہتے ہیں تو بھی اختیار اور انتخاب آپ ہی کے ہاتھ میں رہے گا لیکن کبھی کبھار ہم بہتر راستے اور مناسب وقت کی تلاش میں اپنی زندگی کی مہلت استعمال کر بیٹھتے ہیں۔“ وہ ان کی باتیں ویسے ہی دم بخود سن رہا تھا جیسے ہمیشہ سنتا آیا تھا۔

”پہلے آپ اپنے گھر کے اندر نااتفاقی اور بے سکونی سے آزمائے گئے.... اب آپ اپنے کیریئر میں مشکلات سے آزمائے جارہے ہیں۔ میری دعا صرف یہ ہے کہ اگلی آزمائش اس سے بڑی نہ ہو۔“

جو گرہیں کھل رہی تھیں ڈاکٹر سبط علی نے انہیں جیسے کاٹنا شروع کردیا تھا۔ سالار اندر سے ہل رہا تھا۔

”آپ نے مجھ سے یہ سب تب کیوں نہیں کہا جب میں آپ کے پاس آنا شروع ہوا تھا اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں بینک میں کام کرتا ہوں۔ آپ کو پتا تھا کہ سود کے کاروبار سے منسلک ہوں' پھر تب آپ نے مجھ سے کیوں یہ ساری باتیں نہیں کہیں۔ اس طرح خبردار نہیں کیا.... کبھی بھی ٹوکا نہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے شکایت کرنے لگا۔

”میں وہ مبلغ نہیں ہوں سالار! جو ہر شخص کو آتے ہی کٹہرے میں کھڑا کردیتا ہے۔ یہ اللہ کی دنیا ہے اور اگر اللہ کی دنیا میں اللہ انسان کو اس کی بے عملی کے باوجود خود کھوجنے' خود سیکھنے کا موقع دیتا رہتا ہے تو میں کیسے آپ کو سرزنش کرنا شروع کردیتا.... آپ جس رب کے ماننے والے ہیں اس کی کتاب کو زبانی یاد کرنے اور دہراتے چلے آنے کے باوجود اس میں دیے گئے احکامات سے روگردانی کررہے ہیں.... آپ جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور احکامات پر عمل کرنے کو تیار نہیں.... آپ جس عورت کے عشق میں گرفتار ہیں اس کے اصرار پر بھی اس رزق کو چھوڑ نہیں پارہے.... تو ڈاکٹر سبط علی آپ کو کیسے بدل دیتا' کیسے روک دیتا۔“

وہ پانی پانی ہوا تھا اور ہوتا ہی گیا تھا۔

”میں آپ کو منع کرتا.... ڈراتا.... آپ میرے پاس آنا ہی چھوڑ دیتے.... میں نے سوچا' آتے رہیں گے' بدل جائیں گے....

آپ کو یاد ہے جب میں نے ـــــ آپ سے پہلی ملاقات میں اپنی کچھ کتابیں آپ کو دی تھیں کہ ان کا مطالعہ کیجیے گا وہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔۔۔ آپ کو یہی جتانا چاہ رہا تھا۔۔۔ کہ آپ جس اقتصادی اور مالیاتی سسٹم کے ساتھ منسلک تھے وہ غیر اسلامی تھا۔۔۔ جائز اور حلال نہیں تھا۔۔۔ سود پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اور میں نہیں مانتا ان کتابوں کے مطالعے کے دوران یہ خیال آپ کے ذہن میں نہ آیا ہو کہ آپ کا رزق سود سے آلودہ ہو رہا ہے۔۔۔ میں نہیں مانتا میرے پاس اتنی باقاعدگی سے لیکچرز کے لیے آتے رہنے کے باوجود آپ نے کبھی ان لیکچرز میں سود یا ربا کے حوالے سے کوئی ممانعت کوئی درس نہ سنا ہو اور آپ کو یہ خیال نہ آیا ہو کہ جس کی ممانعت اور مذمت کی جا رہی ہے وہ ہی رزق ہے جو آپ بھی کما رہے تھے۔"

وہ ان کی باتوں کے جواب میں بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے اس نے کئی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے سنا تھا۔۔۔ وہ فوٹو گرافک میموری رکھتا تھا۔ آج بھی ہر وہ سوال دہرا سکتا تھا۔ ان کے جواب کے ساتھ جو کسی نے ڈاکٹر سبط علی سے اس حوالے سے پوچھا تھا۔ اسے یاد تھا جب اس نے پہلی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سنا تھا تو وہ بہت خفیف ہوا تھا صرف وہی نہیں وہاں پر موجود وہ سارے افراد جو بینکس یا انویسٹمنٹ کمپنیز سے منسلک تھے۔

کسی نے ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ "آخر ربا یا سود میں ایسی خرابی کیا ہے کہ قرآن پاک اس کو حرام اور کاروبار کے منافع کو حلال کرتا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے تب یہ جواب دیا تھا۔

"سود اسلام کی بنیاد کے خلاف ہے ہمارا دین جن کچھ بنیادوں پر کھڑا ہے اس میں سے ایک انسانی ہمدردی اور مدد کا اصول ہے۔۔۔ اگر مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ضرورت کے لیے اپنے مسلمان بھائی کو دی جانے والی رقم کو منافع کے ساتھ مشروط کر دے۔۔۔ ہمارا دین اللہ تعالیٰ کی برتری کے علاوہ دنیا میں کسی اور سے ویسی عقیدت اور پرستش کے خلاف ہے۔۔۔ روپیہ صرف دنیاوی زندگی کو چلانے کا ذریعہ ہے اس روپے کو ہم اگر اپنا مقصد حیات بنا کر سرمایہ داری کے اصول اپنا لیں گے تو ہم اس انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے سے ہٹا کر دولت کو اس مرتبے پر فائز کر دیں گے۔۔۔

اگر قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والا اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر رہا ہے۔۔۔ تو دولت کا بت بنا کر انسانوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں کو استعمال کرتے ہوئے ان کا استحصال کرنا دنیا میں اللہ کے اس نظام کو چیلنج کرنے کے برابر ہی ہے جس میں اللہ انسان کو ایک دوسرے کی فی سبیل اللہ مدد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر اللہ کو ایک ماننے والا اور نبی کریم کو آخری پیغمبر ماننے والا بھی صرف خدا خوفی اور خدا ترسی کے لیے ایک دوسرے مسلمان کو منافع لیے بغیر کچھ دینے پر تیار نہیں تو مسلمان اور کافر میں فرق کیا ہے۔ کافر دولت کے حصول اور اس کی بڑھوتری کے لیے، بہت سارے خدا پوجتا ہے۔ مسلمان تو اللہ کی عبادت صرف اللہ کی خوشنودی اور اخروی زندگی کے لیے کرتا ہے وہ تو رزق میں کشادگی اور نعمتوں کے عطا کیے جانے کو اللہ کی عبادت کے ساتھ مشروط نہیں کرتا۔"

اسے ڈاکٹر سبط علی کی ایک ایک بات یاد تھی کیونکہ ان کے الفاظ کئی راتوں تک اس کے لیے بازگشت بنے رہے تھے۔

"جب انسان کا ایمان اللہ کی ذات پر کمزور ہوتا ہے اور اس میں توکل نہیں ہوتا تو پھر اس کا اعتقاد دنیاوی چیزوں میں بڑھ جاتا ہے۔۔۔ روپے میں۔۔۔ مال و زر میں۔۔۔ بچتوں اور جمع پونجیوں میں۔۔۔ وہ اللہ کی ذات کو باہر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اپنا مستقبل پلان کرنے۔۔۔ اتنا پیسہ جوڑوں گا تو اس سال یہ لوں گا۔۔۔ کسی رشتہ دار یا ضرورت مند کی مدد کر دوں گا تو پھر قرض واپس نہ ملنے پر اتنا پیسہ ڈوب جائے گا۔۔۔ اتنے سال میں گھر بنا لینا چاہیے۔۔۔ کون سے سال کون

سی گاڑی ہونی چاہیے۔۔۔۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے بھی پائی پائی جوڑنی ہوگی۔۔۔ بیٹیوں کی شادی کے لیے بھی پیسہ ہاتھ میں ہونا چاہیے۔۔۔۔ بیماری کا علاج بھی پیسے سے ہوتا ہے۔۔۔ ان ساری چیزوں کے بارے میں سوچتے سوچتے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا' وہ کب اللہ کی ذات کو پیچھے کرتے روپے کو آگے لے آتا ہے۔

روپے سے ایسا رشتہ جوڑ بیٹھتا ہے کہ اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کرپاتا۔۔۔ اس کی افزائش اور بڑھوتری پر خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہے۔ اس سے اثاثے بنا لینے پر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو محفوظ سمجھتا ہے۔۔۔ یہ اس پیسے کی حرص کا شیطانی اثر ہے۔ جس سے انسان کو لگتا ہے دنیا کا سسٹم چلتا ہے۔۔۔۔ حالانکہ دنیا کا نظام تو اللہ چلاتا ہے۔۔۔ وہ لمحہ بھر میں سالوں کی جمع پونجیاں خاک کردے۔۔۔۔ اللہ کو نظرانداز کرکے حرام کے ذریعے بنائے جانے والے اثاثوں کو انہیں کے ہاتھوں تباہ و برباد کردے۔۔۔ پھر انسان کیا کرے گا۔۔۔؟"

وہ سارے جواب اسے آج بھی یاد تھے جنہوں نے اسے تب بے چین کیا تھا لیکن قائل نہیں' وہ مغربی تہذیب اور تعلیم جس میں اس نے ساری عمر پرورش پائی تھی وہ ترقی کو انسان کی منزل قرار دیتی ہے اور اس منزل کے حصول کے لیے قانونی اور غیر قانونی کی تفریق تو کرتی تھی۔۔۔ حرام اور حلال کی نہیں۔۔۔۔ وہ مغربی معاشرہ جو سُود کے ستونوں پر کھڑا اسی کا بیج بو رہا تھا اسی کا پھل کھا رہا تھا وہ "منافع" کے اس طریقے کو جائز قرار دیتا تھا جو اخلاقیات اور انسانیت کے بنیادی اصولوں کی تذلیل اور تضحیک کرکے کھڑا کیا گیا تھا۔

"مغربی مالیاتی نظام یہود نے قائم کیا تھا اور دنیا کی معیشت کو اس مالیاتی نظام نے آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔ دنیا میں مالیاتی نظام کے وہ بانی تھے اور اس کو مؤثر ترین بنانے میں قابل رشک حد تک کامیاب۔۔۔۔ وہ سُود جو بنی اسرائیل کے زوال اور اس پر آنے والے بار بار کے عذاب کی وجہ بنتا رہا تھا' وہ آج بھی نہ صرف اس سے چپکے ہوئے ہیں بلکہ اس کو مسلمان قوم کے اندر تک اس طرح پھیلا چکے ہیں کہ اب یہ سودی نظام دنیا میں کسی بھی خطے میں بسنے والے مسلمان کے خون اور خمیر میں رچنے بسنے لگا ہے۔۔۔۔ وہ اس کو صحیح اور جائز قرار دینے کے لیے توجیہات دینے لگے ہیں اور یہ وہ امت محمدی تھی جن کے لیے قبلہ بدلا گیا تھا اور جنہیں بنی اسرائیل سے امامت لے کر دی گئی تھی۔۔۔۔"

ڈاکٹر سبط علی کی وہ سب باتیں اس کے ذہن پر تب کنکریاں برساتی تھیں تو آج ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

"تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟" وہ اس کی اتنی لمبی خاموشی سے پریشان ہوئے تھے۔ انہیں لگا شاید انہوں نے کوئی زیادہ سخت بات کہہ دی تھی اسے۔

"میں کیا سوچوں گا اب۔۔۔۔ میرے ہاتھ اتنے لتھڑے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا' اب اس سب سے نکلوں کیسے؟۔۔۔ کیا کروں؟" اس نے جیسے اپنی مشکل ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دی۔

"آپ اللہ سے دعا کریں' وہ راستہ نکالے آپ کے لیے۔۔۔ اور وہ وہ راستہ ہو جو دوسروں کی زندگی سنوار دے۔"

وہ ان کی بات نہیں سمجھ پایا لیکن اس نے آمین کہا تھا۔

"نہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کی جسارت کرنے والوں میں سے ہونا چاہتا ہوں نہ میں اللہ کی حدود توڑنے والوں میں سے۔۔۔۔ اگر اس پورے سسٹم کا حصہ بنا رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ کبھی میں کوئی ایسا سسٹم بنا سکوں جو سود پر مبنی نہ ہو اور پھر بھی قابل عمل ہو اور منافع بخش بھی۔۔۔۔ غلطی صرف یہ کی کہ یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی کوشش بھی نہیں کی۔۔۔ ضروریات زندگی اور خواہشات کا ایک ڈھیر میرے راستے میں آگیا جس نے میری ترجیحات کو بدل دیا۔۔۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ آپ کے پاس سود کے حوالے سے کوئی سوال بھی نہیں لے کر آؤں گا۔۔۔ حل لے کر آؤں گا۔" ڈاکٹر صاحب اس کی بات پر مسکرا دیے تھے۔

"میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔۔۔ میں اپنی زندگی کے آخری حصے میں ہوں اور اپنی ساری زندگی بے حد خواہش رکھنے کے باوجود اس سسٹم کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ بس کتابیں لکھ سکا۔ تجاویز دے سکا۔ لوگوں کو خبردار کرتا رہا۔۔۔ لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کر سکا۔۔۔ میں نہ تمہارے جتنا ذہین تھا نہ تمہارے جتنا قابل۔۔۔ نہ تمہارے جتنا بارسوخ۔۔۔ تم شاید وہ کام کر جاؤ جس کے بارے میں ہم خواب دیکھتے، سوچتے اور باتیں کرتے مرے جا رہے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب اب رنجیدہ ہو رہے تھے۔

"سود پر مبنی یہ مغربی مالیاتی نظام اس لیے طاقت ور ہے کیونکہ اس کو چلانے والے تمہارے جیسے ذہین لوگ ہیں جو اپنی ذہانت کو دنیاوی آسائشات کی خاطر انہیں ہی دیے جا رہے ہیں جس دن تمہارے جیسی ذہانت اور قابلیت رکھنے والے لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے ان کے خلاف کھڑے ہونا شروع ہو جائیں گے تو مغرب کا مالیاتی نظام گر جائے گا صرف اس لیے کہ وہ استحصالی اور سامراجی ہے اور وہ انسان اشرف المخلوقات ہے سکے ۔۔۔ نہیں طاقت ور کی بقا کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ جو طاقت ور اور پیسے والا ہے، وہ کمزور اور خالی جیب والے کو جس طرح چاہے ایکسپلائٹ کرے۔۔۔ مجھے افسوس ہوتا ہے تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ حافظ قرآن اور صاحب حیثیت ہو کر وہ کام کرتے آرہے ہو جو کوئی مجبور ضرور تا" کرتے ہوئے بھی شاید دوبار سوچتا ہے۔"

وہ سر جھکائے اپنی ہتھیلیاں دیکھتا گم صم بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ یہ عہدہ نہ لوں؟ جاب چھوڑ دوں؟" اس نے بہت دیر بعد ان سے بس ایک سوال کیا۔

"تم اس ذہانت کا استعمال کر کے فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اللہ سے پوچھو، وہ تمہارے لیے فیصلہ کرے۔"

انہوں نے فیصلہ ایک بار پھر اس پر چھوڑا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنسا۔ کوئی بھی اس کے لیے اب فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ ہر ایک کو اس کی اس ذہانت پر مان تھا جو اس کے اپنے لیے ایک گمان ثابت ہوئی تھی۔

"اللہ انسان پر بہت مہربان ہے سالار۔۔۔ گناہ پر یہ نہیں کہتا کہ توبہ کا موقع نہیں دوں گا۔۔۔ بار بار توبہ کا موقعہ دیتا ہے۔۔۔ اپنی طرف پلٹ آنے کا موقع دیتا ہے۔"

وہ اب اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

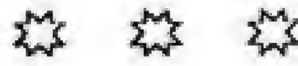
"زندگی میں جب انسان کو ہدایت مل جائے، وہ یہ نہ دیکھے کہ کیا کر چکا ہے۔ بس وہاں سے راستہ بدل لے۔"

وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا تھا۔۔۔ وہ نرم گفتار جس کے لیے وہ مشہور تھے۔۔۔ اور جو وہ سالوں سے سنتا چلا آ رہا تھا پر آج پتا نہیں کیوں دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی توبہ قبول ہو جائے گی اور اتنے آرام اور آسانی سے ہو جائے گی۔۔۔

اس بات پر ایمان رکھنے کے باوجود کہ اللہ انسانوں کو معاف کرتا ہے اور اپنے بندوں کے لیے، بہت رحیم ہے۔۔۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر یہ احساس بہت شدید تھا کہ اس نے اللہ کو خفا ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ کس حد تک کیا ہے یہ نہیں پتا چل رہا تھا۔۔۔ وہ حافظ قرآن تھا۔۔۔ الہامی کتاب کو اپنے ذہن میں محفوظ کیے۔۔۔ اتنا الہام تو اسے بھی ہو سکتا تھا کہ اس کتاب کا خالق اس سے خوش تھا یا اس سے خفا۔۔۔ اتنا تعلق اور رابطہ تو تھا اس کا اللہ سے کہ یہ جان لے کہ "وہ" اس سے خوش نہیں۔۔۔ دیر سے ہی سہی مگر اس کی روح کے اندر موجود وہ پیمانہ اپنے خالی ہونے کا احساس دلانے لگا تھا جو اللہ کی محبت ہی سے بھرتا تھا۔۔۔ اس کی خوشنودی ہی سے چھلکتا تھا۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے انہیں قدموں واپس واشنگٹن پلٹ آیا تھا۔ اسے اب اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا تھا جسے ایک لمبے عرصے سے گناہ نہیں ضرورت مانتا رہا تھا۔

ایک نیا اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا وہ عزم جو ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں دی جانے والی ذلت کے احساس نے جنم دیا تھا' وہ اب پہلے سے زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا کفارہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔
واشنگٹن میں ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں اس کے آفر قبول کرنے کے فیصلے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے ۔۔۔ وہ "پرزہ" جو انہیں اس وقت اپنی بقا کے لیے چاہیے تھا' انہیں مل گیا تھا۔
سالار سکندر نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اس کانٹریکٹ پر سائن کیے تھے۔۔۔ اب وہ ترقی ترقی نہیں لگ رہی تھی' دلدل کی ایک اور گہرائی لگ رہی تھی ۔۔۔ جس میں سے نکلنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے تھے۔



"حمین بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے تمہارے لیے۔"
سکندر عثمان نے اسے فون پر مبارک دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ صرف گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
"وہ ٹھیک ہے نا؟" سکندر عثمان نے حمین کے بارے میں اس سے پوچھا۔ وہ اس دن امامہ سے بات نہیں کر سکے تھے۔ قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے وہ اور ان کی بیوی روز ہی اس کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔
"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ stable ہے۔" اس نے انہیں بتایا اور تب ہی سکندر عثمان کو اسکول کا کوئی چوکیدار یاد آیا تھا جو ان سے کچھ رقم ادھار لینے آیا تھا۔
"کہہ رہا تھا سود پر کوئی رقم لی تھی اس کے ماں باپ نے اس کی بہنوں کی شادی کے لیے۔۔۔ اور وہ ابھی تک سود اتار رہا ہے۔ اب شاید کوئی اور مسئلہ آن پڑا ہے اسے۔"
سکندر عثمان اسے بتا رہے تھے اور سالار کو لگا' کسی نے اس کے گلے کی رسی میں ایک گرہ اور ڈال دی تھی۔۔۔ بعض دفعہ جب اللہ کوئی چیز منہ پر مار کر تنبیہہ کرنا چاہتا ہے تو پھر ہر جگہ سے وہی بات بار بار بازگشت کی طرح واپس آتی رہتی ہے۔۔۔
اس کے پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ چلے جانے کے بعد سکندر عثمان ہی گاؤں کے اس اسکول کو دیکھتے رہے تھے ۔۔۔ وہی ہفتے میں ایک بار وہاں جاتے اور اسکول کی انتظامیہ اور ملازمین کے معاملات دیکھتے۔۔۔ سالار اب صرف نام کی حد تک اسکول کے معاملات میں انوالو تھا۔
"آپ اس کی مدد کریں۔۔۔ اس کا قرضہ اتار دیں۔۔۔" سالار نے ان سے کہا۔
"ہاں تاکہ وہاں لائن لگ جائے قرض مانگنے والوں کی۔" سکندر عثمان نے سنجیدگی سے کہا "ہمیں کیا پتا وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔۔۔ ایک کا قرض اتاریں گے۔۔۔ پورا گاؤں اپنا اپنا قرض لے کر آ کھڑا ہو گا اسکول میں۔۔۔ کسی نے بھینس کے لیے لیا ہو گا' کسی نے فصل کاشت کرنے کے لیے۔۔۔ کسی نے ٹیوب ویل لگوانے کے لیے اور کسی نے بیٹی کی شادی کے لیے۔۔۔ یہاں گاؤں دیہات میں 70 فی صد لوگ سود پر ایک دوسرے سے قرضے لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی۔۔۔ یہ ان کی زندگی اور کاروبار کا سائیکل ہے۔۔۔ تم یا میں اسے روک سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔۔۔ ایک دفعہ تم غلام فرید کا قرض اتار دو گے۔۔۔ اگلی بار ضرورت پڑنے پر وہ پھر کسی نہ کسی سے قرض لے گا اور اسی طرح سود پر۔۔۔ وہاں کوئی کسی کو اس کے بغیر رقم ادھار نہیں دیتا۔۔۔ اور وہاں ادھار اور قرض کے بغیر لوگوں کا کام نہیں چلتا۔ اس لیے بہتر ہے ہم اور میں ان چیزوں میں نہ پڑیں۔"
سکندر عثمان نے جو توجیہہ دی تھی۔ وہ بھی غلط نہیں تھی مگر وہ یہ بات سن کر دنگ ضرور رہ گیا تھا کہ وہ وبا کہاں کہاں ناسور کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ سکندر عثمان کو اندازہ تھا' اسے اندازہ نہیں ہوا تھا گاؤں میں اتنا آتے جاتے

رہنے کے باوجود۔۔۔

اسی رات اپنے ہوٹل میں ورلڈ بینک کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کی ملاقات تھی۔ انہیں کانگو کے لیے اپنا لائحہ عمل ڈسکس کرنا تھا اور انفارمل ڈنر اور گپ شپ کے بعد وہ اس ہوٹل کے نائٹ کلب میں ان سب کے اصرار پر ایک اسپینی گلوکارہ کو سننے کے لیے گیا تھا اور وہاں جیکی اس سے آٹکرائی تھی اس کے ساتھ پچھلے چند دنوں میں وہ سب کچھ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ کبھی اس پر شک نہیں کرتا۔۔۔ اسے ایسی کوئی عورت سمجھتا جو تنہائی کی ماری ہوئی ہوتی یا وقتی کمپنی چاہتی تھی۔۔۔ وہ بہرحال ایسا ہوٹل اور نائٹ کلب نہیں تھا جہاں دوسرے تیسرے درجے کی stripers یا کال گرلز بافراط گاہک کی تلاش میں منڈلاتی پھرتیں۔۔۔ وہاں ایسی کوئی خواتین نظر بھی آتیں تو پہلے سے کسی کے ساتھ ہوتیں یا کسی کی دعوت پر۔۔۔ اور ایسی کسی جگہ پر اس قدر اٹریکٹو عورت کا اس پر یوں فدا اور فریفتہ ہونا اور اس کے ساتھیوں کا اس کے اطراف سے یک دم ایک ایک کر کے غائب ہونا۔۔۔ سالار نظر انداز نہیں کر سکا۔۔۔ اسے ہنسی آئی تھی۔۔۔

مغرب کو ہر فرسٹریشن کا علاج اور حل الکحل اور عورت کی شکل میں کیوں سوجھتا تھا۔۔۔ ان کی ہر ترغیب کی ابتدا اور انتہا عورت ہی کیوں ہوتی تھی۔۔۔ اور سی آئی اے کو جلدی آخر کس چیز کی تھی۔۔۔ اس کو ٹریپ کرنا تھا تو اتنا گھسا پٹا منصوبہ تو نہ بناتے۔۔۔ مستقبل میں اس کو استعمال کرنے کے لیے کوئی کمزوری چاہیے تھی تو کچھ تو انتظار کرتے۔۔۔

وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا۔۔۔ ان ترغیبات اور حالات سے مزید خبردار ہو کر جو اس ترقی کا ثمر تھیں جن کی اس نے خواہش کی تھی۔۔۔

اور اب وہ اس جہاز پر تھا۔۔۔ اور اپنی پوری زندگی کو اپنی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلتے دیکھتے ہوئے۔

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ بس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔۔۔ تجارت بھی تو سود ہی ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔“

اس نے ایک بار قرآن پاک میں سورۃ بقرہ میں پڑھا تھا۔۔۔ دوسرا جملہ تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا لیکن پہلا جملہ وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ آج اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔

”وہ اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔“

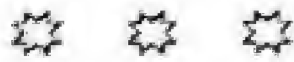
اس کیفیت میں تو وہ تھا۔۔۔ حلق پر ہاتھ پڑا تھا سالار سکندر کے۔۔۔

جہاز پر کنشاسا کے اس سفر میں اس نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی نوکری سے کمائے جانے والے پیسے سے اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرے گا۔۔۔ اس کے لیے کسی بھی اور ذریعے سے ان کی کفالت اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔۔۔ وہ بہت سی امریکن یونیورسٹیز میں لیکچرز کے لیے مدعو ہوتا رہا تھا اور ان لیکچرز کے لیے اسے معاوضہ بھی دیا جاتا رہا تھا۔۔۔ اس سے پہلے اس نے جاب کے علاوہ ان دوسرے ذرائع کے بارے میں غور نہیں کیا تھا جہاں کام کر کے وہ اتنا رزق بخوبی کما لیتا کہ کم از کم اس اسٹیج پر اسے اس ذمہ داری کو اٹھانے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔

اسے اب ورلڈ بینک کی نائب صدارت صرف دو چیزوں کے لیے چاہیے تھی۔۔۔ وہ وہ قرض سر سے اتار دیتا جو ایبا کا نے اس کے لیے چھوڑا تھا اور وہ کچھ مہلت حاصل کر لیتا۔۔۔ سود سے پاک پہلے بین الاقوامی اسلامی مالیاتی ادارے کی تشکیل کے لیے۔۔۔

مقصد بہت بڑا تھا۔۔۔ وسائل بھی اتنے ہی درکار تھے۔۔۔ دماغ کہتا تھا سب کچھ ہو سکتا ہے ناممکن کچھ نہیں۔ دل کہتا تھا' بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں اور ضمیر کہتا تھا۔۔۔ راستہ ہے تو یہی ہے۔۔۔ اور اللہ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار جیسے اللہ نے بھی اس آزمائش کے لیے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔۔۔

اندر کی وہ آواز بالکل خاموش تھی جو ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتی تھی۔۔۔ سالار سکندر کو اگر یہ وہم تھا کہ اللہ اس سے خفا تھا تو وہ صرف وہم نہیں تھا۔



اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اب کسی راستے پر لے جانے لگا۔۔۔ ایک قدم' دوسرا قدم' تیسرا۔۔۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک جھیل تھی۔ چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر وہ تھے۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔۔۔ جس کے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں تیرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

اور اس کی تہ میں بے شمار رنگوں کے موتی۔۔۔ پتھر۔۔۔ سیپیاں۔۔۔

جھیل کے پانی پر آبی پرندے تیر رہے تھے۔۔۔ خوب صورت راج ہنس جھیل کے چاروں اطراف پھول تھے۔۔۔ اور بہت سے پھول جھیل کے پانی تک چلے گئے تھے۔۔۔ کچھ پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔

مگر اس کے قدموں کو ان میں سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ اس کے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوب صورت چھوٹی سی کشتی تھی جو پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کھلکھلا کر اسے دیکھا۔

"یہ میری ہے؟" وہ مسکرا دیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ اس کے قریب پہنچنے پر کشتی پانی سے کچھ باہر آگئی۔ وہ بڑی آسانی سے اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لگا وہ کشتی صندل کی لکڑی سے بنی تھی۔ خوشبودار صندل سے۔۔۔

وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ دونوں بے اختیار ہنسے۔

کشتی اب جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں تیرتا کنول کا پھول پکڑ لیا۔ پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔

اس نے دوسری طرف جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جھیل کا پانی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی سمیت لیا اور اس کے سامنے کر دیا اس کے ہاتھوں کے پیالے میں حرکت کرتی مچھلی کو دیکھ کر وہ ہنسی پھر اس نے اس مچھلی کو ہاتھ سے پکڑا اور پانی میں اچھال دیا۔ وہ دونوں جھک کر اسے دیکھتے رہے۔

پانی پر تیرتا ایک ہنس کشتی کے پاس آگیا۔ پھر دوسرا' پھر تیسرا۔۔۔ وہ کشتی کے گرداب جیسے ایک دائرہ سا بنا کر تیر رہے تھے۔ یوں جیسے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ پاس سے تیر کر گزرتے' ہر ہنس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے جھیل کے پانی پر کنول کے پھولوں کی قطاروں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ جھیل کے پانی پر تیرتے اب رقص کر رہے تھے۔

ادھر سے ادھر جاتے۔۔۔ خوب صورت شکلیں بناتے۔۔۔ پاس آتے دور جاتے۔۔۔ پھر پاس آتے۔۔۔ یوں جیسے وہ یک دم ہنسوں کی طرح زندہ ہو گئے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر وہ سفید کنول اپنے سبز خوب صورت پتوں کے ساتھ ہونے والی مسلسل حرکت سے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے وہ بے خود ہو رہی تھی یا بے اختیار۔۔۔ وہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سمجھنا اب ضروری تھا بھی نہیں۔

جھیل کے نیلے پانی پر رقص کرتے لاتعداد خوب صورت پھولوں کے بیچ اس نے یک دم کسی عکس کو نمودار ہوتے دیکھا کشتی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر مڑی اور پھر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کے پاس آ گئی تھی اور وہاں۔۔۔ وہاں کچھ تھا۔

امامہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی گہری نیند سے۔ اس نے اپنی کلائی پر کسی کا لمس محسوس کیا تھا۔ خواب آور دوا کے زیر اثر

اسے ایک لمحہ کے لیے کمرے کی مدھم روشنی میں یوں لگا وہ ایک خواب سے کسی دوسرے خواب میں آئی تھی۔ سالار اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔۔۔ بے حد قریب بستر پر دھرا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ پتا نہیں نیند ٹوٹی تھی یا خواب۔۔۔ یا پھر وہ لمس تھا جو اسے خواب سے حقیقت میں لے آیا تھا لیکن وہ خواب اور دوا کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی یک دم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی 'سالار نے اسے روکا۔

''اٹھو مت۔۔۔''

''تم واقعی آگئے ہو؟'' امامہ کو اب بھی جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا۔۔۔ ''تمہیں بتایا تو تھا کہ آجاؤں گا۔''

''یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کب آؤ گے؟ اور تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟''

''بس میں نے سوچا' تمہاری نیند خراب ہوگی۔'' وہ مدھم آواز میں بات کر رہا تھا۔۔۔ دوسرے بستر پر جبریل اور عنایہ تھے جو گہری نیند میں تھے اور صوفے پر ہیڈی تھی جو کچھ دیر پہلے سالار کے آنے پر دروازہ کھلنے کی آواز سے جاگ گئی تھی اور سالار کے ساتھ کچھ خیر مقدمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ رات کے پچھلے پہر کنشاسا پہنچا تھا اور ایئرپورٹ پہ رکے بغیر وہاں آگیا تھا۔ شہر میں حالات اب نارمل ہو رہے تھے۔۔۔ فوج اور حکومت امن بحال کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' امامہ نے سالار کے چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور آنکھیں سرخ اور یوں سوجی ہوئی تھیں یوں جیسے وہ کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔

''کچھ نہیں۔ بس اتنے دن گھر سے دور رہا تو شاید اس لیے پھر۔''

سالار نے اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ امامہ نے اس کی بات کاٹ دی' اسے یک دم اپنا خواب یاد آگیا تھا۔

''سالار! تمہیں پتا ہے' ابھی میں خواب میں کیا دیکھ رہی تھی؟'' سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا؟''

''میں نے خواب میں ایک گھر دیکھا جھیل کنارے۔۔۔ جہاں تم مجھے لے کر جارہے تھے۔۔۔ ایک کشتی میں بٹھا کر۔''

وہ دم بخود رہ گیا۔۔۔ جو گھر اس نے امریکہ میں اس کے لیے mortgage کیا تھا' وہ سمندر کے ایک جھیل نما ٹکڑے کے کنارے تھا۔۔۔ اس نے ابھی تک امامہ کو اس گھر کے بارے نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اس کی اگلی سالگرہ پر۔۔۔ لیکن اب وہ بیٹھے بٹھائے اسے جھیل کنارے ایک گھر کا قصہ سنا رہی تھی۔

''جس جھیل کے کنارے وہ گھر تھا وہ جھیل بے پناہ خوب صورت تھی۔۔۔ سفید کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی نیلے پانی کی جھیل۔۔۔ جس میں ہر طرف راج ہنس تیر رہے تھے۔۔۔ اور پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں۔۔۔ اور کشتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے خود ہی چل رہی تھی۔۔۔ اور جھیل کے کنارے پھولوں بھری جھاڑیاں تھیں۔۔۔ رنگ رنگ کے پھول سبزے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔۔۔ اور پھول ٹوٹ ٹوٹ کر پانی پر بہتے چلے جارہے تھے۔''

وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ جس جھیل کے کنارے اس نے گھر خریدا تھا۔۔۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔۔۔ اس کے گرد بھی پھول تھے۔۔۔ آبی پرندے اور راج ہنس بھی۔۔۔ اور کنول کے پھول بھی۔۔۔ اور اس جھیل کے کنارے جتنے گھر تھے' ان سب کی کشتیاں بھی اس پانی میں رہتی تھیں۔ بس فرق یہ تھا کہ ان میں سے کوئی لکڑی کی چپو والی کشتی نہیں تھی جیسا نقشہ وہ کھینچ رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے اسے محسوس ہوا' امامہ کو شاید اس گھر کا پتا چل گیا تھا۔۔۔ شاید اس نے اس کے لیپ ٹاپ میں

اس گھر کی تصویریں دیکھ لی تھیں۔۔۔ اور اب وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اگر ایسا بھی تھا تو اس نے کب لیپ ٹاپ دیکھا تھا۔۔۔ پچھلے کئی دنوں میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا لیپ ٹاپ اس کے پاس تھا اور اگر یہ اس سے پہلے ہوا تھا تو پھر وہ اس وقت ان حالات میں وہ خواب کیوں سنا رہی تھی۔ وہ الجھا تھا اور بری طرح الجھا تھا۔

"اور گھر کیسا تھا؟" وہ کریدے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شیشے کا۔" سالار کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اس کا Mortgage کیا ہوا گھر بھی شیشے ہی کا تھا۔

"لیکن مجھے اس کے اندر کچھ نظر نہیں آیا۔۔۔ وہ شیشے کا تھا لیکن اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور میں کشتی سے اتر کر گھر کے اندر جانا چاہتی تھی تو تب ہی میری آنکھ کھل گئی۔"

وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھی یوں جیسے اسے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ سالار پلکیں جھپکے بغیر صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"لیکن وہ گھر ویسا گھر تھا جیسا میں ہمیشہ بنانا چاہتی تھی جیسا میں اپنے اسکیچز میں اسکیچ کرتی رہتی تھی۔ وہی جھیل۔۔۔ وہی سبزہ۔۔۔ وہ شیشے کا گھر۔۔۔ اور ہر طرف پھول۔" وہ جیسے ابھی تک کسی خمار میں تھی۔ سالار بھی گنگ تھا۔ اس نے بھی اس گھر کو mortgage کرتے ہوئے وہی ساری چیزیں ڈھونڈی تھیں جو وہ اپنے اسکیچ میں ڈیزائن کرتی رہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ امامہ سے کیا کہے۔۔۔ اگر وہ کھیل تھا تو وہ بہترین کھیل رہی تھی اور اگر وہ کھیل نہیں تھا تو اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔

"تم نے کبھی زندگی میں کوئی جھیل دیکھی ہے ایسی جیسی میں تمہیں بتا رہی ہوں؟" سوال اچانک آیا تھا اور عجیب و غریب تھا۔

"میں نے؟" وہ چونکا۔۔۔ "میں نے؟" اس نے ذہن پر زور دیا اور پھر ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے وہ جھیل خواب میں دیکھی تھی۔۔۔ اس رات جب وہ امامہ کو گھر لے کر آیا تھا تو اس نے خواب میں خود کو کسی حسین اور خوب صورت وادی میں امامہ کے انتظار میں پایا تھا اور پھر امامہ آگئی تھی اور پھر اس وادی کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اسے اس وادی سے ایک جھیل اور کشتی تک لے گیا تھا۔۔۔ اس جھیل کا نقشہ ویسا ہی تھا جیسا وہ بتا رہی تھی۔۔۔ پھول، سبزہ، نیلا پانی۔۔۔ راج ہنس۔۔۔ کنول کے پھول۔۔۔ اور لکڑی کی چپو والی صندلین کشتی۔۔۔

سالار کے جسم میں کپکپاہٹ ہونے لگی تھی۔۔۔ وہ اگر پزل تھا تو اس کے دو ٹکڑے عجیب انداز میں جڑے تھے۔

"تم نے یہ کیوں پوچھا کہ میں نے خواب میں کبھی کوئی جھیل دیکھی ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں امامہ سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے حرم پاک کے بارے میں دیکھا جانے والا وہ خواب۔۔۔ جس کا ایک حصہ میں نے دیکھا تھا تو ایک حصہ تم نے بھی دیکھا تھا۔۔۔ اور ایک ہی رات۔"

وہ اسے عجیب چیزیں یاد دلانے بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے سوچا شاید یہ بھی ویسا ہی کوئی خواب ہو۔۔۔ شاید وہ گھر تم اندر سے دیکھ چکے ہو جو مجھے نظر نہیں آیا۔"

وہ بچوں جیسے اشتیاق کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔ یوں جیسے وہ کہے گا ہاں۔۔۔ میں اس گھر کو اندر سے دیکھ چکا ہوں۔۔۔ سالار کسی بت کی طرح اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔۔۔ یقیناً" اس خواب کے دو ہی حصے تھے۔۔۔ لیکن وہ امامہ سے پچھلے حصے کا گواہ تھا۔۔۔ وہ اس وادی کو دیکھ چکا تھا جہاں وہ جھیل تھی پر اس جھیل کو اس نے دور سے دیکھا تھا کنارے

سے۔۔۔ جسے امامہ نے پار کیا تھا۔۔۔ اور جھیل کے پار جو گھر تھا۔ اس تک وہ دونوں ہی نہیں پہنچے تھے۔۔۔ اس نے گھر کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔۔۔ امامہ نے جھلک دیکھی تھی پر اندر نہیں جھانک پائی تھی۔۔۔

وہ خواب دونوں نے پہلے والے خواب کی طرح ایک رات میں نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے وہ رخصتی کی پہلی رات امامہ کو گھر لانے پر۔۔۔ اور امامہ نے تقریباً" چھ سال بعد۔۔۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" امامہ کو اس کی نظریں بے حد عجیب لگیں۔

اس نے امامہ سے نظریں ہٹالیں' وہ اسے یہ نہیں بتاسکا کہ وہ کنشاسا آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی سے مل کر واشنگٹن آنے کے بعد اس گھر کی mortgage کینسل کرواچکا تھا۔۔۔ امامہ کے خوابوں کا گھر اس کے ہاتھ سے جا چکا تھا۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے بس ایک لمحے کے لیے اسے عجیب پچھتاوا اور رنج ہوا اس mortgage کی کینسلیشن پر۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ اس گھر کو واپس حاصل کرلے فوری طور پر امریکہ بات کرکے۔۔۔ وہ اس وقت جس پوزیشن میں تھا۔ یہ کرسکتا تھا۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا تھا۔۔۔ یہ صرف سی آئی اے نہیں تھی جو اس کے لیے جال بچھارہی تھی۔۔۔ شیطان بھی وہیں تھا۔۔۔ "اس کے بندوں کو اپنے بندوں میں بدلنے کے لیے کمربستہ۔۔۔ جال سی آئی اے نے عورت کا پھینکا تھا تو شیطان نے گھر کا۔۔۔ زن۔۔۔ زر۔۔۔ زمین۔۔۔ انسان ان تین چیزوں سے سردار بنتا ہے اور انہیں چیزوں سے "سر" دار تک جاتے ہیں۔

سالار سکندر سی آئی اے کو اعوذباللہ من الشیطن الرجیم کہہ کر جو تا مار آیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا' شیطان خود اٹھ کر سامنے نہ کھڑا ہوتا۔ اس سے بڑی ترغیب۔۔۔ بڑی گمراہی۔۔۔ بڑا لالچ۔۔۔ بڑا پھندا ایک بار قدم ڈگمگائے تو۔۔۔ ایک بار وہ ہاتھ آئے تو۔۔۔ اور شیطان کے منہ پر لعنت بھیج کر' تھوک کر آنے والا جس کی پناہ اور حفاظت کا دعوا کر کے آیا تھا۔۔۔ یہ کیسے ممکن تھا' وہ رب اپنے بندے کی حفاظت کے لیے وہاں نہ ہوتا۔۔۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ گناہ پر اس کے لیے سزا زیادہ تھی تو اچھائی پر اس کے لیے انعام بھی بے پناہ۔۔۔

"حمین کیسا ہے؟" وہ یک دم بات وہیں کی وہیں چھوڑ کر حمین کے انکوبیٹر کی طرف آیا تھا۔ شیطان نے افسوس سے ہاتھ ملے۔۔۔ وہ بات چھوڑ کر کیسے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔۔۔ وہ برق کی طرح آیا تھا اور پل بھر میں غائب ہوا۔۔۔ بس وسوسہ اور وہم ڈالنا تھا۔۔۔ وہ ڈال گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ دیکھو' سو رہا ہے۔" امامہ نے وہیں تکیے سے ٹیک لگائے کہا۔

سالار نے انکوبیٹر کو کھول کر پہلی بار محمد حمین سالار کو گود میں لیا تھا۔۔۔ ساری میڈیکل احتیاطوں کی نفی کرتے ہوئے اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے جھکے جھکے سینے سے لگایا اور چوما۔۔۔ وہ کمزور بچہ باپ کے لمس پر کسمسایا پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ سیاہ۔۔۔ موٹی۔۔۔ گول آنکھیں جو اس نحیف و نزار وجود پر عجیب و غریب لگ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی باپ کو دیکھا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اسے دیکھتا رہا۔۔۔ سالار بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر اس کے ماتھے پر چند بل آئے تھے۔۔۔ ناک اوپر چڑھی۔۔۔ اور پھر حمین نے پوری قوت سے گلا پھاڑ کر رونا شروع کردیا تھا۔۔۔ اس کی آواز اتنی باریک اور اتنی تیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے سالار ہکا بکا رہ گیا تھا کہ اس کے ننھے وجود کے اندر اس طرح گلا پھاڑ کر رونے کے لیے جان کہاں سے آئی تھی۔۔۔ جبریل اور عنایہ اس کی آواز پر بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔۔۔ حمین جب بھی روتا تھا اسی طرح اچانک اور اسی والیم پر روتا تھا۔

پیڈی یک دم اندر آگئی تھی۔ سالار حمین کو واپس انکوبیٹر میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا لیکن وہ ایک ہفتہ کا بچہ ایک بار انکوبیٹر سے نکلنے کے بعد دوبارہ اندر نہ جانے کے لیے' جس حد تک جدوجہد کرسکتا تھا کر رہا تھا۔۔۔ اس کا اگر بس چلتا تو وہ اپنے ہاتھوں کی پشت' سینے' ناک اور جسم کے ہر حصے پر لگی نالیوں اور تاروں کو کھینچ کر اتار دیتا

۔وہ ان میں سے کسی چیز کو تو نہیں اتار سکا مگر وہ ہلکا سا ڈائپر اس کے جسم کے مسلسل جھٹکوں سے یک دم کھل گیا تھا جو ۔۔۔ صرف رسما" ہی اسے باندھا گیا تھا۔۔۔

ڈائپر کے علاوہ حمین کے جسم پر جگہ جگہ لگائی تاروں اور نلکیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔وہ یکدم ہی تارزن کے بچے جیسے حلیے میں آگیا تھا۔بستر سے چھلانگ لگا کر باپ کی طرف بھاگتے جبریل نے اپنے چھوٹے بھائی کے اس "دلیرانہ" اقدام پر بے اختیار چیخ مار کر آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔۔۔۔

"baba baby is naked"

(بابا بے بی ننگا ہے۔۔۔) اس نے جیسے بے یقینی سے آنکھوں کی ہتھیلیوں سے ڈھانپے اعلان کیا۔

وہ آنکھیں بند نہ کر لیتا تو بے شرمی کے اگلے مظاہرے پر یقینا" پتھر کا ہو جاتا کیونکہ بے بی اسی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر روتے ہوئے ڈائپر سے نجات حاصل کرنے کے بعد اب اس پانی سے بھی فراغت حاصل کر رہا تھا جو ٹیوبز کے ذریعے اس کے اندر منتقل کیا جا رہا تھا۔۔۔ ہیڈی کو حمین کو تھماتے ہوئے سالار بے یقینی سے اپنی پیشاب سے بھیگی ہوئی شرٹ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ یہ کارنامہ اس کے پہلے دو بچے کبھی نہیں کر سکے تھے۔

"تم نے پتا نہیں اسے کیسے پکڑا ہے۔۔۔ کتنے سخت ہاتھ لگائے ہیں کہ وہ اس طرح رو رہا ہے۔۔۔۔ ہیڈی لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔ بلکہ اسے مجھے دو۔۔۔ نہیں میں آتی ہوں۔"

امامہ اس کی حالت کو مکمل طور پر نظر انداز کیے اپنے روتے ہوئے بیٹے کی طرف متوجہ اپنے بستر سے بے قراری کے عالم میں اتر رہی تھی۔

"Baba can I open my eyes "

(بابا!میں اپنی آنکھیں کھول لوں)

جبریل اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے باپ کو ڈھونڈتے لڑکھڑاتے قدموں سے آنکھیں بند کیے سالار کی طرف آ رہا تھا وہ اس چھوٹے بھائی کی بے پردگی دیکھنے پر تیار نہیں تھا جو اس وقت لٹل اسٹوارٹ کی طرح چلاتے ہوئے انکوبیٹر سے باہر کودنے کو تیار تھا۔

عنایہ ایک بار ہڑبڑا کر جاگنے کے بعد سالار کی طرف متوجہ ہوئے بغیر دوبارہ سو چکی تھی۔۔۔ سالار نے جبریل کے پھیلے ہاتھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح زمین پر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے۔۔۔ یہ وہ زندگی اور دنیا تھی جو اس کے ہاتھ سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی تھی۔۔۔ اس کی انگلیوں کی پوروں تک جا کر واپس پلٹی تھی یہ زندگی۔۔۔ یہ آوازیں ۔۔۔ اس کا خاندان۔۔۔ وہ کمرہ اس میں موجود وہ ننھے منے وجود جو اس کے وجود کی تکمیل کرتے تھے۔

"Yes you can۔"

اس نے اسی طرح جبریل کو خود سے لپٹائے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔جبریل نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چور نظروں سے حفظ ماتقدم کے طور پر انکوبیٹر کو دیکھا جہاں اب حمین ہیڈی اور امامہ کے وجود کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"why are you crying papa۔"

(بابا!آپ کیوں رو رہے ہیں؟)

باپ کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے پہلی نظر میں ہی اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور اس کے جملے نے امامہ کو بھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سالار کی پشت اب اس کی طرف تھی اور وہ جبریل کو لپٹائے چومے جا رہا تھا۔



گھر مکمل طور پر جل گیا تھا۔۔۔ نقصان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر یہ ورلڈ بینک کی طرف سے فراہم کی جانے والی رہائش گاہ تھی۔ اس لیے اس کا نقصان پورا ہو جانے والا تھا۔۔۔ سالار کنشاسا پہنچنے کے اگلے ہی دن اس گھر کو دیکھنے آیا تھا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔۔۔ وہاں سب ہی گھروں کو ہی آگ لگائی گئی تھی لوٹ مار کے بعد۔۔۔ اب وہاں جو بچا تھا' وہ ملبہ اور راکھ تھی۔۔۔ وہ پھر بھی خوش نصیبوں میں تھا کیونکہ اس ملبے میں اس کے کسی پیارے کی ہڈیاں نہیں تھیں۔

یہ سالار سکندر کے ساتھ دوسری بار ہوا تھا۔۔۔ پہلی بار اس نے گاؤں میں اپنے اسکول کی عمارت کو یوں خاکستر ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ اس گھر کے ملبے کو دیکھتے ہوئے اس نے جو سوچا تھا' وہ اسکول کی راکھ کو دیکھ کر نہیں سوچا تھا تب اس نے امامہ کی فیملی کو ہر نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور کہیں بھی اس نے یہ نہیں سمجھا یا سوچا تھا کہ یہ اس کے اپنے کسی عمل کی سزا تھی۔ کوئی تنبیہہ تھی جو اسے کی جا رہی تھی۔ وہ سود سے کمائے جانے والے پیسے سے فلاح عامہ کا کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اسے قبول کرتا۔۔۔ آج ایک بار پھر وہ ایسے ہی ایک ملبے کے سامنے کھڑا ہوا یہ سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اس کا رزق تھا جس سے صرف شر نکل رہا تھا۔ خیر نہیں۔

گھر کو لگنے والی آگ میں وہ چھوٹی موٹی ساری جیولری' سیونگ سرٹیفکیٹس اور اس کے بچوں کی انشورنس کے پیپرز راکھ ہو گئے تھے یا لوٹ لیے گئے تھے۔۔۔

امامہ کو شادی میں سالار کی فیملی کی طرف سے ملنے والا زیور پاکستان میں ہی ایک لاکر میں تھا یہاں امامہ کے پاس صرف وہ چھوٹی موٹی ڈائمنڈز کی جیولری تھی جو وہ وقتاً"فوقتاً" افریقہ یا امریکہ میں خریدتی رہی تھی لیکن اس چھوٹی موٹی جیولری کی قیمت بھی چالیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔۔۔ اس گھر میں اور بھی بہت کچھ چلا گیا تھا جس کا امامہ کو صدمہ تھا لیکن سالار کو نہیں تھا۔۔۔ اس کے لیے یہ کافی تھا کہ اس کا خاندان سلامت تھا۔

ورلڈ بینک نے اپنے تمام ملازمین کے نقصانات کو پورا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور یہ کام ہنگامی بنیادوں پر

ہو رہا تھا۔ تمام ملازمین کو اپنے کلیمز داخل کرنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن سالار سکندر نے کوئی کلیم داخل نہیں کیا تھا۔۔۔ اسے اب اس پیسے سے خوف آ رہا تھا جو جب بھی اس کے پاس آتا۔ اس کی حلال کمائی کو بھی اپنے ساتھ خس و خاشاک کر دیتا۔

وہ ایمبیسی سے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔ حمین امریکن ایمبیسی کے ہی اس اسپتال میں رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں جب ڈاکٹرز حمین کو سفر کے قابل قرار دیں تو تم بچوں کو لے کر پاکستان چلی جاؤ۔"

سالار نے ایک رات امامہ سے کہا تھا۔ وہ اس دن کچھ بنیادی ضروریات کی چیزیں خرید کر لائی تھی ہوٹل کے اس سویٹ کے لیے۔ جو اب وقتی طور پر ورلڈ بینک کی طرف سے سالار سکندر کی رہائش گاہ بھی تھا اور آفس بھی۔۔۔۔ وہ ایک گھن چکر کی طرح پورے کانگو میں ایک بگولے کی طرح گھومتا پھر رہا تھا اور ورلڈ بینک اور یونائیٹڈ نیشنز کے امن پیغامبروں کے ساتھ۔۔۔ کام کے دوران دن اور رات کی تمیز اس نے پہلے بھی کبھی نہیں کی تھی لیکن اب تو یہ فرق بالکل ہی مٹ گیا تھا۔ اور اس ساری بھاگ دوڑ میں اسے امامہ سے بات کرنے کا خیال آیا بھی تھا تو صرف اسی ایک بات کے لیے۔۔۔

"کیوں؟" وہ ناخوش ہوئی تھی۔

"کیونکہ جو کچھ کانگو میں ہو چکا ہے، میں اب تم لوگوں کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

امامہ کچھ دیر پہلے اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔۔۔ کئی دنوں بعد انہیں رات کے اس پہر آپس میں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔۔۔ حمین اسپتال سے ڈسچارج ہونے والا تھا اور سالار جیسے ان کو واپس بھیجنے کے لیے گھڑیاں گن رہا تھا۔

"کانگو اتنا غیر محفوظ ہے تو تم یہاں کیوں رہنا چاہتے ہو۔ تم بھی واپس چلو۔" امامہ نے۔۔۔ جواباً" کہا۔

وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا "میں فی الحال نہیں جا سکتا۔" اس نے ایک گھونٹ لیا۔

"فی الحال؟" امامہ نے جواباً" پوچھا۔

"اگلے پانچ سال۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔"

امامہ نے کافی کا کپ اسی طرح رکھ دیا۔ مزید کسی سوال جواب کے بغیر اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"تمہاری ضد مجھے کمزور کرے گی!۔۔۔ تم اور بچے یہاں رہیں گے تو میں بہت پریشان رہوں گا۔ اپنے کام پر دھیان نہیں دے پاؤں گا۔ تم لوگ محفوظ۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی

"تمہیں لگتا ہے تم یہاں کانگو میں بیٹھے رہو گے تو میں اور بچے پاکستان میں عیش کریں گے۔ تم اپنے سکون کے لیے مجھے بے سکون کرنا چاہتے ہو؟ میں نہیں جاؤں گی سالار۔۔۔ مجھے وہیں رہنا ہے جہاں تم رہو گے۔۔۔ میں کسی بنکر میں چھپوں گی نہ بچے چھپیں گے۔۔۔ اگر یہاں خطرہ آئے تو پھر سب کے لیے آئے اور اگر تحفظ ہو تو بھی سب کے لیے۔۔۔"

وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا وہ اس کے ہر لہجے سے واقف تھا اور جانتا تھا وہ اس ضد سے نہیں ہٹے گی۔

ڈاکٹر سبط علی نے کہا تھا "اسے امامہ سے جو تکلیف ملی تھی۔ وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا لیکن وہ ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اس کے ساتھ میں جو سکون ملتا تھا۔ وہ کس نیکی کا صلہ تھا۔

"تم کچھ کرنا چاہ رہے ہو جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔۔۔ لیکن تم چھپا نہیں سکو گے۔۔۔ میں جان جاؤں گی۔۔۔ تم بتاؤ

نہ بتاؤ۔"

وہ اب شکی بیویوں کی طرح اسے کرید رہی تھی اور ساتھ جیسے خبردار بھی کر رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اس میں ابھی اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہو رہا کہ وہ اس کے سامنے وہ اعترافات کرے جو وہ ڈاکٹر سبط علی کے سامنے کر کے آیا تھا اور پھر اسے بتائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ اسے ناکامی کا اندیشہ تھا اور ناکامی کا خوف بھی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے۔۔۔ جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں پیٹرس ایباکا کے ساتھیوں سے ملنے اور مذاکرات کرنے۔" سالار نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"ایک مہینے تک پھر بھی پاکستان چلیں گے۔"

"تم چلو گے؟" امامہ نے بیچ میں ہی بات کاٹ کر پوچھا تھا یوں جیسے اسے اندیشہ ہوا تھا کہ وہ اب بہانے سے اسے پاکستان واپس بھیجنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔۔۔ چلوں گا یار۔۔۔ اتنی بے اعتباری بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

اس نے جیسے بُرا مانتے ہوئے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھ دیا تھا۔



ورلڈ بینک اور امریکی حکومت نے اگر واشنگٹن میں سالار سکندر کے ساتھ مذاکرات میں اسے فری ہینڈ کی ضمانت دی تھی تو انہوں نے یہ وعدہ پورا کیا تھا۔ انہوں نے سالار سکندر کو افریقہ کے سیاہ و سفید کا مالک بنا کر وہاں بھیجا تھا۔ وہ ورلڈ بینک کے مختلف خطوں کے لیے مخصوص وائس پریذیڈنٹس میں سے پہلا اور واحد وائس پریذیڈنٹ تھا جس کے پاس کام کرنے کی اتنی آزادی اور اختیارات تھے اور جس سے ورلڈ بینک کا بورڈ آف گورنرز ہی نہیں امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ بھی وقتی طور پر دب رہا تھا۔ سالار سکندر ان کا وہ پیادہ تھا جو بیٹھے بٹھائے پیادے سے بادشاہ بن گیا تھا اور اس چیس بورڈ پر موجود تمام اہم مہروں کو یک دم اس کو بادشاہ کی حیثیت دینی پڑ رہی تھی۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی نائب صدارت قبول کرنے کے اگلے دن اس نے کنشاسا جانے سے پہلے پہلی بار واشنگٹن میں اہم ترین نیوز چینلز کے نمائندوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی موت کے بعد اس کی پہلی رسمی بات چیت تھی جس میں اس نے کانگو میں ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ماضی میں ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ورلڈ بینک پر کی جانے والی تنقید کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔ اس نے بینک کا دفاع نہیں کیا تھا۔

اس کے ساتھ ایک دن پہلے ہونے والے مذاکرات میں ورلڈ بینک اور امریکی انتظامیہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ نائب صدر کے طور پر ورلڈ بینک کی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے ورلڈ بینک کی صفائی پیش کرے اور وہاں یہ نہ بتائے کہ ورلڈ بینک نے اس کی رپورٹ ابتدائی اسٹیج پر رد کر دی تھی اور اسے استعفیٰ دینے کا کہہ دیا تھا مگر سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی افریقہ میں نافذ العمل کسی بھی پالیسی کے دفاع سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں وہ اس بات پر رضامند ضرور ہو گیا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ کو رد کرنے کے حوالے سے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرائے گا اور صرف یہی کہے گا کہ ورلڈ بینک کی انتظامیہ نے اس کی رپورٹ کے مندرجات کو دیر سے پڑھا اور پھر اس پر ایکشن لیا۔

ورلڈ بینک کی انتظامیہ اس پر نیم دلی سے رضامند ہو گئی لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ کچھ نیوز چینلز نے ورلڈ بینک کے کانگو آفس کے کسی ملازم کے ذریعے ان ای میلز کا ریکارڈ اپنے پروگرامز میں پیش کر دیا جن میں کئی مہینے پہلے ورلڈ بینک نے سالار سکندر کی اس رپورٹ کے حوالے سے اس کے خلاف سخت ایکشن لینے اور تادیبی

کارروائی کی دھمکی دیتے ہوئے اسے استعفیٰ دینے کے لیے کہا تھا۔ یہ ورلڈ بینک کے لیے ایک اور جھٹکا تھا اور سالار سکندر کی ساکھ کو بڑھانے میں معاون ایک اور اہم پیش رفت۔

سالار سکندر کی پریس کانفرنس ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے لیے کھسیاہٹ کا باعث ہونے کے باوجود صرف اس لیے حوصلہ افزا تھی کیونکہ اس میں سالار سکندر نے افریقہ کے بدترین معاشی اور معاشرتی حالات میں ورلڈ بینک سے ہونے والی غلطیوں کے باوجود اس کی وہاں ضرورت اور کردار کی اہمیت پر زور دیا تھا' خاص طور پر دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں۔

اس کی اس پہلی پریس کانفرنس کی اہم باتیں افریقہ کے بڑے بڑے اخبارات نے اگلے دن ہیڈلائنز کے طور پر لگائی تھیں۔ کانگو کے عوام کے لیے سالار سکندر کا چہرہ استحصالی سامراج کا چہرہ نہیں تھا ان کے لیے وہ پیٹرس ایباکا کے ایک قریبی اور قابل اعتماد ساتھی کا چہرہ تھا' جو ان میں سے نہ ہونے کے باوجود ان کے لیے دردر رکھتا تھا۔ اور کیوں رکھتا تھا؟ اس کا جواب اس نے پیٹرس ایباکا کی آخری رسومات میں شریک افریقہ کے لاکھوں عوام کے مجمع کے سامنے پیٹرس ایباکا کی زندگی اور اس کی خدمات کے لیے پیش کیے جانے والے خراج تحسین میں دیا تھا۔

وہ کانگو میں آنے کے بعد' پیٹرس ایباکا کی میت واپس آنے سے پہلے کانگو کے طول و عرض میں ہر اس قبائلی لیڈر سے ملا تھا جو پیٹرس ایباکا کا ساتھی تھا اور جو قبائلیوں میں تھوڑا بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ پیٹرس ایباکا کے خاندان نے اس کی موت کے بعد کسی بھی غیر ملکی ادارے یا حکومت کے نمائندوں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن سالار سکندر کی ملاقات کی درخواست کو انہوں نے رد نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے بے حد خوش دلی اور احسان مندی سے ملے تھے۔ سالار سکندر نے پیٹرس ایباکا کی آخری ای میل انہیں دی تھی جو اس نے سالار کو کی تھی۔ اس ای میل کا پرنٹ آؤٹ اگلے دن بڑے بڑے مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

افریقہ اب پیٹرس ایباکا کے جسد خاکی کے استقبال اور اس کی تدفین کی تیاریاں کر رہا تھا اور سالار سکندر صرف ایک کوشش کہ وہاں متوقع لاکھوں کا مجمع ایک بار پھر سے اس طرح مشتعل ہو کر غیر ملکی سفارت خانوں اور اداروں اور غیر ملکیوں پر حملہ نہ کر دے۔

امریکی حکومت ابتدائی طور پر اس کی میت کو واپس بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ امریکی شہریت بھی رکھتا تھا اور وہ اس کی میت کی "قانونا" مقامی طور پر تدفین کر سکتے تھے کیونکہ انہیں یہی خدشہ تھا کہ پیٹرس کی تدفین کے لیے اکٹھا ہونے والا مجمع ایک بار پھر سے کانگو میں قتل و غارت کا بازار گرم کر سکتا تھا۔ کانگو کی حکومت بھی مقامی دباؤ کے باوجود ایباکا کی میت واپس لینے سے انکاری تھی مگر یہ سالار سکندر کے ساتھ ملاقات میں ایباکا کی فیملی کا دباؤ اور اصرار تھا کہ وہ ایباکا کی میت کی واپسی ممکن بنائے اور وہ اس بات کی گارنٹی دینے پر تیار تھے کہ ایباکا کی تدفین پرامن ہوگی۔

سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے ذریعے امریکی حکومت کو یہ بات باور کرائی تھی کہ ایباکا کی لاش کی باعزت واپسی کانگو اور افریقی عوام کے دلوں میں اس غصے کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو اس کے مردہ جسم کو امریکہ زبردستی وہیں رکھ کر بڑھا رہا تھا۔ امریکی حکومت' اس کے کانگو واپسی کے دو ہفتے بعد ایباکا کی میت واپس بھیجنے پر تیار ہو گئی تھی۔

کانگو کی حکومت نے غیر ملکی حکومتوں کے ان نمائندوں سے جو تدفین میں شریک ہونا چاہتے تھے معذرت کر لی تھی کہ وہ ایباکا کی تدفین میں شریک ہونے والے لاکھوں افراد کے متوقع ہجوم میں نہ تو انہیں تحفظ فراہم کر سکتے ہیں نہ ان کی حفاظت کی ضمانت۔ ورلڈ بینک کی انتظامیہ اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے سالار سکندر کو بھی ایباکا کی آخری رسومات میں شریک ہونے سے روکا تھا جس کے لیے اسے ایباکا کی فیملی نے مدعو کیا تھا اور سالار نے اس دعوت

نامے کو قبول کر لیا تھا۔
امامہ بھی اس کے اس فیصلے سے ناخوش اور خوف زدہ تھی اور اس نے اسے سمجھانے اور روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت تک یہ کوشش کرتی رہی تھی جب تک ایباکا کی لاش کنشاسا پہنچ گئی اور اسی شام اس کی تدفین کے انتظامات ہو رہے تھے۔
سالار سکندر اس کی اس منت سماجت کے دوران ائیرپورٹ جانے سے پہلے دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ بے بسی سے بچوں کو لیے بیٹھ گئی تھی۔
"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم بچوں کو لے کر فوری طور پر پاکستان چلی جانا۔ اس انتظار میں مت بیٹھی رہنا کہ میری ڈیڈ باڈی مل جائے۔"
اس نے نفل پڑھنے کے بعد پہلا جملہ اس سے یہی کہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں تھا۔ بچے سویٹ کے دوسرے کمرے میں تھے اور امامہ ان کے پاس سے اٹھ کر اسے سمجھانے آئی تھی اور اس کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھی تھی اور اس نے جاء نماز تہہ کرتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کہا تھا۔
امامہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ "تم بہت بے رحم ہو" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سالار سے کہا۔
"تم سے کم۔" سالار نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
پھر وہ دوسرے کمرے میں اپنے بچوں سے ملنے آیا تھا۔ جبریل باپ کے ساتھ ہی دروازے تک چلا آیا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ کو خدا حافظ کہا تو اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"تم واپس آجاؤ گے نا؟" وہ برستی آنکھوں سے منت بھرے انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا۔ یا شاید رک ہی جائے۔
اس نے امامہ سے نظریں ملائے بغیر اپنے بازو سے اس کا ہاتھ اٹھا کر اسے نرمی سے چوما اور کہا "ان شاء اللہ" پھر جھک کر اپنی ٹانگ سے چپکے جبریل کو اٹھاتے ہوئے اس کا منہ چوما اور کہا "اپنی ممی اور بہن بھائی کا خیال رکھنا۔"
" I Always do baba " جبریل نے اسے یقین دلایا۔
(بابا! میں ہمیشہ رکھتا ہی ہوں۔)
سالار نے ایک بار پھر اس کا منہ چوما اور اسے کہا۔ "آئی پراؤڈ آف یو۔"
سالار نے اسے گود سے اتار دیا اور سب کو خدا حافظ کہا۔ دروازے میں برستی آنکھوں کے ساتھ کھڑی امامہ کو دیکھے بغیر۔



لاکھوں لوگوں کے ہجوم کے ساتھ سالار سکندر نے ائیرپورٹ پر ایباکا کی میت کو وصول کیا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں سالار سکندر کے علاوہ ایک بھی سفید فام نہیں تھا یہاں تک کہ اس دن کانگو میں اس ایونٹ کو کور کرنے والے نیوز چینلز کا سارا عملہ بھی مقامی تھا۔ کوئی ہتھیاروں سے مسلح اس قبائلی ہجوم میں جانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا جن کو جان لینے اور جان دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ جو وحشی اور اجڈ تھے اور اپنی بقا کے لیے ہر اس چیز کو خس و خاشاک بنا دینے پر تیار جوان کے راستے میں دیوار بنتی۔
اور لاکھوں سیاہ فام لوگوں کے ہجوم میں ایک صاف رنگت والا سفید فام تھا جو نسلی طور پر سفید فام نہ ہونے کے

باوجود اپنی صاف رنگت اور ان لوگوں کی سیاہ ترین رنگت کے مقابلے میں 'سفید فام' لگ رہا تھا۔ وہ وہاں نہتا تھا۔ کانگو کی حکومت نے اسے کچھ سیکیورٹی دی تھی مگر اس سیکیورٹی کو ان قبائلیوں نے رد کردیا تھا جو اس سارے ایونٹ کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے۔ اور سالار سکندر تن تنہا اسی دلیری سے اپنے ساتھ ایک بھی گارڈ لیے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

دنیا میں کروڑوں TV اسکرینز پر لائیو نشر ہونے والا وہ ایونٹ لاکھوں کے اس ہجوم میں صرف ایک شخص کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ اور بار بار۔ تیکھے نقوش والا وہ دراز قامت شخص ایباکا کی آخری رسومات کے موقع پر اسٹیج پر اس کے خاندان کے ساتھ اس مجمع کے سامنے بیٹھا تھا جس میں سے کوئی بھی اس پر گولی چلاتا تو یہ بھی پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کون تھا؟

اور اگر وہ مجمع اس پر چڑھ دوڑتا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھا جو اس مجمع کے ہاتھوں اس کی بوٹیوں کے بھی ٹکڑے ہونے سے روک سکتا۔ اور یہ احساس سالار سکندر کو اس اسٹیج پر ان لاکھوں لوگوں کے سامنے بیٹھے پر ہو رہا تھا۔ جو ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کی جانے والی قبائلی سرداروں کی جوشیلی تقریروں میں اس سامراج کی تباہی کے لیے نعرے بلند کررہے تھے جس کا ساتھی بن کر وہ وہاں بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل پر لاکھوں لوگوں کی ہیبت طاری ہو رہی تھی اور اس کی زبان پر قرآنی آیات کا ورد تھا۔

یہ احساس ہونے کے باوجود کہ اللہ اس سے خفا تھا' وہ اللہ ہی کو پکار رہا تھا۔

امریکہ میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر اور ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں اسکرین پر نظر آنے والا وہ شخص ان سب کو اپنی ہیبت میں لے رہا تھا جن کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا۔ دلیری ہو تو ایسی ہو۔ جرات ہو تو یہ۔

وہ گنگ تھے، دم بخود تھے۔ اور مرعوب۔

وہ شخص اب پیٹرس ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنی نشست سے اپنا نام پکارے جانے پر اٹھ رہا تھا۔ لاکھوں کا مجمع اس کے لیے جواباً "تالیاں" بجا کر داد تحسین دے رہا تھا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ تیکھے نقوش اور سنجیدہ چہرہ۔ سیاہ ٹو پیس سوٹ میں وہ وجاہت اور وقار کی ایک خوب صورت مثال تھا۔ جو اس وقت پوری دنیا کے کیمروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس اسٹیج کے بالکل اوپر کافی بلندی پر ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر میں سی آئی اے کے کچھ کمانڈوز۔ اس مجمع کو ٹی وی اسکوپس سے مانیٹر رہے تھے۔ چند اور بلیک ہاکس آس پاس کی عمارتوں کو۔ وہ سالار سکندر کی حفاظت اور زندگی کے لیے اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

سالار سکندر روسٹرم کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اب بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بعد قرآنی آیات کی تلاوت کررہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سدرہ حیات



"اگر آپ چاہتے ہیں اپنے کسی عزیز کی شادی لائیو دیکھنا تو ہمیں بھیجیں ان کے ملن کی کہانی۔ جس کی کہانی میں ہوگا دم وہی بنے گا کپل آف دی ویک۔" میں نے بے زاری سے مارننگ شو کی ہوسٹ کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھا۔ جو یقیناً" اپنے (شوقین مزاج) دیکھنے والوں کو آنے والے ہفتے میں کسی شادی کی خوش خبری دے رہی تھی۔

آج کل چھٹیوں کے باعث میں صبح ناشتے کے ساتھ سارے "مارننگ شو" سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پچھلے دن ایک چینل کی مارننگ شو کی میزبان، لوگوں کے رشتے طے کروا رہی تھی یعنی پس منظر میں "شادی ویک" کی آمد کی جھلک دکھا کر دیکھنے والوں کو خوش کرنا چاہ رہی تھی۔ آج دوسری ہوسٹ بھی دو گھنٹے یہی اعلان کرتی رہی، تیسرے چینل پر موجود محترمہ جادوئی دنیا کے سفر پر نکلی ہوئی تھیں اور جادو ٹونے کے اثرات پر سیر حاصل بحث فرما رہی تھیں۔ لوگوں کی دکھ بھری داستان سن کر ان کی آنکھوں کے گوشے دو گھنٹوں میں پچاس مرتبہ بھیگے۔ ہلکی گانے کی دھن میں ایک خواب ناک ماحول بنائے دو گھنٹے تک وہ لوگوں کی خدمت میں جتی رہیں۔

روز صبح نئے منظر اور موضوع کے ساتھ موجود ہونا یقیناً" قومی خدمت کے زمرے میں آتا ہے۔ چند دنوں تک ان صاحبہ کے چینل پر بھی "شادی ویک" کی آمد کا اعلان کر دیا جائے گا اور پھر یہ تمام دکھ بھری داستانوں کو بھلا کر ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتی نظر آئیں گی۔

میں نے بے دلی سے ریموٹ ٹی وی پر رکھا۔ اب مجھے امی حضور کے سامنے حاضری دینی تھی تاکہ اپنے معمول کے کام نمٹا سکوں۔



"آج مایوں کا دن ہے... مایوں کی رسم بھی ادا ہوگی اور خوب ہلہ گلہ بھی... آپ نے رہنا ہے ہمارے ساتھ تاکہ ہم ان کی شادی کو بنا سکیں یادگار۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے حسرت سے دلہن بنی

ہوسٹ کے خوب صورت اور اسٹائلش جوڑے کو تاڑا۔

شادی چاہے کسی کی بھی ہو، پر محفل کی جان بنی ہوسٹ پورے سیٹ پر اچھلتی کودتی پھر رہی تھی۔ ساتھ میں ایک معروف ایکٹر کو لگایا ہوا تھا جس سے بارہا بھنگڑے کی فرمائش کی گئی وہ تو جیسے انتظار میں تھا یا اپنی بوریت کم کرنے کے لیے ہی شادی میں شریک ہوا تھا۔ فوراً" رقص میں گم ہو جاتا۔

گانے والوں کی تو ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں، لہٰذا دو گلوکار بھی اس شادی میں پیش پیش نظر آ رہے تھے "بلے بلے" پر بھنگڑا ڈالا جا رہا تھا جب امی حضور صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے فوراً" آواز ہلکی کر دی تاکہ والدہ صاحبہ کا فشار خون بلند نہ ہونے پائے۔ آخر حفاظتی اقدامات بھی تو ضروری تھے۔

"صنعیہ کا فون تھا... پریشان لگ رہی تھی۔"

"خیر تو ہے امی... خالو کی طبیعت تو نہیں خراب ہو



گئی۔"

"نہیں، نعیم تو اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہے.... صفیہ بیین کی طرف سے کچھ پریشان ہے۔ اس کے رشتے کی بات کہیں بن نہیں رہی.... دو مہینے پہلے اس کی منگنی ٹوٹی تھی۔ اب کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا۔"

"امی اچھا ہی ہوا جو منگنی ٹوٹ گئی، وہ لوگ خاصے لالچی تھے۔" میں نے کن انکھیوں سے ٹی وی کی طرف دیکھا جہاں اب مایوں کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

"ہوں.... میں نے تو پہلے ہی منع کیا تھا وہاں رشتہ نہ کرے مگر سنتی کہاں ہے۔" صوفے سے اٹھتے ہوئے امی کی نظر ٹی وی پر پڑی۔

"ہائے.... اس لڑکی کی اب شادی ہو رہی ہے؟"

امی کی نظریں دھوکا کھا چکی تھیں۔
"نہیں امی یہ تو شادی کروا رہی ہے۔ جو لڑکی اس کے ساتھ بیٹھی ہے اس کی شادی ہے۔"
"پھر یہ نگوڑی کیوں اتنی تیار پھر رہی ہے دلہن سے زیادہ تو اس نے پھولوں کا زیور پہن رکھا ہے۔" امی کے جملے پر میں نے بمشکل اپنی ہنسی کو مسکراہٹ میں تبدیل کیا۔

☆ ☆ ☆

"بس آپا کیا بتاؤں سیمن کے رشتے کی طرف سے اس قدر پریشانی ہے۔۔۔ بے شمار رشتے کرانے والیوں کو کہا مگر کہیں بات بنتی نظر نہیں آتی۔" صفیہ خالہ اپنی پریشانی امی کے گوش گزار کرنے آج خود موجود تھیں۔
"اللہ خیر کرے گا ہماری سیمن لاکھوں میں ایک ہے۔ اچھا ہی سبب بنے گا تم بس اللہ سے امید رکھو۔ دعا کرو بچی کا نصیب اچھا ہو۔" امی نے چائے کی پیالی صفیہ خالہ کو پکڑائی۔
"آپا میں تو اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں مگر نعیم صاحب کو تو کوئی فکر ہی نہیں۔"
"نیک بخت اسے بھی فکر ہو گی' سیمن اس کی بیٹی ہے۔ مردوں کے لیے باہر کے بکھیڑے کم ہوتے ہیں جو اندرونی فکروں کو ہر وقت سر پر سوار رکھیں۔"
"یہ کس کی شادی ہو رہی ہے؟" صفیہ خالہ کی نظر ٹی وی پر پڑی جہاں بھرپور انداز میں ڈھولکی کا فنکشن منایا جا رہا تھا۔
"خالہ ٹی وی پر آج کل شادیاں کرنے کا رواج ہے بلکہ ایک چینل کی ہوسٹ تو رشتے بھی طے کراتی ہے۔" خالہ دلچسپی سے ہوسٹ کو دیکھ رہی تھیں جو گہرے میرون کلیوں والی فراک میں خود بھی خوب صورت دلہن ہی لگ رہی تھی۔ شان بے نیازی سے دوپٹے کے پلو کو گھماتی' اپنے مہمانوں کو ان کی آمد کا اصل مقصد یاد کرا رہی تھی۔ جی ہاں انہیں بھنگڑے کی دعوت دے رہی تھی۔
مہمان حضرات اپنے آنے کا حق ادا کرتے ہوئے مکمل طور پر رقص میں کھو چکے تھے۔ "میں نچاں ساری رات" گلوکار کی آواز میں سرشاری جھلک رہی تھی (آخر لائیو پرفارمنس تھی)۔
"خالہ مارننگ شو پر ہی سیمن کی شادی کیجیے گا۔۔۔ خرچا بچتا ہے۔"
"فرح! جاؤ جا کے باورچی خانہ سنبھالو ہر وقت اس موئے ٹی وی سے چپکی رہتی ہو۔" امی حضور کو اپنی موجودگی میں میری جرات ناگوار گزری (جو کہ ان کی جھاڑ سے صاف ظاہر تھا) حالانکہ میرا مذاق نہایت بے ضرر تھا۔ امی حضور کی خفگی کے باعث میں نے اپنے مچلتے دل کو دلہن کا جوڑا دیکھنے سے روکا اور باورچی خانے کا رخ کیا کیوں کہ عزت اسی میں تھی۔

☆ ☆ ☆

"833 پر میسج کیجیے اور بتایئے' ہمارے شادی ویک کی سب سے منفرد چیز کیا ہے جو آپ کے خیال میں ہر شادی میں ہونی چاہیے۔" میں نے ناشتے کی ٹرے اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہوسٹ کی بھرپور تیاری پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی۔
آج بھی ہوسٹ کی سج دھج نرالی تھی۔ فیشن کے مطابق پنک اور بلیک رنگ کے جوڑے میں ملبوس وہ اپنے آپ کو یقیناً "حسین ترین لڑکی محسوس کر رہی تھی۔ چہرے پہ پھیلی لالی (جو حیا کے باعث قطعاً "نہیں تھی یہ میک اپ آرٹسٹ کے جوہر تھے) اسے دل آویز بنا رہی تھی۔
"آج ولیمہ کا دن ہے۔۔۔ اسی کی مناسبت سے ہمارے سیٹ کو خوب صورتی سے سجایا گیا ہے۔" ہوسٹ نے ایک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکا دے کر اپنی کاجل سے بھری آنکھوں کو سیٹ کی آرائش پر مرکوز کرتے ہوئے تعریفی انداز اختیار کیا۔
اس کے تعریفی پروگرام کو لمبا ہوتے دیکھ کر میں نے بور ہو کر چینل تبدیل کیا۔ آخر رشتے کن لوگوں کے مابین طے کیے گئے ہیں یہ بھی تو دیکھنا تھا۔ میری بھرپور نظر حالات حاضرہ پر تھی۔

"آپ اپنی بیوی میں کون سی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں؟" ہوسٹ نے اپنے دائیں طرف بیٹھے موصوف سے دریافت کیا۔

"زیادہ نہیں بس خوب صورت ہو' ذہین ہو' کھانا اچھا بنا لیتی ہو' بن سنور کر رہے اور باتونی نہ ہو۔" موصوف نے گویا کسی جنت سے اتری حور کا نقشہ کھینچا۔

"آپ کے لیے تو پھر تین لڑکیاں ڈھونڈنی پڑیں گی کیونکہ ایک میں تو یہ تمام خوبیاں یکجا ہونے سے رہیں۔" ہوسٹ نے اپنے خوب صورت بالوں میں ہاتھ پھیرا اور دوسرے موصوف کی طرف متوجہ ہوئی جو مسلسل مسکرانے کی مشق کر رہے تھے۔

"جی تو آپ کون سی خوبیاں دیکھنا پسند کریں گے اپنی بیوی میں؟"

"آپ کی طرح خوب صورت ہو۔" ان موصوف کی جرات (جو خالصتاً" چھچھورپن کے زمرے میں آتی تھی) پر ایک ادا سے مسکرا کر بالوں کو سیٹ کیا۔

"آپ کے لیے لڑکی تلاش کرنا خاصا مشکل ہو گا۔ اب ہم اپنے اگلے مہمان سے پوچھتے ہیں.... ان کو کیسی لڑکی درکار ہے۔" ہوسٹ نے تیسرے موصوف کی طرف دیکھا جو بلاوجہ شرمائے جا رہے تھے۔

"جی بس لڑکی ہونی چاہیے۔"

"ظاہر ہے لڑکی ہی تلاش کر رہے ہیں اب لڑکا تو تلاش کرنے سے رہے.... چلیں آپ کے لیے لڑکی تلاش کرنا آسان رہے گا۔"

"اب ہم اپنے آخری مہمان سے پوچھتے ہیں کہ ان کے اپنی بیوی کے متعلق کیا مطالبات ہیں۔" ہوسٹ آخر میں بیٹھے موصوف کی طرف متوجہ ہوئی جو خاصے سنجیدہ اور دانش مند معلوم ہو رہے تھے۔

"لڑکی نہایت تہذیب یافتہ' کم پڑھی لکھی' گھر کے کاموں میں ماہر ہو' جاب نہ کرتی ہو اور ایسی ہو جو میری ماں کو خوش رکھے ان کی خدمت کرے۔" موصوف نے بول کر دانش مندی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

ہوسٹ اس دیدہ دلیری پر خاصی تپی تھی۔ اس کا سرخ چہرہ اس کے غصے کی چغلی کھا رہا تھا۔

"ہم اپنے شو میں رشتے طے کراتے ہیں' کوئی خدمت گزار ماسی نہیں تلاش کرتے۔" دو منٹ ہوسٹ نے اپنی پھولی سانسوں کو معمول پر لانے میں لگائے۔

"خیر! ہم نے آپ کے مطالبات نوٹ کر لیے ہیں۔ آپ کے لیے ایسی ہی کوئی معصوم و مظلوم لڑکی ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے جو باورچن بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتی ہو۔" ہوسٹ نے بمشکل اپنے آپ کو مائی کہنے سے روکا۔

"اب میں دعوت دیتی ہوں ایک لڑکی اور اس کی والدہ کو تاکہ آپس میں کچھ بات چیت کریں اور سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکے۔" ہوسٹ آنے والے مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑی ہو چکی تھی۔

ایک خاتون اور لڑکی بائیں طرف سے آتی نظر آئیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں پلک جھپکنا بھول گئی اور ساکت نظروں سے کتنی ہی دیر ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی' جہاں دونوں مہمان' ہوسٹ سے مل کر اب کرسیاں سنبھال چکی تھیں۔

"صفیہ خالہ اور بیین!" میں نے اچھی طرح اپنی آنکھوں کو صاف کیا مگر منظر تبدیل نہ ہو سکا۔ یہی وقت امی حضور کی انٹری کے لیے مناسب تھا۔

"امی.... امی جلدی آئیے۔" امی حضور میری چیخ و پکار سن کر باورچی خانے کے کام جوں کے توں چھوڑ کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"کیا آفت آپڑی ہے.... کہیں اس موئی ہوسٹ نے اپنی شادی کا اعلان تو نہیں کر دیا۔" امی حضور کی فکریں بھی نرالی تھیں۔

"امی صفیہ خالہ اور بیین۔" میں نے امی حضور کو ٹی وی کی جانب متوجہ کیا۔

"آنٹی کون سا لڑکا آپ کو اپنی بیٹی کے لیے بھایا

ہے۔" ہوسٹ، صفیہ خالہ کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ان کی رائے معلوم کر رہی تھی۔
صفیہ خالہ تیسرے نمبر پر بیٹھے شرماتے لجاتے موصوف کی طرف متوجہ تھیں۔ جس کے باعث وہ کچھ اور بچھے جا رہے تھے۔
"ہائے۔۔۔ صفیہ کا دماغ چل گیا ہے۔ جو اس معصوم کو ساتھ لگائے ٹی وی پر آ گئی۔۔۔ خاندان کی عزت کا ذرا پاس نہ کیا۔"
"امی اس معصوم سیین کو بھی تو دیکھیں کیسے شرمائے جا رہی ہے۔۔۔ چور نظروں سے دولہا بھائی کو بھی تاڑے جا رہی ہے۔ آپ مجھے اس کی مثالیں دے کر شرمندہ کیا کرتی تھیں۔" میں نے بروقت اپنے نمبر بنائے۔
"نعیم اور صفیہ کی تو میں خبر لوں گی۔" امی حضور اپنے جلالی موڈ میں آ چکی تھیں۔
اور میں سوچ رہی تھی اب یقیناً" اگلے ہفتے "شادی ویک" میں سیین ہی دلہن ہو گی۔
واہ بھئی کچھ ہو یا نہ ہو صفیہ خالہ کا خرچا ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس منہگائی کے دور میں شادی کا خرچا اٹھانے سے بڑی خدمت شاید ہی کوئی ہو اور یہ خدمت "مارننگ شوز" والے بخوبی انجام دیتے رہتے ہیں۔



"آج سے ہمارے شو میں شادی ویک کا آغاز ہو رہا ہے۔" جیسا کہ آپ جانتے ہیں فہد اور سیین کا رشتہ طے پا گیا اور ان دونوں کو شادی کے خوب صورت بندھن میں باندھنے کے لیے ہم نے یہ محفل سجائی ہے۔" میں نے دلچسپی سے ہوسٹ کو دیکھا جو شرارا پہنے ہوئے تھی۔ بالوں کو اسٹائل سے ایک کندھے پر سیٹ کیا گیا تھا اور خوب صورتی سے کیے گئے میک اپ نے اسے حسین ترین روپ دیا تھا۔ یا پھر آج سے پہلے مجھے وہ اتنے حسین کبھی نہیں لگی تھی۔ میں نے پورے ذوق و شوق سے اس کی پوری تقریر سنی۔ ہوسٹ کے پرانے جملے بھی آج نئے معلوم ہو رہے تھے۔
"یقیناً" آپ جاننا چاہ رہے ہوں گے یہ پیاری سی، چھوٹی سی لڑکی جو میرے ساتھ کھڑی ہے یہ کون ہے یہ فرح احمد ہیں ہماری دلہن کی کزن۔" ہوسٹ نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔
میں نے ہوسٹ کی تعریف پر اپنے خوب صورت شرارے کو دیکھا جس پر نفیس کام کیا گیا تھا اور اپنی تیاری پر مطمئن ہو کر ہوسٹ کو دیکھا۔ میری تیاری بھی کسی طرح کم نہ تھی۔
"فرح کیسا لگ رہا ہے لائیو شو میں آپ کی کزن کی شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔"
"بہت اچھا لگ رہا ہے۔۔۔ میرے لیے تو یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔" خوشی با آسانی میرے انداز سے محسوس کی جا سکتی تھی۔
"ابھی ہم نے مل کر بہت سی رسمیں ادا کرنی ہیں۔۔۔ اور فرح ہمارے ساتھ شریک ہوں گی۔" ہوسٹ نے میرے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے پیار سے اپنے ساتھ لگایا۔
"پھر ہی اس پیاری سی لڑکی کو یقین آئے گا کہ یہ ٹی وی پر ہونے والی ایک لائیو شادی کا حصہ ہیں۔"
فجر کی اذان کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے حیرت سے اپنے کمرے کو دیکھا تب سمجھ میں آیا کہ میں کسی مارننگ شو کے سیٹ پر نہیں بلکہ اپنے کمرے میں موجود ہوں۔ امی حضور کو میرے اس خواب کی بھنک بھی پڑ جاتی تو میری شامت آنا یقینی تھی۔ اس تصور کے آتے ہی میں لاحول پڑھتی ہوئی بستر سے اٹھی اور وضو کرنے کی غرض سے غسل خانے کا رخ کیا۔
"بس کر لی اپنی سی۔۔۔ دیکھ لیا اپنے عقل مندانہ فیصلے کا انجام۔" میں نے چائے اور لوازمات کی ٹرے میز پر رکھی جس کے قریب صفیہ خالہ بیٹھی تھیں۔ شدت گریہ سے چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں جن کو وہ اپنی چادر سے پونچھ رہی تھیں۔ مگر آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

ان کے بائیں طرف نعیم خالو سر جھکائے بیٹھے تھے اور دائیں طرف امی حضور اپنے جلالی موڈ میں بیٹھی تھیں اور مسلسل اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

"مجھ سے مشورہ نہیں کرنا تھا تو کم از کم نعیم سے ہی کر لیتیں۔ باپ ہے یہ بیین کا کوئی غیر نہیں ہے۔۔۔ اپنی اور خاندان کی عزت کا بھی پاس نہ کیا۔"

"پھل بھی تو پا لیا آپا۔" صفیہ خالہ نے آدھے گھنٹے میں پہلی مرتبہ سر اٹھایا اور اپنا جرم تسلیم کیا۔ آنسو اسی رفتار سے ان کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ خالو ویسے ہی افسردگی سے بیٹھے فرش کو تک رہے تھے۔ میں نے ہمدردی سے دونوں کو دیکھا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ یہ شریفوں کے طور طریقے نہیں ہیں کہ ٹی وی پر بچیوں کو لے جا کر رشتے تلاش کرتے پھریں۔۔۔ نعیم اور صداقت صاحب نہ پڑتے اس سارے معاملے میں تو تم نے تو بی بی بچی کا ہاتھ ان فراڈی لوگوں کے ہاتھ میں تھما دینا تھا۔۔۔ سر پکڑ کر روتیں ساری عمر۔ اماں کی روح قبر میں تڑپ گئی ہو گی تمہارا یہ کارنامہ دیکھ کر۔" امی حضور کا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"بس بھی کریں اب۔۔۔ صفیہ بہن پہلے ہی اتنی افسردہ ہیں اور آپ بہن کو اور شرمندہ کیے جا رہی ہیں۔" ابا کپڑے تبدیل کر کے آ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے لوٹے تھے۔

ابا کو دیکھ کر میں نے پکوڑے کو منہ تک لے جانے کا ارادہ ترک کیا اور شرافت سے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

اب اچھا تو نہیں لگتا امی حضور' خالہ کی عزت افزائی کر رہی ہوں اور میں کھانے میں مصروف ہوں۔ آدھی پلیٹ خالی کرنے کے بعد مجھے یہ خیال آیا تھا۔ ابا کے اشارے پر میں ان کے لیے چائے نکالنے لگی تھی۔ ابا اپنی کرسی سنبھال چکے تھے۔

"شرمندہ تو بی بی تم نے ہم سب کو کیا ہے۔۔۔ فون پر فون آ رہے ہیں رشتہ داروں کے۔ ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ ایسی بھی کیا آفت آ گئی تھی جو بچی کو لے کر ٹی وی پر ہی آ گئی وہ بھی رشتے کی غرض سے۔ بندہ پوچھے اس موئے ٹی وی کے اور کام کیا کم تھے جواب ذاتی مسائل بھی یہ حل کرے گا۔" امی حضور کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کے انداز پر میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"معاف کر دیں آپا غلطی ہو گئی۔۔۔ میری کم عقلی کی وجہ سے ہوا ہے یہ سب۔" صفیہ خالہ کو بھی شاید اپنی بھیگتی ہوئی چادر کا احساس ہو گیا تھا اس لیے آنسوؤں کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔

"میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں اس بات کا احساس ہو شادی بیاہ کے معاملات بڑے حساس ہوتے ہیں جلد بازی میں اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ ٹی وی والوں کے لیے یہ محض ایک تفریح کا ذریعہ ہو سکتا ہے مگر ہمارے لیے یہ کوئی چھوٹی بات

نہیں ہے۔" یہ ہماری اقدار نہیں ہیں کہ یوں بچیوں کا تماشہ بنوائیں۔۔۔ دوسری بات تمہیں نعیم کو بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ اس کا بھی پورا حق ہے کہ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرو اور اس کی رضا سے ہی فیصلہ کرو۔" امی حضور نے نرم لہجے میں اپنا موقف سمجھایا تھا۔ میں نے بھی امی حضور کی بات سمجھتے ہوئے ایک پکوڑا منہ میں ڈالا۔

"شکر ہے آپا اس بات کا ذکر بھی آپ نے کر دیا۔۔۔ آخری بات ہماری بیگم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔" خالو نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔

"فکر نہ کرو نعیم، یہ باتیں اب وقفے وقفے سے صفیہ بہن کو سننے کو ملیں گی۔" ابا نے ماحول کی خوشگواریت برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

"بھائی جان اچھی بات روز بھی سننے کو ملے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" صفیہ خالہ کی بات پر امی حضور کے چہرے پر بھی دھیمی مسکراہٹ آگئی۔ گویا کہہ رہی ہوں "دیر آید درست آید۔"

"بیٹا جی کیا سارے پکوڑے خود ہی کھانے کا ارادہ ہے۔" ابا نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ پکوڑا میرے حلق میں ہی اٹک گیا۔ میں نے بوکھلا کر پلیٹ کی طرف دیکھا جہاں صرف ایک پکوڑا رہ گیا تھا۔

"جی وہ۔۔۔ میں لاتی ہوں ابا۔" میں نے پھرتی سے پلیٹ اٹھائی اور باورچی خانے کا رخ کیا اگر میں یہ پھرتی نہ دکھاتی تو امی حضور کے متوجہ ہونے کا خطرہ تھا۔ ابا کی آواز باورچی خانے میں با آسانی آرہی تھی۔ میں نے پکوڑوں کا آمیزہ بناتے ہوئے کان ابا کی آواز پر لگا دیے۔

"میرے دوست ہیں خلیل فاروق، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے فرح کا رشتہ مانگا تھا مگر چونکہ فرح ابھی زیر تعلیم ہے اور ہم دونوں میاں بیوی اس کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ایسا کوئی سلسلہ شروع نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ میں نے ان سے سبین کے لیے بات کی ہے وہ آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔" میں نے پکوڑے فرائی کرتے ہوئے پوری بات سنی۔

"شکریہ بھائی صاحب آپ نے سبین کے لیے سوچا۔" نعیم خالو کی دھیمی آواز سنائی دی۔

"فرح کی طرح سبین بھی میری بیٹی ہے۔۔۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سارے در تو اللہ ہی کھولتا ہے انسان کا اس میں کیا عمل دخل۔" ابا کی بات سے مجھے بھی اتفاق تھا۔ واقعی ہر کام اللہ کی مدد سے ہو جاتا ہے کوشش رائیگاں نہیں جاتی، بس سب چیزیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں۔

ایک طویل عرصے سے خالہ کوششوں میں تھیں آخرکار اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی میں نے جلدی سے پکوڑے پلیٹ میں نکالے اور لاؤنج کا رخ کیا، جہاں ابا اپنے دوست کے بیٹے کے بارے میں تفصیلات بتا رہے تھے اور صفیہ خالہ پوری توجہ سے سننے میں مگن تھیں۔



"شادیوں کا سلسلہ جاری و ساری ہے اس سیزن آئے گی رنگوں اور روشنیوں کی بہار۔" ٹی وی پر آتے مارننگ شو کی جھلکی کو دیکھ کر میرے ذہن میں اپنا خواب تازہ ہو گیا۔ امی حضور کی آواز پر میں حقیقت کی دنیا میں واپس آئی اور لاحول پڑھتی ہوئی چل پڑی۔

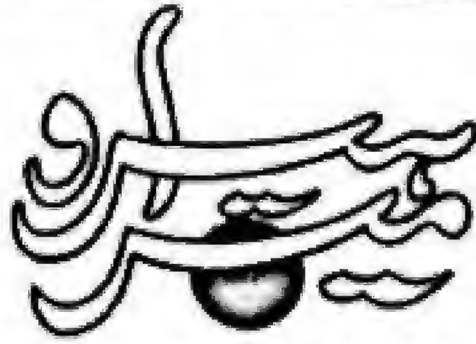
ابا کے سامنے پکوڑے رکھتے ہوئے میں نے سوچا واقعی کچھ چیزیں خوابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں حقیقت کی دنیا کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ میری نظر ٹی وی پر ٹھہری جہاں شو کی ہوسٹ عورتوں کے مسائل حل کرنے کا عزم لیے اپنی باتوں کا جادو جگا رہی تھی کیوں کہ وہ محض تفریح کا سامان کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اس کا مقصد لوگوں کو اپنا پروگرام دیکھنے پر مجبور کرنا تھا۔

میرے خیال میں لوگوں کو بھی صرف انجوائے ہی کرنا چاہیے اپنی زندگیوں میں لاگو نہیں کرنا چاہیے ورنہ صفیہ خالہ والا انجام ہو گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے خالہ کو دیکھا خوشی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

آخر ان کو گوہر مقصود مل ہی گیا تھا۔

☆

بدیع الجمال

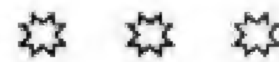


"ہمارے سفیان بھائی پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہیں۔۔۔ ان سے بہتر تو کیچڑ میں رینگنے والا کیچوا ہے۔ اس میں ہڈی نہیں ہوتی لیکن تکلیف پہنچنے پہ تو وہ بھی سر اٹھاتا ہے۔ لیکن سفیان بھائی۔۔۔ اف پرلے درجے کے بزدل انسان۔" صحن میں رکھی چارپائی پہ بیٹھ کر پیروں کے ناخن کاٹتے ہوئے زوبیہ نے اپنی بہن کو سنایا۔

"وہ کہتے ہیں کہ لڑائی جھگڑا کرنا شریفوں کا کام نہیں ہے۔" پائنتی بیٹھی درخشاں نے کمزور سی آواز میں اپنے میاں کا دفاع کیا۔

"ہنہ۔" زوبیہ نے سر جھٹکا۔ "لڑائی جھگڑا کرنا شریفوں کا کام نہیں۔ لیکن کوئی آپ کو یا آپ کی بیوی کو کچھ کہے اور آپ چپ چاپ کھڑے تماشا دیکھتے رہیں۔ یہ ضرور بزدلوں اور بے غیرتوں کا کام ہے۔۔۔ پتا نہیں تم کیسے ایسے آدمی کے ساتھ گزارا کر رہی ہو۔۔۔ بالکل مٹی کا مادھو۔ میں تو کبھی ایسے آدمی کو منہ بھی نہ لگاؤں۔ ایک بہنوئی کے روپ میں مل گیا ہے۔ اسے جھیل رہی ہوں، یہی بڑی بات ہے۔"

زوبیہ نے بات مکمل کر کے جھرجھری لی۔ درخشاں خاموش رہی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ اپنے شوہر کی کم ہمتی سے وہ خود بھی نالاں تھی۔



اسے شاعری سے خاصا شغف تھا اور وہ خود بھی تھوڑی بہت تک بندی کر لیتی تھی۔ اپنے شوق کی تسکین کے لیے اس نے ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ جس میں وہ اپنے ذہن میں آئے اشعار لکھتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کالج کی کینٹین میں ایک میز پہ بیٹھی اپنے ذہن میں آئے چند اشعار اس ڈائری میں درج کر رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں سائرہ اور غزالہ وہیں پہ بیٹھی تھیں۔

"یار! نو ڈاؤٹ۔ تمہارا فیانسی بہت ہینڈسم ہے۔ پرفیکٹ کپل لگ رہے ہو تم دونوں۔" غزالہ نے سائرہ سے کہا۔ اس کے ہاتھ میں سائرہ کی منگنی کی تصاویر تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے غزالہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔

"زوبیہ! تم نے یہ تصویر دیکھی ہے؟" غزالہ نے زوبیہ کو ایک تصویر دکھانی چاہی۔

"میں کل دیکھ چکی ہوں ساری تصویریں۔" اس نے ڈائری سے نگاہیں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"اوکے۔" غزالہ نے کہہ کر تصاویر واپس سائرہ کو دے دیں۔

"چلو، کچھ کھانے چلتے ہیں۔" سائرہ نے کہا اور تصاویر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیں۔

"ہاں چلو۔" غزالہ فوراً تیار ہو گئی۔

"میں بھی چلوں گی۔" زوبیہ نے جلدی سے کہا اور ڈائری بند کر دی۔ تینوں ایک ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے اپنی ڈائری وہیں چھوڑ دی تاکہ کوئی میز خالی دیکھ کر بیٹھ نہ جائے۔ غزالہ کینٹین والے سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے رہی تھی اور وہ غزالہ کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے سائرہ سے باتیں کرنے لگی۔ غزالہ کے بعد سائرہ اپنے لیے کچھ خریدنے لگی۔ ابھی غزالہ اس کے قریب آئی تھی کہ اسے کسی کی بلند

آواز سنائی دی۔ کوئی لڑکا شعر پڑھ رہا تھا' وہ چونک گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ان کے کالج کا بدنام زمانہ عرفان اس میز پہ بیٹھا' اس کی ڈائری کھولے شعر پڑھ رہا تھا۔ تین اور دوستوں نے بھی اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور شوق اور دلچسپی سے اس کی ڈائری پہ جھکے ہوئے تھے۔ عرفان نے شعر پڑھ کر سنایا تو باقی تینوں دوستوں نے گھٹیا انداز میں معنی خیزی کے ساتھ اوہ...... "کہا۔

وہ طیش میں آگئی۔

"اے...بدتمیز... تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں کہ کسی کی چیز کو بلا اجازت ہاتھ نہیں لگاتے..." وہ غصے میں

عرفان کی طرف بڑھی۔
"یہ آپ کی کاپی ہے...! آپ نے خود لکھے ہیں یہ شعر؟" خاصی معصومیت اور شرافت کا مظاہرہ کرتا عرفان اٹھ کھڑا ہوا پھر اپنے دوستوں سے بولا۔
"اچھا۔ آگے سنو۔"
عرفان نے اس کو اور اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور شعر پڑھا۔ اس شعر میں عشق و عاشقی کا ذکر تھا۔ جس پہ ان بدتمیز لڑکوں نے اور بھی گھٹیا پن سے 'اوہ... کہا۔ اسے سخت غصہ آنے کے ساتھ خفت کا احساس بھی ہوا۔
"بدتمیز! ادھر دو مجھے۔"
وہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر عرفان پہ جھپٹ پڑی۔ عرفان کے باقی دوست دور ہٹ گئے۔ جبکہ عرفان ذرا پیچھے ہٹ کر ایک اور شعر پڑھنے لگا۔ وہ پھر سے اپنی ڈائری چھیننے کے لیے لپکی۔ سائرہ نے آکر اسے پکڑ لیا۔ ذرا دور لے جا کر بولی۔
"اس کے منہ نہ لگو۔ چل کر پرنسپل سے شکایت کرتے ہیں۔"
"میں ایسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں... مجھے اپنی ڈائری لینی ہے۔"
وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عرفان جیسے آدمی کے ہاتھ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس کی ڈائری رہے۔ سائرہ سے خود کو چھڑا کر وہ پھر سے عرفان کی طرف چڑھ دوڑی۔ عرفان نے ٹھٹھا لگاتے ہوئے ڈائری اپنے دوسرے دوست کی طرف اچھال دی۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ اب دوسرا دوست ڈائری کیچ کر کے گھٹیا انداز میں اس میں سے شعر پڑھنے لگا تھا۔ وہ غصے کی شدت میں کچھ اور سوچ نہ پائی۔
"ادھر دو میری ڈائری۔" تحکم سے کہتی ہوئی وہ دوسرے دوست کی طرف چل پڑی۔ قریب پہنچنے پہ دوسرے نے کاپی، تیسرے کی طرف اچھال دی۔ وہ اور بھی مشتعل ہوئی۔
"گھٹیا آدمی۔" کہتے ہوئے وہ تیسرے کی طرف بڑھی اور تیسرے نے ڈائری واپس عرفان کی طرف اچھال دی۔ وہ لوگ ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ اس کا تماشا بنا کر خوش ہو رہے تھے۔ غصہ تو حد سے بڑھا ہوا تھا ہی۔ اب احساس ذلت بھی حد سے بڑھنے لگا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے بسی کے ساتھ عرفان کے ہاتھوں میں جاتی اپنی ڈائری کو دیکھا۔ اسی وقت کسی نے عرفان کے عقب سے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف گھمایا اور ٹھونک کر زوردار مکا عرفان کے منہ پر جڑ دیا۔ عرفان لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس نے دیکھا وہ اس سے ایک کلاس سینئر صاعد تھا۔ وہ صاعد کو شکل سے پہچانتی تھی۔ اس کا نام بھی جانتی تھی۔ لیکن کبھی غور سے اسے دیکھا تھا نہ پہلے کبھی اسے کوئی اہمیت دی تھی۔ لیکن آج تو صاعد نے اسے چونکا دیا تھا۔ عرفان کے تینوں دوست صاعد پہ چڑھ دوڑے۔ عرفان بھی اٹھ کر صاعد سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔ صاعد اکیلا ان چاروں لڑکوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ لمحوں میں ہی کینٹین کسی اکھاڑے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ صاعد نے تن تنہا ان چاروں کی دھنائی کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ مبہوت سی کھڑی اسے دیکھے گئی۔ وہ چاروں بھاگ گئے تو صاعد نے چند قدم چل کر زمین پہ گری اس کی ڈائری اٹھائی اور اسے جھاڑتے ہوئے پلٹا۔
"یہ میرا ہیرو ہے۔ لمبا، بہادر اور..." اس کے دل سے بے ساختہ آواز آئی۔ صاعد چلتا ہوا قریب آگیا۔ آج اس نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔
"نوٹ سوہینڈ سم۔"
عام سی صورت کے صاعد کو دیکھ کر اسے کچھ مایوسی ہوئی۔
"لیکن پھر بھی چلے گا... اجے دیوگن جتنا خوب صورت تو ہے ہی۔" اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔
کیا ہوا جو صاعد، سائرہ کے منگیتر جتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ نہ تھا۔ لیکن جتنا رعب صاعد کی شخصیت میں تھا۔ جتنا وہ بے خوف، نڈر اور ہیرو ٹائپ تھا۔ اتنا سائرہ کا منگیتر تو نہیں تھا اور اسے ایسے لڑکے ہی تو پسند تھے۔ ایکشن والے۔ بالی ووڈ فلموں کے ہیروز، دبنگ،

سنگھم ٹائپ اور صاعد دبنگ سلمان خان جیسا نہ سہی۔ سنگھم سے تو بہتر ہی دکھتا تھا اور اس بندے کی چال میں جو اسٹائل تھا' چہرے پہ اور شخصیت میں جو رعب و دبدبہ تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر مرعوب ہو جاتا۔

"یہ لیجیے آپ کی ڈائری۔" اس اجے دیوگن نے قریب آکر بڑی شرافت کے ساتھ ڈائری اس کی جانب بڑھائی۔ اس نے ڈائری تھامتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو۔" صاعد کے نچلے ہونٹ سے خون نکل رہا تھا۔

"آپ کا ہونٹ...." وہ ہچکچائی۔ شرم آرہی تھی اور شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جو دل باغی ہوا تھا' اس سے الگ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کے اتنا کہنے پر ہی صاعد نے ہاتھ کی پشت اپنے ہونٹ پہ رگڑی۔ خون دیکھ کر لاپروائی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ چھوٹی سی چوٹ ہے۔"

"آہ۔!"

وہ بے ہوش ہونے کو تھی۔ اس ظالم نے تو اسے مار ڈالا تھا۔ کیسے اپنے دل کو سنبھالے وہ اپنے پیروں پہ کھڑی رہی' وہ ہی جانتی تھی۔ صاعد ایک مہربان سی مسکراہٹ اچھال کر مڑ گیا۔ اس کی ڈائری تو اس کے ہاتھوں میں تھما گیا لیکن اس کے سینے سے دل نکال کر لے گیا ظالم۔

☆ ☆ ☆

اور یوں.... بالکل فلمی انداز میں ان دونوں کی محبت کا آغاز ہوا۔ اس واقعے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کو جہاں بھی دیکھتے پہچان جاتے۔ ہائے ہیلو سے سلسلہ آگے بڑھ گیا۔ دونوں ملاقاتیں کرنے لگے۔ کالج کے اندر بھی اور کالج سے باہر بھی۔ صاعد سے کتنے لوگ ڈرتے تھے۔ اس کا کتنا رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کا صحیح معنوں میں اندازہ اسے صاعد سے دوستی کے بعد ہوا۔

صاعد سے محبت کا سلسلہ چل نکلنے کے بعد اسے ایک بار اور کسی لڑکے نے کالج میں چھیڑا تھا۔ پھر صاعد نے جو اس کی دھلائی کی۔ اس کے چرچے دنوں تک کالج میں لڑکے لڑکیوں کی زبان پہ رہے۔ اب اس کی اور صاعد کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ جب سے کالج میں یہ بات عام ہوئی تھی کہ وہ صاعد کی دوست ہے۔ کالج کا ہر لڑکا اس سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتی۔ صرف کالج ہی نہیں' کالج سے باہر بھی۔ صاعد جن لوگوں کے منہ لگتا تھا۔ ان کے دلوں میں اس نے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس کے سامنے چوں کرے اور پھر اس نے اور صاعد نے اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیا تھا۔ اس کے امی اور ابو کو کوئی اعتراض نہ تھا اور صاعد کے گھر والوں کو اگر کوئی اعتراض ہوتا بھی' تو بھی کس میں ہمت تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ بول سکتا؟ یوں دونوں کا رشتہ بھی طے ہو گیا اور وہ ہر بات' ہر ملاقات کا قصہ درخشاں کے گوش ضرور گزارتی تھی۔

"پتا ہے۔ آج میں اور صاعد آئس کریم کھا رہے تھے۔ صاعد کی امی کا فون آگیا کہ جلدی گھر آؤ۔ مکان مالک نے پانی کی سپلائی بند کردی ہے۔"

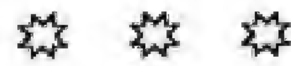
صاعد کو اتنا غصہ آیا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے فون پہ ہی مکان مالک کو بھاری بھاری گالیاں تول دیں اور فون رکھنے کے بعد ایک سیکنڈ بھی نہیں رکا۔ گھر جا کر سیدھا کر کے رکھ دیا اس نے مالک مکان کو۔ سارے کس بل نکال دیے اس کے۔ ہاہاہا۔"

"پتا ہے.... دو دن پہلے میں صاعد کے گھر گئی تھی ناں.... اس کی بڑی بہن کا رویہ مجھے کچھ روکھا پھیکا سا لگا۔ میں نے صاعد سے کہہ دیا۔ صاعد نے وہیں پہ میرے سامنے اپنی بہن کی وہ کٹ لگائی کہ کیا بتاؤں.... بے چاری کا رونے والا منہ ہو گیا.... ہاہاہا...."

"پتا ہے۔ ہم آج ریسٹورنٹ گئے تھے ناں.... صاعد کی سالگرہ سیلی بریٹ کرنے۔ جاہل ویٹر نے صاعد کے کپڑوں پہ جوس کا گلاس الٹ دیا' صاعد نے اس کو وہ

باتیں سنائیں کہ بس.... ریسٹورنٹ کا منیجر آکر صاعد سے معافیاں مانگنے لگا.... صاعد نے اسے بھی خوب لتاڑا۔

اور اس کے سنائے صاعد کی بہادری کی انہی قصوں کا نتیجہ تھا کہ درخشاں کا احساس کمتری اور احساس محرومی بڑھتا چلا گیا۔ اپنے میاں سے شکایتیں بڑھ گئیں اور سسرال میں جینا محال لگنے لگا۔



"میں نے خود اپنے کانوں سے سنا امی.... ان کی ماں انہیں اپنے کمرے میں لے جا کر میری شکایتیں لگا رہی تھی۔ تمہاری بیوی بدتمیزی کرتی ہے۔ تمہاری بیوی گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ کسی چھوٹے' بڑے کا لحاظ نہیں کرتی۔ کسی آئے گئے کو پوچھتی نہیں۔ بازاروں میں گھومتی رہتی ہے۔ سارے پیسے اپنے کپڑوں' جوتوں اور میک اپ پہ خرچ کر دیتی ہے.... یہ سب کہہ رہی تھیں سفیان کو۔"

درخشاں آگ بگولہ ہوئی اپنی ماں کو پوری رپورٹ دے رہی تھی۔ اس وقت وہ امی کے کمرے میں ان کے بستر پہ بیٹھی تھی۔ امی اور زوبیہ بھی وہیں بیٹھی اس کی داستان ظلم و ستم سن رہی تھیں۔

"اچھا.... یعنی اپنے بیٹے کو بہو سے لڑوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔" امی نے شاطرانہ انداز میں سارے معاملے کو سمجھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اور کیا.... میں بھی خاموش نہیں رہی۔ دروازہ کھول کر ان کے کمرے میں داخل ہو گئی اور بلا لحاظ سنائیں پھر.... ساس صاحبہ کے منہ پہ کہا کہ میرے میاں کو یوں کمرے میں لا کر میرے خلاف کان بھرنا بند کریں۔ میں کوئی نوکر نہیں ہوں جو آپ سب بیٹھ کر کھاؤ اور میں گھر کے کام کروں۔ میں اپنے میاں کی کمائی کھاتی ہوں۔ آپ لوگوں کی چاکری کیوں کروں؟ اپنے میاں کی کمائی کو جیسے چاہے خرچ کروں' آپ کو کیا تکلیف ہے؟ خود آپ میں سے تو کوئی مجھے عزت دیتا نہیں اور مجھے کہتی ہیں کہ میں بدتمیزی کرتی ہوں؟ ابھی میرے میاں کو میرے خلاف کون بھڑکا رہا تھا؟ یہ سب کرنے کے بعد' آپ یہ بھی چاہتی ہیں کہ میں آپ کی عزت کروں؟" ساس صاحبہ جواب میں من من کرنے لگیں ساتھ ہی "دیکھا سفیان کیسے بول رہی ہے۔ دیکھا سفیان کیسے بدتمیزی کر رہی ہے"..... شکایتیں لگاتی جاتیں.... میں نے بھی کوئی پرواہ نہیں کی۔ خوب سنایا ان کو.... "دیکھا سفیان دیکھا۔ جیسے بڑا شیر ہے ان کا سفیان۔"

درخشاں بہت تپی ہوئی تھی۔

"سفیان کچھ نہیں بولا....؟" امی نے پوچھا۔

"وہ کیا بولیں گے امی....؟ ان میں کچھ بولنے کی ہمت ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔ بس' دو چار بار اپنی ماں سے چپ ہونے کو کہا۔ دو چار بار مجھے۔ لیکن اس کی امی چپ نہیں ہو رہی تھیں تو میں کیوں چپ ہوتی؟ سفیان خود ہی وہاں سے واک آؤٹ کر گئے پھر۔"

درخشاں نے آخر میں سر جھٹک کر اپنے اندر بھری تلخی کو کم کیا پھر بولی۔

"بعد میں' پھر میں نے اپنے کمرے میں سفیان کو خوب سنائیں۔ صاف کہہ دیا کہ دیکھ لو' تمہاری ماں مجھے اور تمہیں لڑوانے کے لیے تمہارے کان بھرتی ہے۔ تمہاری پیٹھ پیچھے مجھے کیا کچھ نہیں کہتی ہو گی۔ اب میرا ان لوگوں کے ساتھ گزارا نہیں۔ الگ گھر لو اور وہاں چل کر رہو۔ ورنہ بھول ہی جاؤ کہ میں اس گھر میں کبھی آؤں گی.... یہ کہہ کر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور آ گئی۔"

"بہت اچھا کیا.... ایسے لوگوں کا یہی علاج ہے۔ جب تمہارا میاں اپنے گھر والوں کے سامنے تمہاری حمایت نہیں کر سکتا تو پھر الگ رہنا ہی بہتر ہے۔" انہوں نے فخریہ بیٹی کی پیٹھ تھپکی۔ پھر بولیں۔

"زوبیہ کی بھی شادی قریب ہے۔ تم شادی کی تیاریوں میں میرا ہاتھ بٹانا اور تم نہیں جاؤ گی تو ادھر ان لوگوں کو بھی اچھی لو لگ جائے گی۔ مفت کی نوکرانی سمجھ رکھا ہے تمہیں۔"

درخشاں نے سرہلایا۔ پھر اس کو دیکھ کر بولی۔
"تم بھی شادی سے پہلے ہی الگ گھر کا مطالبہ کردو۔ ورنہ تمہیں بھی سسرال والوں نے نوکرانی سمجھ لینا ہے میری طرح۔" درخشاں کی بات پہ اس نے نخوت سے مکھی اڑائی۔
"مجھے ایسا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ یہ ساری پریشانیاں آپ جیسی بہوؤں کو ہوتی ہیں' جن کے شوہروں میں ہمت ہی نہیں ہوتی کہ اپنی بیوی کا دفاع کر سکیں۔۔۔ صاعد کا رعب اور دبدبہ اپنے پورے گھر پہ ہے۔ سب گھر والے ڈرتے ہیں اس سے۔ کوئی مجھے پریشان کر کے تو دکھائے۔ سیدھا کر کے رکھ دے گا صاعد۔۔۔ میں تو ان ہی لوگوں کے بیچ رہوں گی۔ مکان کا کرایہ بھی دینا نہیں پڑے گا اور آرام سے راج کروں گی۔ صاعد کے ڈر سے سسرال والے تخت پر بٹھا کر خدمتیں کریں گے میری۔"
وہ بالکل بے فکر اور پراعتماد تھی۔ درخشاں اس پہ رشک کرنے سے خود کو روک نہ سکی۔



اب زوبیہ کی شادی تھی تو درخشاں کے سسرال والوں کو بھی دعوت نامہ بھیجنا پڑ گیا۔ بدلے میں سفیان پھر سے چلا آیا درخشاں کو منانے۔ پہلے بھی دوبار کوشش کر چکا تھا اور پہلے والے الفاظ پھر سے آکر دہرا رہا تھا۔
"خالہ! آپ ہی سمجھائیں اسے۔ الگ گھر میں کیسے رہ سکتی ہے یہ؟ زمانہ دیکھیں کتنا خراب ہے۔ لوگ سو' دو سو روپے کے لین دین کے چکر میں لوگوں کو جان سے مار دیتے ہیں۔ آئے دن عورتوں کے ریپ اور قتل کی خبریں سنتے ہیں۔ ایسے میں' میں کیسے اسے الگ مکان میں اکیلے رکھ سکتا ہوں؟"
سفیان بھائی وہی مجبور اور شریف سی صورت بنائے امی سے کہہ رہے تھے۔
"اور جو آپ کے گھر میں چوبیس گھنٹے حالات خراب رہتے ہیں وہ؟ آپ کی ماں' آپ کی بہنوں نے میرا وہاں جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ کچھ نہیں ہے؟ خود بھی زندگی عذاب کر رکھی ہے اور آپ کے بھی کان بھرتی ہیں تاکہ ہم میاں بیوی لڑیں۔" درخشاں نے چیخ کر کہا۔
"دیکھو' درخشاں!۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ تم اتنا نیگٹولی کیوں سوچتی ہو۔۔۔ تم میری بیوی ہو۔ میری ذمہ داری پہ اس گھر میں رہ رہی ہو۔ ایسے میں اگر انہیں تم سے کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ مجھے نہیں کہیں گی تو اور کسے کہیں گی۔۔۔ اس میں لڑوانے والی کونسی بات ہے؟۔۔۔ کیا ان کی کسی شکایت پہ کبھی لڑا میں تم سے؟" متانت اور رسان سے سمجھاتے ہوئے آخر میں سفیان نے سوال کیا۔ اب کے درخشاں یا امی نہیں' زوبیہ بول پڑی۔
"آپ کسی سے لڑ جائیں' یہ تو ناممکنات میں سے ہے سفیان بھائی!۔۔۔ آپ کی کم ہمتی اور بزدلی آڑے آجاتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کی امی اور بہنوں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی۔ وہ تو اپنے طور پر پوری کوشش کرتی ہیں۔"
اس نے بلالحاظ لفظوں کے وار کیے۔ سفیان کی جگہ اگر یہی الفاظ کوئی صاعد کو کہتا ہوتا تو وہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ لیکن یہ سفیان بھائی تھے۔ اس کی بات کا ذرا بھی برا مانے بغیر' نرم اور شفیق سے لہجے میں بولے۔
"تم ابھی چھوٹی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔۔۔ بات کسی کی کم ہمتی یا بزدلی کی نہیں ہے۔۔۔ میں بھی چاہوں تو ہتھیار اٹھا کر جنگ و جدل کرنے اٹھ کھڑا ہوں۔ لیکن پوائنٹ یہ ہے کہ اس سے ہوگا کیا؟۔۔۔ مسائل بات چیت سے حل ہوتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے نہیں۔ ورنہ جنگیں تو عالمی پیمانے پہ بھی ہو چکی ہیں۔ کیا اس سے کسی کا کچھ سدھرا؟۔۔۔ لاکھوں انسانوں کی جانیں لینے کے بعد آخر کار انہیں مذاکرات ہی کرنے پڑے ناں۔۔۔ پھر یہی مذاکرات کوئی نقصان اٹھانے سے پہلے کیوں نہیں۔۔۔؟
میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں اس سے بھی اور امی وغیرہ

سے بھی کہ مل جل کر رہو۔ کچھ یہ ان کی باتیں مانے۔ کچھ وہ اس کی مانیں۔ آرام سے خوش اسلوبی سے رہیں۔ انسان جہاں بھی رہتا ہے۔ اسے کام تو کرنا پڑتا ہے۔ ضرورت میں 'مشکل میں 'انسان ہی انسان کے کام آتا ہے ناں.....!"

وہ نرمی سے وضاحت پیش کررہے تھے۔ جسے سن کر درخشاں کو پتنگے لگ گئے۔

"دیکھا..... آپ اپنی ماں اور بہنوں کی حمایت کرکے مجھے برا ثابت کررہے ہیں..... میں ان کے کام کروں۔ میں ان کی خدمتیں کروں۔ نوکرانی نہیں ہوں میں۔"

"درخشاں..... اپنے گھر میں کام کرنے میں نوکرانی والی کیا بات ہے؟"

سفیان نے لاچاری سے کہا۔ وہاں موجود تینوں عورتوں میں سے وہ کسی ایک کو بھی سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

"اپنے گھر میں کام کرنے میں نوکرانی والی بات نہیں ناں!..... دوسروں کے گھروں میں 'دوسروں کی خدمتیں اور کام کرنا تو نوکرانیوں والی ہی بات ہے..... اور اس سے بڑھ کر آپ کے گھر والے مجھے اور کچھ سمجھتے بھی نہیں ہیں..... بس میں نے کہہ دیا ہے۔ مجھے علیحدہ گھر لے کر دیں۔ وہاں کام کرلوں گی۔ آپ کے گھر والوں کی چاکری مجھ سے نہیں ہوتی۔"

درخشاں کا فیصلہ اب بھی بے لچک اور اٹل تھا۔ سفیان بھائی درخشاں کا منہ دیکھ کر رہ گئے اور زوبیہ دیکھ رہی تھی کہ کتنا کم ہمت اور بزدل تھا وہ انسان اور اپنی بزدلی کو کیسے شرافت کے لبادے میں چھپا رکھا تھا۔ اسے وہ انسان ہمیشہ کی طرح گھٹیا لگا۔



سفیان نے علیحدہ گھر لے کر نہ دیا۔ وہ اپنی کہی پر قائم رہا اور درخشاں امی کی شہ اور زوبیہ کی تمسخرانہ باتیں سنتی 'ضد میں آکر میکے بیٹھی رہی۔ زوبیہ کی شادی بھی ہو گئی اور وہ صلعد کے ساتھ رخصت ہو کر سسرال بھی چلی گئی۔ درخشاں میکے میں امی اور لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے اس طرح میکے آبیٹھنے پہ خاندان والے 'میکے والے باتیں بنا رہے تھے۔ امی کا رویہ بھی دن بدن عجیب سے عجیب تر ہوتا جا رہا تھا۔ بیٹی کو غیر محدود مدت کے لیے میکے بیٹھا دیکھ کر اب وہ بہت سے تحفظات کا شکار ہو رہی تھیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ سفیان درخشاں کو طلاق دے دے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ درخشاں یہیں بیٹھی رہ جائے اور سفیان دوسری شادی کرلے۔

ایسے وسوسے اور بہت سے خدشات ماں اور بیٹی کو ستانے لگے۔ ادھر زوبیہ کی زندگی تو کسی بالی وڈ کی مسالے دار فلم سے کم نہ تھی۔ ہیرو 'ہیروئن 'نیا نیا ملاپ 'نئی نئی دلہن کے چاؤ چونچلے۔ رومانس 'محبت بھری باتیں۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں۔ کبھی جدا نہ ہونے کے وعدے۔ اپنے اجے دیوگن کے ساتھ وہ بے حد خوش تھی۔ لیکن یہ دن مختصر سے تھے۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی صلعد نے کام شروع کردیا اور یہ شادی کے بعد اس کے کام کا پہلا دن تھا۔ ایک ایک پل گھنٹے بن کر گزر رہا تھا۔ سارا دن اس کا گھڑی دیکھتے گزر گیا۔ صلعد کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ خدا خدا کرکے دن گزرا اور صلعد کی واپسی کا وقت ہونے لگا۔ اس نے اپنے کمرے میں گھس کر تیار ہونا شروع کردیا۔ صرف شادی کا لہنگا نہیں پہنا تھا ورنہ اس نے اپنی تیاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ صلعد جب آکر اسے دیکھے تو وہ خوب سجی بنی ہو۔

وہ تیار ہو گئی اور صلعد ابھی تک نہ آیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ وقت کے حساب سے تو اب سے دس' پندرہ منٹ پہلے ہی صلعد کو آجانا چاہیے تھا۔ پھر وہ گھر کیوں نہیں پہنچا تھا؟ یہ تو ناممکن سا لگ رہا تھا کہ وہ گھر آجاتا لیکن اپنے کمرے میں نہ آتا۔ تو کیا وہ اب تک لوٹا ہی نہ تھا..... اسے تشویش ہونے لگی تو وہ معلوم کرنے کے لیے اٹھی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور صلعد کمرے میں آیا۔ اس کا موڈ ذرا خراب لگ رہا تھا۔

جسے اس نے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔
"صاعد!.... کہاں رہ گئے تھے؟.... اتنی دیر کردی۔" بے تابی سے اس کے سینے سے جا لگی۔
صاعد نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے خود سے علیحدہ کیا۔ وہ الجھ سی گئی۔ صاعد کا رویہ خاصا سرد تھا۔
"آج گھر میں کچھ رشتہ دار آئے تھے۔ امی نے تمہیں کہا بھی لیکن پھر بھی تم سر پہ دوپٹہ لیے بنا ان کے سامنے چلی گئیں؟" صاعد سخت لہجے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔
وہ صاعد کو دیکھ کر رہ گئی۔ یہ بھی کوئی بات تھی جس کا اتنا بڑا ایشو بنایا جاتا؟ ابھی ان کی شادی کو ایک ہفتہ گزرا تھا اور ساس صاحبہ نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانا شروع کر دیے تھے۔ دن میں کچھ رشتہ دار آئے تھے۔ اور ساس نے اسے دوپٹہ سر پہ لپیٹنے کا حکم دے دیا۔ اسے یہ نہایت فضول لگا۔ وہ تو گھر سے باہر جاتے ہوئے بھی دوپٹہ سر پہ نہیں لیتی تھی۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کتنی بار بازاروں اور ریسٹورنٹس میں ایسے ہی بنا دوپٹے کے گھوم چکی تھی۔ تو پھر گھر آئے بیٹھے ان رشتہ داروں کے سامنے بھلا کیا ضرورت تھی؟ اس نے ان کی بات ان سنی کر دی۔ اور اس معمولی سی بات کو لے کر ساس صاحبہ نے کام سے آتے ہی بیٹے کو شکایت کر دی تھی۔ اسے غصہ آنا فطری تھا۔
"اس میں اتنا بڑا ایشو بنانے والی کونسی بات ہے صاعد؟.... یہ تو تم بھی جانتے ہو اور تمہاری امی بھی کہ مجھے ماسیوں کی طرح دوپٹہ...."
اس کی بات جاری تھی کہ زن سے طمانچہ آیا اور اس کے گال پہ نشان چھوڑ گیا۔ وہ طمانچہ اس کے گال نہیں اس کی روح پہ لگا تھا۔ اسے زبردست دھچکا لگا تھا۔ گال پہ ہاتھ رکھے اس نے بے یقین نظروں سے اپنے سامنے کھڑے اپنے ہیرو کو دیکھا۔ جو دم پہ چوٹ کھائے کتے کی طرح شور مچا رہا تھا۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے بے دریغ سنا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے میکے میں امی کے کمرے میں بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر ہٹ دھرمی کے ساتھ منہ پھلا رکھا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔
"لعنت ہے اس وحشی درندے پہ۔ عورت پہ ہاتھ اٹھانا کوئی مردانگی نہیں 'بزدلی ہے۔ قانوناً "جرم ہے۔" امی نے اس کی روداد سن کر غصے اور تنفر کے ساتھ تبصرہ کیا۔ لب و لہجے میں صاعد کے اس رویے پہ سخت ملامت تھی۔ درخشاں بھی وہیں ان کے پاس بیٹھی تھی۔ امی کا رد عمل اور تبصرہ سن کر کہنے لگی۔
"عورت پہ ہاتھ اٹھانا قانوناً" جرم ہے تو مرد پہ ہاتھ اٹھانا کہاں کا ثواب ہے؟.... کیا وہ جرم نہیں؟" امی اور زوبیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ درخشاں کہنے لگی۔
"یہ پچھلے دو سال سے اسے لوگوں کے ساتھ لڑوا رہی ہے۔ کالج میں 'بازاروں میں' ریسٹورنٹس میں اس کے اپنے گھر میں.... آج صاعد نے میری خاطر فلاں لڑکے کو مارا۔ آج فلاں کی پٹائی کردی۔ آج اپنی ماں کو سنا دیا۔ آج اپنی بہن سے لڑ پڑا۔ آج مالک مکان کو پکڑ کے سیدھا کیا۔ آج پڑوسیوں سے تو تو میں میں کی۔ آج اپنے دوستوں سے ہاتھا پائی کی.... کوئی دنیا کا بندہ چھوڑا ہے 'جس سے اس نے صاعد کو نہ لڑوایا ہو....
صاعد دبنگ ہے۔ صاعد کسی سے نہیں ڈرتا۔ صاعد کی زمانے میں دہشت ہے۔ ساری دنیا اس کے غصے سے ڈرتی ہے۔ یہی تعریفیں کرتی رہی ہے نال یہ اس کی؟ اسے لوگوں سے لڑوا کر خوش ہوتے ہوئے یہ کیسے بھول گئی کہ جو آدمی "کسی پہ بھی" ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ وہ "اس پہ بھی" ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ جب اپنے فائدے کے لیے کسی سے لڑوانا ہو تو میرا ہیرو 'میرا دبنگ' میرا محافظ.... اور جب خود پہ آئے تو بزدل 'وحشی' درندہ' مجرم...." درخشاں نے تاک تاک کر طنز کے تیر چلائے۔ آج اس کی باری تھی اپنی بہن کو باتیں سنانے کی۔ جو زوبیہ برداشت نہ کر سکی۔
"تم تو مجھے شریکوں کی طرح باتیں سناؤ گی ہی....

موقع جو مل گیا ہے تمہیں۔" زوبیہ نے چیخ کر کہا۔

"نہ دیتی موقع... رہتی ناں اپنے اسی ہیرو کے پاس۔ میرا میاں تو بنا ہڈی کے 'نالی کا کیچوا' ہے۔ لیکن تمہارا تو بہادر' غیور' طاقت ور ہیرو ہے نا یہی چاہیے تھا نا تمہیں؟" درخشاں بھی جواب میں منہ ماری کرنے لگی۔

"او... چپ کر جاؤ' چپ کر جاؤ... ہارٹ اٹیک کروانے لگی ہو مجھے بد بختو!" امی نے سر پکڑ کر دہائی دی۔

"پہلے ایک کی پریشانی تھی' اب اوپر سے دوسری بھی سسرال چھوڑ کر سر پہ آ بیٹھی ہے... کیا جواب دوں گی میں لوگوں کو... ابھی شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور یہ..."

امی کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ لیں یا اپنی بیٹیوں کو پیٹ ڈالیں۔ امی کی باتیں سن کر زوبیہ کو اپنے لالے پڑ گئے۔

"چاہے جو بھی ہو امی... میں صاف بتا رہی ہوں... مر جاؤں گی لیکن اس آدمی کے پاس واپس نہیں جاؤں گی... میں بھوکی رہ لوں گی۔ پیاسی رہ لوں گی۔ ساری زندگی اکیلی رہ لوں گی۔ اگر ضرورت پڑی تو یہ گھر بھی چھوڑ کر چلی جاؤں گی... لیکن ایسے شوہر کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کروں گی جو مجھ پہ ہاتھ اٹھائے۔ مجھے اس سے طلاق چاہیے اور یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

زوبیہ نے مضبوطی اور قطعیت کے ساتھ اپنا فیصلہ سنایا۔

امی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ درخشاں طنز و تمسخر کے ساتھ زوبیہ کو دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے فیصلہ سنایا۔ امی نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"اب تم کہاں چل دیں؟" امی نے لٹے پٹے انداز میں سوال کیا۔

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔" درخشاں نے جواب دیا۔

"ہیں... اسفیان نے الگ گھر لے لیا کیا؟" امی نے حیرت سے دریافت کیا۔

"نہیں لیا..." اس نے فوراً ان کے شک کی تردید کی اور بولی "میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہ لوں گی۔" امی کو سنا کر اس نے گہری نظریں زوبیہ پہ جما دیں اور جتاتے ہوئے بولی۔

"میرا شوہر اگر میری خاطر کسی اور پہ ہاتھ نہیں اٹھاتا' تو وہ کسی اور کی خاطر مجھ پہ بھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔"

زوبیہ کو بہت کچھ جتا کر وہ مڑی اور لمبے لمبے اور مضبوط قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ زوبیہ خاموش بیٹھی اپنی بہن کو جاتے دیکھتی رہ گئی۔ آج اس کے پاس اپنی بہن کو سنانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔



راشدہ رفعت

محبتوں کا سفر

ذہین ہاؤس کے لاؤنج میں اس وقت سنّاٹے کا عالم تھا۔ بڑی اماں کے سامنے اس وقت ان کی چار عدد پوتیاں 'انتہائی مسکین صورت بنائے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اور پچھلے دس منٹ سے بڑی اماں قہربار نگاہوں سے ان لڑکیوں کو گھورے جا رہی تھیں۔ عرشیہ 'جیا' فریال اور مناہل تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈرتے ڈرتے بڑی اماں کی سمت دیکھتیں اور ان کی غضبناک نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پھر سے گردن جھکا لیتیں۔

"تم چاروں کی وجہ سے مجھے آج جس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں اس بات کا۔" آخر کار بڑی اماں نے گھورنے کا سلسلہ موقوف کر کے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کا آغاز کر دیا تھا۔

"جی بڑی اماں! ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔" عرشیہ نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے جواب دیا تھا مگر جیا کی کہنی نے فوراً" اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

"نہیں 'نہیں بڑی اماں! ہم اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتے۔" اس نے فوراً" اپنا بیان واپس لیا اور اس بار اس کے بائیں طرف کھڑی فریال نے اپنے بھاری جوگر سے اس کا پاؤں دبایا تھا۔ عرشیہ ڈفر کی آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ بڑی اماں شدید غصے میں کوئی طنزیہ سا سوال پوچھیں تو اس کا سب سے بہتر جواب 'چہرے پر شرمندگی طاری کر کے جھکے ہوئے سر

مکمل ناول



کو مزید جھکانا ہوتا ہے اور عرشیہ کے سوا وہ تینوں اپنے سر مزید جھکا چکی تھیں۔
"ہر مہینے ہزاروں روپے تم چاروں کی فیس کی مد میں بھرے جاتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کپڑا' بہترین جوتا' نئے سے نئے ماڈل کا موبائل' کھلا جیب خرچ بتاؤ اس گھر میں تمہاری کون سی فرمائش ہے۔ جو پوری نہیں کی گئی؟" بڑی اماں جلالی انداز میں ان چاروں سے مخاطب تھیں۔
"میری فرینڈ پچھلے مہینے مجھے پیارا سا ببی (کتے کا بچہ) گفٹ کر رہی تھی' بس آپ نے مجھے وہ پالنے کی اجازت نہیں دی تھی حالانکہ وہ بہت نایاب نسل کا ببی تھا۔" عرشیہ کی بات ادھوری رہ گئی تھی' جیا کی کہنی نے ایک بار پھر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔
"اس کے علاوہ تو ہماری ہر خواہش اور فرمائش پوری ہوئی ہے بڑی اماں۔" بہت بوکھلاتے ہوئے عرشیہ نے بات کا اختتام کیا۔ بڑی اماں نے ایک قہربار نگاہ اس پر ڈالی پھر باقی تینوں پوتیوں کے جھکے سر دیکھے۔
"سمجھ میں نہیں آرہا تمہاری نالائقی پر سر پکڑ کر روؤں یا تمہاری ڈھٹائی پر آنسو بہاؤں۔ تم نے مجھے آج جس شرمندگی سے دوچار کیا ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"
"سوری بڑی اماں۔" جیا' فریال اور مناہل نے منمنا کر سوری کی تھی۔ عرشیہ اس بار خاموش رہی تھی' جب بڑی اماں نے کہہ ہی دیا تھا کہ وہ انہیں کبھی معاف نہیں کریں گی تو سوری کرنے کا کوئی فائدہ تھا بھلا۔
"عرشیہ کی تو میں بات ہی نہیں کرتی۔ اس میں نہ عقل ہے اور نہ سمجھ' اور میں نے اس کڑوی سچائی سے بہت پہلے ہی سمجھوتہ کرلیا تھا' لیکن تم تینوں' ہاں جیا سب سے پہلے تم بتاؤ۔ اتنے عرصے سے اپنی پڑھائی کی پروگریس مجھ سے کیوں چھپائی تم نے۔ تم تو ذہین ہاؤس کا فخر اور مان تھیں' ایک تم ہی سے تو مجھے کچھ امید تھی کہ پڑھائی کے میدان میں تم خاندان کا نام روشن کرو

گی۔ اللہ نے تمہیں ذہن بھی دیا ہے' عمدہ حافظہ بھی عطا کیا ہے۔ بچپن میں ہر کلاس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتی تھیں تم۔ پھر کالج جا کر کیا ہوا۔ اتنی خراب کارکردگی کا تم کیا جواز پیش کرو گی؟" بڑی اماں جلالی انداز میں جیا سے مخاطب تھیں۔ جیا کے پاس کوئی جواز ہوتا تو پیش کرتی نا۔ چہرے پر شرمندگی کے مزید تاثرات سجا کر گردن مزید جھکالی۔
"اور تم فریال۔" توپوں کا رخ اب فریال کی جانب تھا۔
"تمہاری تعلیمی کارکردگی تو کبھی بھی قابل رشک نہیں رہی' میں اسی لیے تمہیں اتنے مہنگے کالج میں داخلہ دلوانے کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن تم نے مجھ سے کمٹمنٹ کی تھی کہ جان توڑ محنت کرکے اپنے آپ کو اس داخلے کا اہل بھی ثابت کرو گی۔ بتاؤ کہاں گئی وہ کمٹمنٹ اور کہاں گئی وہ جان توڑ محنت اور کوشش؟"
"پرامس بڑی اماں! آئندہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اب میں واقعی دل لگا کر پڑھوں گی۔" فریال نے فوراً" اگلی کمٹمنٹ کرلی تھی۔ بڑی اماں نے اسے غضبناک نگاہوں سے گھورنے پر اکتفا کیا پھر توجہ مناہل کی جانب کی۔
"اور تم مناہل۔ مجھے تمہاری تعلیمی حالت جان کر قطعا" کوئی شاک نہیں لگا تھا۔ تم دماغ کے اعتبار سے پوری کی پوری اپنے خاندان پر پڑی ہو اسی لیے میں نے تم سے کبھی کوئی امید وابستہ ہی نہیں کی تھی' لیکن تمہاری شخصیت اور کردار کی پختگی ہمیشہ تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ تمہاری سلجھی ہوئی میچور شخصیت دیکھ کر دل ہی دل میں میں ہمیشہ تم پر فخر کرتی تھی' لیکن تم نے بہت برے طریقے سے میرا مان توڑا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس ناٹک میں تم بھی ان تینوں کا ساتھ دو گی۔" بڑی اماں نے اسے بہت رنجیدگی سے مخاطب کیا تھا۔ مناہل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے' اس نے کپکپاتے لبوں سے بڑی اماں

کو سوری کہا تھالیکن بڑی اماں کم از کم اس وقت سوری قبول کرنے کے موڈ میں نہ تھیں۔

"اور تم عرشیہ!" ان کا روئے سخن عرشیہ کی جانب تھا۔

"آپ نے تو کہا تھا عرشیہ کی میں بات ہی نہیں کرتی، اس میں نہ تو عقل ہے، نہ ہی سمجھ۔" عرشیہ نے ہکلاتے ہوئے انہیں یاددہانی کروائی۔

"جب عقل تھی ہی نہیں تو اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی احمق۔" بڑی اماں دھاڑی تھیں۔ عرشیہ چپکی ہوگئی تھی۔

"دور ہو جاؤ تم چاروں میری نظروں سے۔ میں تم لوگوں سے کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔" بڑی اماں نے آخری فرمان جاری کیا۔

"سب باتیں تو آپ نے کرلیں۔ اب کوئی بات بچی ہی نہیں بڑی اماں۔" پتا نہیں یہ بھولپن کی ابتدا تھی یا انتہا مگر اس نازک وقت میں ایسی بات عرشیہ ہی کرسکتی تھی۔ جیا اور فریال نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی اور اس سے پہلے وہ چاروں بڑی اماں کے فرمان عمل کرتیں بڑی اماں خود ہی وہاں سے رخصت ہوگئی تھیں۔ انتہائی بگڑے تیوروں اور خوف ناک تاثرات سمیت۔

"ہم نے بڑی اماں کو بہت ہرٹ کیا ہے۔ وہ اتنی جلدی ہمیں معاف نہیں کریں گی۔" مناہل روتے ہوئے کشن پر بیٹھی تھی۔

"تو کیا ہوا دیر سے معاف کردیں گی ویسے بھی بڑی اماں خود ہی تو کہتی ہیں جلدی کا کام شیطان کا۔" عرشیہ نے اسے تسلی دی تھی۔

"تمہاری باتیں سن کر مجھے اپنے بے چارے بھائی کا خیال آجاتا ہے عرشیہ! تم سے شادی کے بعد کیا بنے گا تابش کا۔" جیا نے اسے گھورا۔

"مجھ سے شادی کے بعد کیا بنے گا تابش؟" عرشیہ نے سوال معمولی ردوبدل کے ساتھ دہرایا۔

"پاپا ہی بنے گا ڈفر۔" شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ

جیا کی معلومات میں اضافہ کیا گیا۔

"مجھے لگتا ہے تم اتنی بے وقوف ہو نہیں، صرف بے وقوف بننے کی ایکٹنگ کرتی ہو۔" فریال کو اس پر غصہ آگیا۔ اس عرشیہ کی بچی کی وجہ سے ہی تو ان سب کو آج یہ برا وقت دیکھنا پڑا تھا، تعلیمی میدان میں پچھلے کچھ مہینوں سے یہ چاروں جس قابل رشک کارکردگی کا مظاہرہ کررہی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہی نکلنا تھا کہ پرنسپل نے ان کے والدین کو گھر سے بلوانے کا حکم نامہ جاری کردیا۔

"ایکچوئلی میم! عرشیہ اور مناہل کے پیرنٹس ملک سے باہر ہوتے ہیں اور فریال اور میرے والدین بھی ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔ وہ گاؤں میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کا آنا بہت مشکل ہے۔" جیا نے نہایت ادب سے پرنسپل صاحبہ کو جواب دیا تھا۔

"آپ کے گھر میں کوئی بڑا، سرپرست، بزرگ کوئی تو ہوگا یا آپ چاروں کے سوا آپ کے گھر میں کوئی نہیں ہوتا۔"

"ہمارا ایک بھائی ہے میم! لیکن وہ آج کل۔"

"ہمارا نہیں صرف تمہارا۔" عرشیہ نے بروقت جیا کی بات کاٹی تھی۔ میڈم نے اس جملہ معترضہ پر اسے بری طرح گھورا تھا۔

"اس کا بھائی میرا بچپن کا منگیتر ہے میم۔" عرشیہ نے ان کے تیوروں سے بوکھلا کر فوراً وضاحت دی۔

"ایکچوئلی ہمارا بھائی فرسٹ کلاس کرکٹر ہے۔ آج کل وہ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا ہے' جیسے ہی وہ آئے گا ہم اسے آپ کے پاس لے آئیں گے۔"

"صرف وہ ہی بھائی آپ کا سرپرست ہے؟ اس کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں؟" پرنسپل نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ جیا نے بڑی بے چاری سی صورت بنا کر نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"بڑی اماں بھی تو ہیں۔ انہیں بھول گئیں۔" عرشیہ نے جیا کے کان میں گھس کر سرگوشی کی۔ یہ سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ بآسانی پرنسپل کے کانوں تک پہنچ گئی۔

"دیکھیے بیٹا! یہ ایک پرائیویٹ کالج ہے۔ یہاں طالبات سے منہ مانگی فیس لی جاتی ہیں تو رزلٹ کی گارنٹی بھی دی جاتی ہے' یہ کوئی سرکاری کالج نہیں ہے کہ سالانہ امتحان کے رزلٹ کارڈ سے ہی والدین کو بچے کی تعلیمی قابلیت کا اندازہ ہو۔ ہم بہت باقاعدگی سے پیرنٹس ٹیچر میٹنگ کا انعقاد اسی لیے کرتے ہیں کہ اسٹوڈنٹ کی تعلیمی پروگریس سے والدین کو باخبر رکھا جائے۔ مجھے اس کالج میں پرنسپل کی سیٹ سنبھالے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اور آپ چاروں کے علاوہ میں کالج کے ہر بچے کے والدین سے ملاقات کر چکی ہوں۔ آپ لوگوں کے گھر سے کبھی کوئی آپ کی پروگریس کے بارے میں پوچھنے نہیں آیا۔ کالج ریکارڈ میں جو آپ کے گھر کے فون نمبرز درج ہیں ان پر بھی رابطہ ممکن نہیں ہوتا' آپ کو میں آخری موقعہ دے رہی ہوں کہ اپنے گھر والوں میں سے کسی کو بلا کر لائیں۔ بڑی اماں' چھوٹی اماں واٹ ایور۔ کل مجھے ان سے ہر صورت ملاقات کرنی ہے' وگرنہ نتائج کی ذمہ داری آپ چاروں کو بھگتنا پڑے گی۔" پرنسپل صاحبہ نے سرد بے مہر اور دوٹوک لہجے میں باور کروایا تھا۔

اس وقت تو وہ چاروں اوکے میم کہہ کر ان کے آفس سے نکل آئیں' مگر آنے والے کل کے تصور سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے اگر بڑی اماں سے پرنسپل صاحبہ کی ملاقات کروادی جاتی تو بہت تاریخی قسم کی دو طرفہ بے عزتی متوقع تھی۔ کافی عرصے سے کسی قسم کی بے عزتی نہ ہونے کے سبب وہ چاروں خود کو خاصا باعزت تصور کرنے لگی تھیں۔ یہ بے عزتی سہنا چاروں کو ہی بڑا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

"کتنی خوفناک لگ رہی تھیں میم' خاص طور پر جب یہ کہہ رہی تھیں کہ نتائج کی ذمہ داری آپ چاروں کو بھگتنی پڑے گی۔" عرشیہ نے منہ بنا کر پرنسپل صاحبہ کی نقل اتاری تھی اور کیا کمال کی نقل تھی' وہی لب و لہجہ وہی انداز۔ جیا' فریال اور منال نے متاثر ہو کر اسے دیکھا۔ عرشیہ کا دماغ پڑھنے لکھنے سے صفر تھا۔ لیکن ایک خاصیت اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ لوگوں کی کمال کی نقالی کرتی تھی۔

"بڑی اماں کو کالج لے جانے سے بہتر ہے گاؤں سے امی کو ہی بلوا لیتے ہیں۔ صرف پرنسپل صاحبہ کی بے عزتی ہی سہنا پڑے گی نا۔ بڑی اماں کے غیض و غضب سے تو بچ جائیں گے۔" فریال نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"اتنے شارٹ نوٹس پر تائی جان کیسے آسکتی ہیں اور بالفرض محال وہ آ بھی گئیں تو جب ہم انہیں اپنے ساتھ کالج لے کر آئیں گے تو کیا بڑی اماں کچھ نہ پوچھیں گی۔" منال دھیرے سے بولی تھی۔ عرشیہ اور فریال نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی' جب کہ جیا کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔

"تم کیا سوچ رہی ہو اور تمہاری آنکھیں کیوں چمک رہی ہیں؟" فریال نے بہن کو ٹہوکا دیا۔

"بس ہو گیا ڈن' کل عرشیہ امی بن کر میم سے ملے گی۔" جیا کے شاطر دماغ نے مسئلے کا فوری حل نکالا تھا۔

"کس کی امی؟" عرشیہ نے ہونق پن سے پوچھا۔

"میری اور فریال کی امی اور منال اور اپنی تائی امی بن کر' عبایا کے اوپر اسکارف سے نقاب کر کے تم پرنسپل کے آفس میں ان سے ملاقات کرو گی۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاؤ گی' ہماری نالائقیوں پر ہمیں جی بھر کر ڈانٹو گی اور پرنسپل صاحبہ سے وعدہ کرو گی کہ آئندہ آپ کو ان چاروں سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اب یہ چاروں دل لگا کر پڑھیں گی۔" جیا نے تفصیلی پلان بتایا تھا۔ "اور جب میں یہ سب کر لوں گی تو تم مجھے اپنا نیا بلیک سینڈل تحفے میں دو گی" خلاف توقع عرشیہ کو ہی سب سے پہلے جیا کا پلان سمجھ میں آیا تھا' اس نے پلان کو فی الفور منظور کرتے ہوئے اپنی ڈیمانڈ سے بھی آگاہ کیا۔

"زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں عرشیہ صاحبہ۔ یہ سب جو تم کرو گی اس میں تم سمیت ہم چاروں کا مفاد پوشیدہ ہے۔" جیا نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"سب سے زیادہ تمہارا جیا' کیونکہ ہم تینوں تو تسلیم شدہ نالائق ہیں ہم جتنی مرضی کوشش کر لیں' پڑھائی میں ہمارا دماغ چلتا ہی نہیں اور بڑی اماں نے اس حقیقت سے سمجھوتہ کر رکھا ہے البتہ تمہاری ذہانت پر انہیں ہمیشہ سے مان ہے اور انہوں نے تم سے بہت سی امیدیں بھی وابستہ کر رکھی ہیں۔ جب پرنسپل صاحبہ بڑی اماں سے تمہاری شکایت لگائیں گی تو بڑی اماں کی توقعات کا مینار دھڑام سے زمین پر آگرے گا اور یقیناً" مینار کے ملبے تلے تم ہی آؤ گی تو سوچ لو بلیک سینڈل زیادہ عزیز ہے یا۔"

"اوکے' اوکے زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں۔ لے لینا سینڈل۔" جیا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"یہ سب کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ہم بڑی اماں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائیں گے۔" منال ان کا پلان تسلیم کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"تم اگر ہمارے پلان سے متفق نہیں ہو تب بھی تمہیں اسے ماننا پڑے گا۔ ہمارے تین ووٹ ہیں اور تمہارا صرف ایک۔" فریال نے اسے فوراً" جتایا تھا اور پھر اگلے دن عرشیہ' عبایا کے اوپر اسکارف لپیٹ کر پرنسپل صاحبہ سے ملنے پہنچ گئی تھی۔ چہرہ نقاب میں تھا اور آواز بدلنے میں تو عرشیہ کو ویسے ہی عبور حاصل تھا۔

"یہ میری اور فریال کی مدر ہیں میم۔ رات ہی گاؤں سے پہنچی ہیں۔ آپ نے بلوایا تھا اس لیے آپ سے ملنے آئی ہیں۔" جیا نے ادب سے میڈم کو مخاطب کیا۔ عرشیہ نے لہجہ بدل کر پرنسپل صاحبہ کو سلام کیا تھا۔ پرنسپل نے ملائمت سے ——— سلام کا جواب دیا تھا۔ پھر جیا کو دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے جیا آپ جائیں۔" جیا کو جانے کا کہہ کر امی بنی عرشیہ کو۔

"تشریف رکھیے پلیز۔" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ عرشیہ نے بوکھلا کر جیا کی سمت دیکھا۔ اسے "مورل سپورٹ" کے لیے جیا کا ساتھ درکار تھا۔ اگر خدانخواستہ کسی قسم کا بلنڈر ہو جاتا تو جیا اسے آسانی سے کور کر سکتی تھی۔ جیا خود بھی پرنسپل کی بات سن کر ذرا پریشان ہوئی تھی لیکن حکم مانے بنا کر کوئی چارہ بھی نہ تھا سوامی جی کو میڈم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود آفس سے باہر جانے لگی۔

"ایک گلاس پانی ملے گا میڈم۔" عرشیہ نے سوکھے حلق کو تر کرنے کی غرض سے صرف ایک گلاس پانی ہی تو مانگا تھا۔ جیا جاتے جاتے پلٹی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میڈم کے سامنے بیٹھی امی جی کو ایک جھانپڑ رسید کر دے۔ میڈم ٹیبل پر دھری منرل واٹر کی بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی تھیں۔ پانی پینے کے لیے عرشیہ کو لامحالہ نقاب نیچے سرکانا پڑتا۔ اس کی موٹی عقل میں یہ بات کیوں نہ سمائی تھی۔ جیا کی سمجھ

میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے صورت حال سے نمٹے۔

"ایکسکیوزمی میم۔ امی جی کو منرل واٹر سوٹ نہیں کرتا۔ میں انہیں سادہ پانی لا کر دیتی ہوں۔" اس نے جلدی سے پرنسپل کے سامنے سے گلاس اٹھایا تھا اور امی جی کو قہربار نگاہوں سے گھورتی ہوئی آفس سے بڑی تیزی سے باہر نکلی۔ پرنسپل اس کی بات سن کر کچھ حیران ہوئی تھیں۔ عرشیہ کو بھی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔

"جیا صحیح کہہ رہی تھی میڈم جی۔ میری ساری عمر گاؤں میں گزری ہے نا۔ خالص دودھ اور خالص پانی پینے کی عادت ہے۔ ڈبے والے دودھ سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے اور بوتل والے پانی سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔ میں تو جی نل کا تازہ پانی پیتی ہوں۔" عرشیہ نے میڈم کی حیرانی بھانپتے ہوئے اوٹ پٹانگ سی وضاحت کی تھی' خیر پرنسپل کو اس وضاحت سے کیا سروکار تھا۔ انہیں تو سامنے بیٹھی خاتون کو ان کی بچیوں اور بھتیجیوں کی خراب تعلیمی کارکردگی سے آگاہ کرنا تھا سو پروفیشنل انداز میں ان سے یہ سب ڈسکس کرنے لگیں اور واضح الفاظ میں یہ باور بھی کروایا کہ اگر بچیاں کارکردگی میں بہتری نہیں لائیں تو انہیں فائنل پیپرز میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

"آپ فکر نہ کریں جی۔ ان کی دادی سے تینوں کے کان کھنچواؤں گی۔ فرفر سبق یاد کیا کریں گی۔" عرشیہ نے انہیں یقین دہانی کروائی۔

"تینوں کے نہیں چاروں کے۔ میں کسی کی بھی کارکردگی سے مطمئن نہیں۔" پرنسپل صاحبہ نے اسے ٹوکا تھا۔

"ہاں جی چاروں کے۔ چاروں ہی اپنی دادی سے بہت ڈرتی ہیں۔ ماں باپ کا پھر اتنا رعب نہیں ہے ان پر۔" عرشیہ بہت مہارت سے آواز اور لہجہ تبدیل کر کے میڈم سے گفتگو کر رہی تھی۔ جی ہی جی میں اپنی کارکردگی پر پھولے نہ سما رہی تھی۔ کاش جیا' فریال اور مناہل بھی یہاں موجود ہوتیں تو دیکھتیں میری پرفارمنس۔ عرشیہ نے خود کو داد دیتے ہوئے سوچا تھا۔

"ان کی دادی سے ضرور ان کی شکایات کریں لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت کی اصل ذمہ داری ان کے ماں' باپ پر عائد ہوتی ہے۔ میرے خیال میں آج آپ کو اپنے شوہر کے ساتھ میرے پاس آنا چاہیے تھا' ویسے وہ کرتے کیا ہیں؟ میڈم نے برسبیل تذکرہ پوچھا تھا۔ ایک لمحے کی بات تھی۔ عرشیہ بھول گئی وہ اس وقت کس بہروپ میں میڈم کے سامنے بیٹھی ہے۔ میڈم اس سے اس کے شوہر کے متعلق استفسار کر رہی تھیں۔ بیٹ ہاتھ میں گھماتے تابش کا اسٹائلش سا پوز عرشیہ کے دماغ کے پردے پر لہرایا تھا' اور تابش کو سوچتے وقت تو وہ ویسے بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتی تھی۔

"میرے ہونے والے شوہر سے ابھی صرف میری منگنی ہوئی ہے میم۔ میرا مطلب ہے میرے منگیتر فرسٹ کلاس کرکٹر ہیں۔" شرمیلی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے میڈم کو آگاہ کیا اور میڈم تو جیسے کرنٹ کھا کر اچھلی تھیں۔

"نقاب نیچے کریں۔ اتاریں یہ نقاب۔" وہ غرائی تھیں۔ عرشیہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کہتی ہوں یہ ڈھاٹا۔ (نقاب) کھولیں۔" پرنسپل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عرشیہ پر خود ہی جھپٹ پڑیں۔ عرشیہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے نقاب نیچے کر لیا۔ آگے کی داستان خاصی المناک تھی۔ پرنسپل نے فی الفور گھر سے کسی بڑے کو بلانے کا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ ان کے غضب ناک تیوروں کو دیکھتے ہوئے بڑی اماں کو کالج بلوانا پڑ گیا تھا۔ کالج میں جو بے عزتی ہوئی سو ہوئی' بڑی اماں کے ہاتھوں بھی خاص درگت بنی تھی۔ بلکہ ابھی تو بے عزتی پروگرام کی صرف پہلی قسط نشر ہوئی تھی' جانے کتنے دن تک بڑی اماں کا عتاب سہنا تھا۔ چاروں منہ لٹکائے اور سر جھکائے اسی سوچ بچار میں مصروف تھیں۔ بڑی اماں کے بگڑے موڈ کو درست کرنے کی فی الحال کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آرہی تھی۔

ایسے میں نانا ماموں کی اچانک آمد ان کے لیے غیب

سے ہونے والی مدد ثابت ہوئی۔ نانا ماموں' بڑی اماں کے لاڈلے بھائی تھے' بڑی اماں کے بچوں کے عزیز ترین ماموں اور ذہین منزل کی تیسری نسل کے ہردلعزیز نانا ماموں۔ بہت شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے نانا ماموں اور اس بار وہ اکیلے نہ آئے تھے' ان کے ساتھ ان کا پوتا بھی تھا۔ حسب توقع بڑی اماں' بھائی اور بھائی کے پوتے کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔

"کتنے برسوں بعد دیکھ رہی ہوں میں ابتہاج کو۔ یہ تو بالکل تمہاری جوانی کا عکس ہے جہانگیر۔" بڑی اماں نے ابتہاج کو پیار کرتے ہوئے بھائی کو مخاطب کیا۔

"ویسے تو میں ابھی بھی جوان ہوں بڑی آپا لیکن ہاں یہ آپ نے درست کہا' ابتہاج واقعی مجھ سے بہت ملتا ہے۔" وہ بھی پوتے کو محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

"اور میری نٹ کھٹ سی پوتیاں کہاں ہیں۔ بھئی بلایئے تو انہیں۔" نانا ماموں کو ان چاروں کی یاد آئی تھی۔ بڑی اماں نے چاروں کو پکارا تھا' چند لمحوں بعد وہ چاروں نانا ماموں کو سلام کرنے پہنچ گئی تھیں۔

"رشتے کے لحاظ سے تو میں ان کا دادا لگتا ہوں ابتہاج' لیکن یہ مجھے جانے کیوں نانا کہہ کر بلاتی ہیں' بہرحال یہ مجھے اتنی پیاری ہیں کہ چاہے مجھے کچھ بھی کہہ کر پکاریں مجھے قطعاً" اعتراض نہیں ہوتا۔" نانا ماموں نے چاروں کو پیار سے دیکھا تھا۔

"ان چار پیاریوں کے کارنامے بتاؤں نا تمہیں تو اش اش کر اٹھو۔" بڑی اماں نے ان چاروں کو گھورا تھا' اور وہ جو یہ سمجھے ہوئے تھیں کہ نانا ماموں کے آنے سے ان کی بچت ہوگئی ہے' بڑی اماں کی بات سن کر پھر سے بوکھلا گئیں۔

"نانا ماموں! آپ جلدی سے فریش ہوجائیں' اتنے میں ہم کھانا لگاتے ہیں۔ آج بہت مزے کی کوفتہ کڑھی بنی ہے کھانے میں۔" جیا نے جلدی سے نانا ماموں کو مخاطب کیا تھا۔

"بالکل' بالکل۔ فٹافٹ دستر خوان لگاؤ بچیوں۔ کڑھی کا نام سنتے ہی میری بھوک چمک گئی ہے۔" نانا ماموں بشاشت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئے۔

"بچیاں۔" واقعی پھرتی سے دستر خوان لگانے بھاگی تھیں' شکر ہے کھانے کے دوران بڑی اماں نے پھر کوئی "متنازعہ" موضوع نہ چھیڑا تھا' وہ زیادہ تر ابتہاج سے گفتگو کرتی رہی تھیں اور اس گفتگو سے چاروں لڑکیوں کو بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ نانا ماموں کا یہ ہینڈسم سا پوتا بہت پڑھا لکھا' ذہین اور قابل شخص ہے۔ بڑی اماں اس کی قابلیت اور لیاقت کے بارے میں جان کر خوشی سے نہال ہوئے جارہی تھیں۔ ماشاء اللہ کہتے کہتے ان کے لب نہ تھک رہے تھے۔ ذہانت ہمیشہ سے ہی بڑی اماں کی کمزوری رہی تھی۔ وہ خود اپنے وقت میں بہت ذہین و فطین شخصیت تھیں' بلکہ ان کا پورا گھرانہ ہی بہت پڑھا لکھا' ذہین اور قابل گھرانہ تھا۔ انہوں نے اپنے ابا سے صاف صاف کہہ رکھا تھا کہ وہ ان کے لیے جو شریک سفر ڈھونڈیں' اس میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو اسے ذہین اور قابل ہونا چاہیے۔ ابا میاں نے لاڈلی کے لیے ایک ذہین ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

مرزا ذہین احمد بیگ' جو ابا میاں کے دوست کے بھانجے تھے' پہلی نگاہ میں ہی انہیں سطوت آرا کے لیے پسند آگئے۔ شادی کے بعد سطوت آرا کو اندازہ ہوا کہ ذہین احمد میں اور بھلے سے بہتیری خوبیاں ہوں' مگر وہ ہرگز بھی ذہین نہیں تھے' قسمت کی کیا ستم ظریفی تھی کہ وہ ذہین ہوتے ہوئے بھی ذہین نہ تھے۔ یہ شکر تھا کہ کاروبار میں دماغ چلا لیتے تھے۔ ننھیال کی طرف سے بہت سی زرعی زمین بھی ملی ہوئی تھی' گزارہ اچھا ہو جاتا تھا۔ ذہین احمد محبت کرنے والے نرم خو شوہر ثابت ہوئے۔ سطوت آرا نے ان کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی گزاری لیکن دل کے نہاں خانوں میں یہ حسرت ہمیشہ موجود رہی کہ کاش ان کے شریک حیات پڑھے لکھے اور انٹلکچوئل شخصیت کے مالک ہوتے۔ ان کی تمام تر توقعات کا مرکز و محور اب ان کی اولاد تھی۔ عبدالواسع اور عبدالرافع۔ دونوں بیٹوں نے رنگ و روپ ماں کا چرایا تھا تو نین نقش باپ سے

مستعار لیے تھے اب یہ طے ہونا باقی تھا کہ ان کا ذہن کس پر پڑا ہے۔ بظاہر دونوں بھائی بہت نٹ کھٹ شرارتی اور ذہین معلوم ہوتے تھے لیکن انہیں اسکول میں داخل کروانے کے کچھ عرصے بعد ہی سطوت آرا کو اندازہ ہو گیا کہ ذہین احمد کے دونوں بیٹے ذہانت کے اعتبار سے باپ پر ہی گئے ہیں۔ پڑھائی میں دونوں کا دماغ چلتا ہی نہ تھا۔ سطوت آرا جب بھی میکے جاتیں تو بھانجوں، بھتیجوں کی تعلیمی کارکردگی جان کر ان کا موازنہ اپنے نالائق بیٹوں سے کرتیں اور دل مسوس کر رہ جاتیں۔

عبدالواسع نے گرتے پڑتے میٹرک تو کرلیا تھا لیکن نمبر اتنے کم آئے تھے کہ کسی ڈھنگ کے کالج میں داخلہ ہی نہ مل سکا۔ ذہین احمد نے بیٹے کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگالیا لیکن باپ کو بیٹے کو کاروباری اسرار رموز سمجھانے کی نوبت ہی نہ آئی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ذہین احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عبدالواسع ابھی بہت کم عمر تھا۔ رافع تو اس سے بھی تین برس چھوٹا تھا۔ سطوت آرا کا صدمے اور پریشانی سے برا حال تھا۔ ان کے بھائیوں نے اس مشکل وقت میں ان کی بہت ہمت بندھائی لیکن اصل مسئلہ ذہین احمد کے نقصان سے دوچار ہوتے کاروبار کا تھا۔ سطوت آرا کے بھائیوں کو بھی قطعاً کوئی کاروباری سمجھ بوجھ نہ تھی۔ وہ تو اس سلسلے میں صحیح مشورہ تک دینے کے اہل نہ تھے ایسے میں عبدالواسع نے سمجھ داری کا ثبوت دیا۔

"بابا جان کا کاروبار سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں اماں جان! مارکیٹ میں بہت سے گھاک شکاری بابا کے کاروبار پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں، وہ میری کم عمری اور ناتجربہ کاری سے بھی واقف ہیں۔ میں کاروبار کا دیوالیہ نکلنے کے بجائے کسی مناسب پارٹی کو مناسب داموں پر سب کچھ جوں کا توں فروخت کر دیتا ہوں۔ میں گاؤں میں بابا کی زمینیں آباد کرنا چاہتا ہوں اور وہیں مزید انویسٹمنٹ کو ترجیح دوں گا۔ وہ لوگ ہمارے اپنے ہیں اور ہمارے ساتھ مخلص بھی، کم از کم میری کم عمری اور ناتجربہ کاری کا فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ آگے فائدہ یا نقصان ہونا ہماری قسمت۔" عبدالواسع نے دھیمے لیکن مستحکم لہجے میں ماں کو مخاطب کیا۔

سطوت آرا کو بیٹے کی صلاحیتوں پر زیادہ بھروسہ تو نہ تھا مگر اس کی بات سے اتفاق کیے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

وقت نے ثابت کردیا کہ عبدالواسع کا فیصلہ دانشمندی پر مبنی تھا۔ ذہین احمد کے ماموں زاد بھائی جو گاؤں میں ہی بستے تھے۔ ان کا اور ان کی اولاد کا بھرپور تعاون عبدالواسع کو حاصل رہا۔ کاروبار کے بجائے زمینیں آباد کرنے کا تجربہ کامیاب ٹھہرا تھا۔ ذہین احمد کی حادثاتی موت کا صدمہ تو ذہین ہاؤس کے مکین ایک عرصے تک نہ بھلا پائے تھے لیکن عبدالواسع کی حکمت عملی اور حوصلہ مندی نے انہیں مالی دھچکے سے بچالیا تھا۔ سطوت آرا کو بیٹے پر پیار بھی آتا فخر بھی محسوس ہوتا کہ کس طرح اس نے اتنی چھوٹی عمر میں گھر کا بار اپنے کندھوں پر اٹھالیا لیکن بیٹے کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانے کی ان کی خواہش تشنہ رہ گئی تھی۔ اب ان کی امیدوں کا مرکز عبدالرافع تھا۔ انہوں نے عبدالرافع کو بہترین تعلیمی اداروں میں داخلہ دلوایا۔ مہنگے کوچنگ سینٹر میں پڑھنے بھیجا۔ عبدالرافع خود بھی جان توڑ محنت کرتا تھا لیکن حافظہ ساتھ نہ دیتا اور وہ امتحانوں میں حسب توقع کارکردگی نہ دکھا پاتا پھر بھی عبدالرافع نے گرتے پڑتے بی کام کرلیا تھا۔ سطوت آرا کی خواہش تھی کہ وہ ماسٹر بھی کرلے لیکن رافع کے سر میں کاروبار کرنے کا سودا سا گیا تھا۔ ماں اور بھائی نے اسے بہتیرا سمجھایا لیکن وہ کچھ سمجھنے پر تیار نہ تھا۔

"میں بہت قلیل سرمائے سے کام شروع کروں گا اماں، پھر بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر سرمایہ ڈوب گیا تو میں آئندہ کاروبار کرنے کا نام تک نہ لوں گا۔" رافع نے ماں کے ہاتھ تھام کر لجاجت بھرے لہجے میں کہا اور سطوت آرا نے اس یقین کے ساتھ اسے کاروبار کی اجازت دے دی کہ تھوڑا نقصان برداشت کرنے پر بیٹے کو ہمیشہ کے لیے عقل آجائے تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں لیکن پڑھائی میں کند ذہن بیٹا کاروباری

سمجھ بوجھ کے حوالے سے ایسا ہوشیار نکلا کہ سب دنگ رہ گئے۔ محدود پیمانے پر شروع کیا جانے والا کاروبار آغاز میں ہی معقول منافع دینے لگا تھا۔



"رافع' ابا کی طرح کامیاب بزنس مین بنے گا۔ ابا کی صلاحیتیں اسے وارثت میں ملی ہیں۔" عبدالواسع چھوٹے بھائی کی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے بھائی کو مزید سرمایہ فراہم کردیا۔ کاروبار مزید چمک اٹھا تھا۔ سطوت آرا بھی بیٹے کی کامیابی پر خوش تھیں' لیکن دونوں بیٹوں کے حوالے سے انہوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے نہ ہوئے۔ ایک بیٹا زمیندار بن گیا تھا تو دوسرا بیٹا بزنس مین' جبکہ ان کے بھانجوں' بھتیجوں میں کوئی قابل ڈاکٹر تھا' کوئی انجینئر' کوئی پروفیسر تو کوئی سول سرونٹ۔ سب کتنے ہونہار اور قابل تھے' پڑھائی نے ان کی شخصیت کو کیسا وقار عطا کردیا تھا۔ پیسے کے اعتبار سے ان کے دونوں بیٹے بھی اپنے ننھیالی کزنز کے ہم پلہ تھے لیکن سطوت آرا کے نزدیک پیسہ ہی تو سب کچھ نہ تھا۔ کاش ان کا کوئی بیٹا پڑھائی' لکھائی کے میدان میں بھی آگے نکلتا۔ ان کے بھانجوں کی طرح پڑھ لکھ کر قابل افسر بنتا تو سطوت آرا کا سر بھی فخر سے بلند ہوجاتا' لیکن اس حوالے سے ان کی تمام خواہشیں تشنہ رہ گئی تھیں' مزید ستم یہ ہوا کہ عبدالواسع نے اپنے لیے دیہاتی پس منظر رکھنے والی واجبی پڑھی لکھی کشور سلطانہ کو شریک حیات کے طور پر منتخب کرلیا۔ سطوت آرا ان کے فیصلے پر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"میں تو تمہارے لیے کسی پڑھے لکھے گھرانے کی سلجھی ہوئی لڑکی ڈھونڈ رہی تھی۔ تم نے لڑکی بھی خود ہی منتخب کرلی۔" صدمے سے سطوت آرا کا برا حال تھا۔

"کشور بھی بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے اماں۔ ہاں گھرانہ اتنا پڑھا لکھا نہیں لیکن وہ لوگ بہت وضع دار اور ملنسار ہیں۔ آپ تو اخلاق چچا کی فیملی کو اچھی طرح جانتی ہیں' بابا کتنا عزیز رکھتے تھے انہیں اور میں نے آپ کے منہ سے بھی ان لوگوں کی ہمیشہ تعریفیں ہی سنی ہیں۔" عبدالواسع نے ماں کو مخاطب کیا۔ اخلاق صاحب' ذہین صاحب کے فرسٹ کزن تھے جب سے عبدالواسع نے زمینداری شروع کی تھی' اخلاق صاحب کی فیملی نے عبدالواسع کی ہر ممکن طریقے سے مدد کی تھی۔ کشور سلطانہ' اخلاق صاحب کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ خوب صورت اور بھولی بھالی کشور کب عبدالواسع کے دل میں اتر گئیں انہیں خود بھی پتا نہ چلا لیکن جب اماں جان نے ان کے لیے لڑکی ڈھونڈ مہم کا آغاز کیا تو چھم سے کشور سلطانہ کا تصور عبدالواسع کے ذہن کے پردے پر لہرا گیا۔ انہوں نے فوراً" ماں کو اپنی پسندیدگی سے آگاہ کردیا تھا۔

"اگر گاؤں سے تمہارے لیے لڑکی بیاہ لائی تو تم ہمیشہ کے لیے گاؤں کے ہی ہو کر رہ جاؤ گے۔ میں تو پہلے ہی تمہاری شکل دیکھنے کو ترستی ہوں۔" سطوت آرا آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

"میں جہاں بھی رہوں گا اماں' آپ کی بہو آپ کے پاس رہے گی۔" عبدالواسع نے ماں کے ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

"میرا ارادہ تھا کہ تمہارے لیے نگہت کی کوئی بیٹی مانگوں گی۔ کتنی خوب صورت اور پڑھی لکھی بچیاں ہیں۔" انہوں نے اپنی بھانجیوں کا تذکرہ کیا۔

"میرے لیے کشور ہی مناسب رہے گی اماں' پھر میں کون سا زیادہ پڑھا لکھا یا عالم فاضل ہوں' معمولی سا زمیندار ہی تو ہوں۔ نگہت خالہ کی کوئی سی بھی بیٹی میرے ساتھ گزارہ نہ کرپائے گی۔" عبدالواسع نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ سطوت آرا بیٹے سے مزید بحث نہ کرپائیں۔ بوجھل دل کے ساتھ کشور سلطانہ کو بیاہ لائیں۔ کشور اچھی بیوی اور اچھی بہو ثابت ہوئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ انہوں نے سطوت آرا کے دل میں جگہ بنا ہی لی' لیکن سطوت آرا کے دل میں پڑھی لکھی اور رکھ رکھاؤ والی شہری بہو کی خواہش اب بھی موجود تھی۔ رافع کا کاروبار جم گیا تو انہوں نے رافع کی شادی کرنے کی ٹھانی۔ رافع نے سعادت مند اولاد بن کر شادی کے فیصلے کا اختیار ماں کو سونپ رکھا

تھا۔ سطوت آرا نے رافع کے لیے اپنی چھوٹی بہن نگہت سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔

"آپ کی خواہش سر آنکھوں پر آپا! لیکن نائلہ کو بھائی جان' آذر کے لیے پہلے ہی مانگ چکے ہیں اور شمائلہ اپنے کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ ہے۔ اچھی فیملی کا لڑکا ہے' پڑھا لکھا اور قابل ہے۔ شمائلہ کے ابو بھی اس رشتے پر معترض نہیں' ظاہر ہے زندگیاں بچوں نے گزارنی ہیں۔ دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہے' پروفیشن بھی ایک ہے اسی لیے ہم....."

"ناجیہ کے بارے میں کیا سوچا؟" سطوت آرا نے بہن کی بات کاٹتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔ ناجیہ نگہت کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

"آپا! آپ میری بڑی بہن ہیں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کو دکھ پہنچانا نہیں' لیکن آپ تو جانتی ہیں نائلہ' شمائلہ کے ابو تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اور رافع بلاشبہ مجھے بہت پیارا ہے لیکن اس کی تعلیم....." نگہت نے شرمندہ سے لہجے میں بڑی بہن کی توجہ اس حقیقت کی جانب دلائی جس کو وہ دیدہ و دانستہ نظرانداز کیے بیٹھی تھیں۔

"جیسی تم لوگوں کی خوشی۔" بہت ملول اور دلگرفتہ ہوکر وہ بہن کے پاس سے آئی تھیں۔ لیکن اب ان کی زندگی کا یہ ہی مقصد رہ گیا تھا کہ وہ عبدالرافع کے لیے خاندان سے باہر کی کوئی بہت قابل اور پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈیں۔ رشتہ کروانے والی ماسیوں کی خدمات حاصل کرکے انہوں نے من پسند بہو ڈھونڈ ہی لی تھی۔ نغمانہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ گرلز کالج میں پڑھاتی تھیں۔ چھ بہن بھائیوں میں نغمانہ کا دوسرا نمبر تھا۔ متوسط والدین کی خواہش تھی کہ جلد از جلد بیٹی کے ہاتھ پیلے کرکے اس فرض سے سبکدوش ہوجائیں جبکہ نغمانہ کے عزائم بہت بلند تھے' وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھیں۔ ذہانت خداداد تھی لیکن والدین اپنی بساط کے مطابق پڑھا چکے تھے انہوں نے دوسرے بچوں کے متعلق بھی سوچنا تھا۔ سطوت آرا' رافع کے لیے نغمانہ کا رشتہ مانگنے گئیں تو نغمانہ کے والدین کو نستعلیق لہجے میں بولنے والی یہ پروقار سی خاتون' بہت پسند آئیں۔

"ہم سفید پوش لوگ ہیں' بہن۔ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کردیا ہے' یہ فخر ہی ہماری پونجی ہے اور یہ ہی ہماری خواہش تھی کہ ہماری بچیاں سلجھے ہوئے پڑھے لکھے خاندانوں میں بیاہی جائیں' آپ کی آمد ہمارے لیے باعث اعزاز ہے۔" نغمانہ کے والد شائستگی سے سطوت آرا سے مخاطب ہوئے۔

"میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی بھائی صاحب' میرا بیٹا کوئی بہت زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ اس نے محض بی کام کر رکھا ہے لیکن ماشاء اللہ چلتا ہوا کاروبار ہے اس کا اور رافع کے پاس بھلے سے کوئی بڑی ڈگری نہیں لیکن آپ ایک بار اس سے ملیں تو سہی۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا بیٹا خوب صورت' کھاتا کماتا' شریف النفس۔ ایسا لڑکا آپ کو ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔" انہوں نے نغمانہ کے والد کو مخاطب کیا۔ حسب توقع وہ رافع کی تعلیمی قابلیت جان کر کچھ متذبذب نظر آئے تھے۔ قریب تھا کہ سطوت آرا یہاں سے بھی مایوس لوٹ آتیں' لیکن نغمانہ کی والدہ نے رافع کا رشتہ قبول کرتے ہوئے ان کا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔

"ہمیں یہ رشتہ منظور ہے لیکن نغمانہ شادی کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا چاہتی ہے' ڈاکٹریٹ کرنا اس کا جنون ہے اگر آپ....."

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ نغمانہ پر شادی کے بعد کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہوگی۔ وہ ڈاکٹریٹ بھی کرے گی اور اپنا کیریئر بھی بنائے گی' میں ہر قدم پر اس کا ساتھ دوں گی۔" سطوت آرا نے انہیں یقین دہانی کروائی تھی اور نغمانہ اور رافع کی شادی کے بعد انہوں نے یہ قول نبھایا بھی تھا۔ شادی کے بعد نغمانہ کو گورنمنٹ جاب مل گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پی ایچ ڈی بھی کررہی تھیں۔ سطوت آرا نے نغمانہ پر گھریلو ذمہ داریوں کا بالکل بوجھ نہ ڈالا تھا۔ گھر کی ذمہ داریاں

کشور بطریق احسن نبھارہی تھیں۔ یہ شفیق ساس اور پرخلوص جٹھانی کا ہی تعاون تھا کہ نغمانہ نے اپنا ڈاکٹریٹ مکمل کرلیا تھا۔ اللہ نے منابل اور عرشیہ کی صورت میں انہیں اپنی رحمتوں سے بھی نوازدیا تھا۔



عبدالواسع اور کشور سلطانہ کے تین بچے تھے۔ تابش بڑا بیٹا تھا جبکہ جیا اور فریال اس سے چھوٹی تھیں۔ عبدالواسع نے بیوی' بچوں کو ماں کے پاس شہر میں ہی رکھا ہوا تھا جبکہ وہ اپنا زیادہ وقت زمینوں پر ہی گزارتے تھے۔ پندرہ دن بعد دو چار روز کے لیے شہر آتے اور پھر دوبارہ گاؤں چلے جاتے۔ "ذہین ہاؤس" اب رافع اور واسع کے بچوں کی چہکاروں سے گونجتا تھا۔ سطوت آرا اپنے آشیانے کی رونقیں دیکھ کرجی ہی جی میں خوب نہال ہوتیں لیکن پھر جیسے اس ہنستے بستے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی۔ شادی کے دس برس بعد نغمانہ نے رافع سے علیحدگی کا مطالبہ کردیا۔ نغمانہ اب کیمسٹری کی پروفیسر تھیں اور علیحدگی کی وجہ بتانے کے لیے انہوں نے کیمسٹری کی اصطلاح ہی استعمال کی تھی۔

"دس برسوں سے میں رافع کے ساتھ ایک سمجھوتے بھری زندگی گزار رہی ہوں حالانکہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہماری مینٹل کیمسٹری بالکل نہیں ملتی' پھر بھی میں نے خود کو کسی انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھا لیکن اب میں یہ ان چاہا بندھن مزید نہیں نبھاسکتی۔ رافع یا تو مجھے طلاق دے دیں ورنہ میں خلع کے لیے کیس فائل کردوں گی۔" سرد اور دوٹوک انداز میں اعلان کرتی یہ نغمانہ ہی تھیں یا کوئی اور۔ سطوت آرا کو اپنی بصارت پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ اس گھر نے نغمانہ کو کیا کچھ نہ دیا تھا۔ پیار' محبت' عزت' احترام' مان' مرتبہ اور سب سے بڑھ کر اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی آزادی' نہ صرف آزادی بلکہ ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے بھرپور تعاون۔ یہ سب کچھ نغمانہ دس برس تک اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہیں اور اب وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ ان چاہا بندھن مزید نہیں نبھاسکتیں۔

سطوت آرا اب گزرے ماہ وسال پر نظر دوڑاتیں تو اندازہ ہوتا کہ نغمانہ نے نہ کبھی اس گھر کو اپنا مانا تھا نہ رافع کو۔ وہ تو آج تک مہمانوں کی طرح اس گھر میں زندگی بسر کرتی آئی تھیں۔ رافع کے ساتھ بھی ان کا انداز بہت لیا دیا سا ہوتا تھا۔ وہ نغمانہ کے گریز بھرے رویے کو پڑھی لکھی بہو کے پُروقار طور طریقے قرار دیتی رہیں' کتنی بھول ہوئی تھی ان سے۔ پتھر کو ہیرا سمجھتی رہیں۔ شاید نغمانہ کی بھاری بھرکم ڈگریوں نے انہیں اتنا مرعوب کیے رکھا کہ وہ آنکھوں دیکھی حقیقتوں سے صرف نظر کرتی رہیں۔ رافع نے اپنے آپ کو کاروبار میں اس بری طرح الجھالیا تھا کہ وہ گھر کو بالکل ٹائم ہی نہ دیتا تھا اور جب سطوت آرا بیٹے کو گھرکتی تھیں تو کیسے رافع کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی' وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ بات کو مزاح کا رنگ دے کر ٹال جاتا تھا۔ شاید وہ ماں کو شرمندہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے جو شریک حیات منتخب کی تھی اس کی زندگی کے بلند وبالا عزائم میں رافع کبھی بھی اور کہیں بھی نہ تھا۔ جو حقیقت بیوی کے رویے سے رافع شادی کے ابتدائی دس دنوں میں جان گیا تھا وہ بہو کی زبانی جاننے میں سطوت آرا کو دس برس لگے تھے۔ نغمانہ کے شریف النفس والدین بیٹی کے مطالبے پر شرمندہ تھے' وہ سطوت آرا اور رافع کو یقین دلا رہے تھے کہ وہ نغمانہ کو سمجھا بجھا کر واپس ذہین ہاؤس بھیج دیں گے۔

نغمانہ کے لیے اگرچہ سطوت آرا کے دل میں اب کوئی گنجائش نہ تھی لیکن' پھر بھی ان کی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح رافع اور نغمانہ کے درمیان مصالحت ہوجائے۔ نغمانہ طلاق کا مطالبہ واپس لے لیں تو رافع بچیوں کی خاطر نغمانہ کو معاف کرکے گھر واپس آنے دیں۔ شاید جگ ہنسائی کے خوف سے رافع مصالحت کا یہ کڑوا گھونٹ پی بھی لیتے' لیکن نغمانہ کی طرف سے خلع کا نوٹس مل گیا۔ نغمانہ نے اپنے

والدین کا گھر بھی چھوڑ دیا تھا' وہ ہاسٹل میں رہنے لگی تھیں۔

سننے میں آیا تھا کہ وہ اپنے کولیگ' پروفیسر انیق ہمدانی کے ساتھ دن کا بیشتر وقت گزارنے لگی ہیں اور جب یہ سنی سنائی بات رافع نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو انہیں فیصلے پر پہنچنے میں مزید دیر نہ لگی۔ ہاں انہوں نے نغمانہ سے آخری بار رابطہ کرکے انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ طلاق کے بعد وہ بچیوں پر کسی قسم کا کوئی حق نہ رکھیں گی اور اس بات کی انہیں تحریری ضمانت دینی ہوگی۔ نغمانہ کی زندگی کے نئے سیٹ اپ میں بیٹیوں کی کوئی گنجائش تھی بھی نہیں' سو انہیں رافع کی شرط ماننے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ ماں' باپ کی علیحدگی کے وقت مناہل آٹھ برس جبکہ عرشیہ پونے سات برس کی تھی۔ ماں کے ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں تائی کے زیادہ قریب تھیں۔ نغمانہ کے پاس بچیوں کے لاڈ اٹھانے یا ضدیں اور فرمائشیں پورے کرنے کا وقت ہی کب ہوتا تھا۔ وہ عجیب بے حس قسم کی عورت تھیں۔ شاید والدین نے ان کی مرضی کے خلاف جو رشتہ جوڑا تھا وہ دل سے کبھی اس رشتے کو قبول ہی نہ کرپائیں۔ اپنی کوکھ سے جنی بچیاں بھی ان کے لیے عبدالرافع کی بیٹیاں تھیں۔ زندگی نے جیسے ہی انہیں موقع دیا' انہوں نے زبردستی جوڑے گئے اس بندھن سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔

نغمانہ نے تو خوشی خوشی پروفیسر انیق کے ہمراہ زندگی کا نیا سفر شروع کردیا تھا لیکن ذہین ہاؤس میں سوگ کا سماں تھا۔ اس کے مکین ایک دوسرے سے نگاہیں ملاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ نغمانہ کے عمل سے رافع کی انا اور غیرت پر کاری ضرب پڑی تھی۔ وہ رات بھر جاگتے اور سگریٹیں پھونکتے رہتے۔ کاروبار سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی۔ سطوت آرا بیٹے کی اجڑی حالت دیکھ کر ازحد پریشان تھیں۔ پھر رافع نے باہر جانے کا اعلان کرکے سب کو حیران کردیا۔ رافع کا کوئی دوست دبئی میں کاروبار شروع کررہا تھا' اس نے رافع کو بھی شراکت کی دعوت دی۔ رافع نے گھر والوں سے مشورہ کیے بغیر پاکستان میں کاروبار وائنڈ اپ کردیا اور اس سرمائے سے دوست کی شراکت داری میں دبئی میں چھوٹے سے بزنس پروجیکٹ کا آغاز کردیا۔ ناکام ازدواجی زندگی سے قطع نظر' رافع قسمت کا دھنی تھا۔ تجربہ کامیاب ٹھہرا تھا اور اب دبئی میں موجود رافع کا دوست اسے دبئی بلوا رہا تھا کہ اکیلے کام سنبھالنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ رافع نے اس بار سطوت آرا سے اجازت نہ مانگی تھی بلکہ انہیں اپنے دبئی سیٹل ہونے کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔

"عرشیہ اور مناہل کا کیا سوچا۔ ماں کے بعد کیا وہ باپ کی شفقت سے بھی محروم ہوجائیں۔" سطوت آرا بیٹے کے پردیس جانے کے فیصلے سے سخت پریشان تھیں۔

"دوسرے ملک جارہا ہوں اماں' دوسری دنیا تو نہیں۔" رافع بے زاری سے گویا ہوئے۔ سطوت آرا نے دہل کر استغفار پڑھا۔

"اور دبئی کون سا دور ہے اماں۔ نام کا پردیس ہے۔ آنا جانا کچھ مشکل نہیں' میں جلد چکر لگایا کروں گا۔" رافع نے ماں کو یقین دلایا۔

"پھر بھی رافع۔" سطوت آرا اب بھی متذبذب تھیں۔

"خدا کے لیے اماں مجھے یہاں سے نکلنے دیں' میں یہاں گھر میں کب تک چھپ کر بیٹھا رہوں۔ نغمانہ نے مجھے دنیا سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ آپ سے بہتر میری ذہنی کیفیت کون سمجھ سکتا ہے۔" رافع تھکے ماندے لہجے میں ماں سے مخاطب ہوئے۔

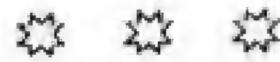
"میں تو بچیوں کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" سطوت آرا آزردگی سے بولی تھیں۔

"بچیوں کے پاس آپ ہیں' کشور بھابھی اور واسع بھائی ہیں پہلے بھی میں کون سا بچیوں کو زیادہ ٹائم دے پاتا تھا۔ جس طرح انہیں ماں کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا' وہ میری غیر موجودگی کی بھی عادی ہوجائیں گی۔" رافع نے لاپروا سا انداز اختیار کرنا چاہا۔

"عرشیہ کی مجھے فکر نہیں۔ چھوٹی ہے پھر من موجی

سی ہے' اس کا سارا دھیان کھیل کود کی طرف ہے' لیکن مناہل بہت حساس ہے۔ وہ اس چھوٹی عمر میں بھی بڑی بڑی باتیں سوچتی ہے۔ تمہیں کیا پتا نعمانہ کے گھر چھوڑنے کے فیصلے پر وہ کتنے دن تک ڈسٹرب رہی تھی' میں نے بہت مشکل سے اسے نارمل کیا ہے اور اب تم بھی بیٹیوں سے دور جا رہے ہو۔"

"آپ ہیں نا اماں۔ مجھے یقین ہے اس بار بھی مناہل کو سمجھا لیں گی۔" رافع دھیرے سے کہتے ہوئے ماں کے پاس سے اٹھ گئے' لیکن ان کی آنکھوں کی چمکتی نمی سطوت آرا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی۔ ان کا دل مزید بوجھل ہو گیا اور پھر رافع چلے گئے تھے۔



مناہل اور عرشیہ دادی اور تایا' تائی کے سایہ' عافیت میں پروان چڑھنے لگیں۔ کشور بیگم ان دونوں کو اپنے بچوں جتنا ہی چاہتی تھیں۔ پانچوں کزنز میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ تابش سب سے بڑا تھا لیکن وہ اپنی بڑائی کا کبھی رعب نہ جماتا تھا۔ بہت ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج پایا تھا اس نے کشور بیگم نے اکلوتے بیٹے کو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی باور کر دیا تھا کہ مناہل یا عرشیہ میں سے کسی ایک کو ہی اس کی دلہن بننا ہے۔

"مناہل تو میرے لیے بالکل جیا اور فریال جیسی ہے۔" تابش ماں کی بات سن کر گھبرا گیا تھا۔

"تو بس ٹھیک ہے' میرا اپنا خیال بھی عرشیہ کی طرف تھا۔ وہ میری سب سے بھولی بیٹی ہے' اس کے لیے تمہارا ساتھ ہی مناسب رہے گا۔" کشور سلطانہ نے مطمئن انداز میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

"عرشیہ مجھ سے پانچ برس چھوٹی ہے لیکن......" تابش نے پرسوچ انداز میں بات ادھوری چھوڑی۔

"کیا لیکن......؟" کشور ذرا پریشان ہوئیں۔ تابش نے ماں کا چہرہ دیکھا پھر مسکرا دیا۔

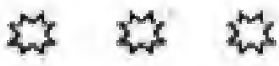
"عرشیہ اچھی باؤلنگ کرواتی ہے۔ کرکٹ کی سمجھ بوجھ بھی ہے اور میرے علاوہ پورے گھر میں کرکٹ کی صرف وہ ایک دیوانی ہے' سو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اچھا فیصلہ ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" تابش نے مسکراتے ہوئے ماں کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ کشور سلطانہ نے شوہر اور ساس کو بھی یہ خوشخبری سنا دی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ لڑکیوں تک یہ —— خبر نہ پہنچتی سو باقاعدہ منگنی نہ ہوتے ہوئے بھی اس روز سے عرشیہ' تابش کی منگیتر بن گئی تھی۔ جیا اور فریال بھی اس فیصلے کے بارے میں جان کر بہت خوش ہوئی تھیں لیکن جب عرشیہ کی حماقتوں کے سنگین نتائج ان چاروں کو بھگتنے پڑتے تو مصنوعی تشویش کے عالم میں دونوں بہنیں سر پکڑ کر تابش کے مستقبل کے بارے میں خوب پریشانی کا اظہار بھی کرتیں۔

سطوت آرا کی شدید خواہش تھی کہ ان کے پوتے' پوتیاں پڑھائی' لکھائی کے میدان میں خاندان کا نام روشن کریں' لیکن وہ "ذہین ہاؤس" کے بچے تھے۔ ذہنی اعتبار سے اپنے باپ' دادا پر ہی گئے تھے۔ پڑھائی کے علاوہ ہر چیز میں ان کا دماغ چلتا تھا۔ تابش تو پیدائشی کھلاڑی تھا۔ قلم چلانا بعد میں آیا' بلا گھمانا پہلے آ گیا تھا۔ پہلے اسکول اور پھر کالج کی سطح پر کرکٹ کھیل کر اتنا نام کمایا کہ اب وہ ایک جانا پہچانا فرسٹ کلاس کرکٹر تھا۔ شہرت کے ساتھ ساتھ اب وہ ٹھیک ٹھاک پیسہ بھی کما رہا تھا۔ ماں' باپ مطمئن' بہنیں خوش۔ منگیتر بے تحاشا خوش رہیں دادی تو انہوں نے بھی آخر کار پوتے کے کھیل سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کچھ بھی تھا اسی کھیل کے طفیل بینک میں نوکری تو ملی ہوئی تھی نا۔

پوتیوں میں مناہل' عرشیہ اور فریال میں سے کسی کا بھی ذہن بہت اچھا نہ تھا۔ مناہل دل جمعی سے پڑھنے کی کوشش کرتی مگر حافظہ ساتھ نہ دیتا' جو یاد کرتی بھول جاتی۔ فریال کا حافظہ اچھا تھا تو لکھائی بے حد خراب۔ وہ اپنا لکھا ہی دوبارہ نہ پڑھ پاتی تھی اور عرشیہ کا تو نہ حافظہ اچھا تھا اور نہ ہی لکھائی اسی لیے وہ کتابیں پڑھنے کا خاص تردد بھی نہ کرتی تھی۔ پیپرز میں کوئی نہ کوئی سہیلی مدد کر ہی دیتی تھی۔ گزارے لائق نمبر آ جاتے اور اگلی

کلاس میں داخلہ مل جاتا۔ ہاں جیا ان تینوں سے مختلف تھی۔ بے حد ذہین نہ سہی، مگر وہ ذہین ہاؤس کی اگلی پچھلی نسلوں میں سب سے ذہین لڑکی تصور کی جاتی تھی۔ فورتھ کلاس میں تھرڈ پوزیشن آنے پر جیا کو جو ٹرافی ملی تھی، وہ آج بھی سطوت آرا نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ پانچویں جماعت تک جیا کا شمار اپنی کلاس کی پانچ بہترین اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ آٹھویں تک وہ پہلی دس لڑکیوں میں شامل ہونے لگی۔ نویں، دسویں میں سطوت آرا کی بھرپور کوششوں کے باوجود رزلٹ کے اعتبار سے وہ اپنی کلاس میں چودھویں نمبر پر آئی تھی۔ تنزلی کا یہ سفر جاری و ساری رہا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ فریال، مناہل اور عرشیہ کے ساتھ جیا کی شکایت کرنے کے لیے پرنسپل مسلسل ان کے پیرنٹس کو بلوا رہی تھیں۔ عرشیہ کو "امی جی" بنانے کا خیال بھی جیا کے زرخیز ذہن کی ہی پیداوار تھا۔ ڈرامے کا ڈراپ سین بہرحال بہت بھیانک تھا۔ اگر نانا ماموں نہ آتے تو جانے کتنے دن تک چاروں کو بڑی اماں کا عتاب سہنا پڑتا۔

دو برس پہلے عبدالواسع کو معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ سطوت آرا نے کشور سلطانہ کو شوہر کے ساتھ گاؤں میں ہی قیام کرنے کا حکم سنا دیا تھا۔ پندرہ بیس دن بعد واسع اور کشور شہر کا چکر لگاتے تھے۔ بچیاں روتے بسورتے دادی کے مظالم کی داستان سناتیں تو سطوت آرا کے پاس بھی پوتیوں کی شکایتوں کا ایک انبار موجود ہوتا۔ واسع اور کشور فریقین کو سمجھا بجھا کر واپس گاؤں سدھار جاتے۔ تابش مختلف ٹورنامنٹس میں شرکت کی غرض سے شہر سے باہر جاتا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں "ذہین ہاؤس" کا امن و سکون برقرار رہتا۔ دادی کا غصہ بھگانے کے لیے تابش کے پاس ایک سو ایک ترکیبیں تھیں۔ لڑکیاں آج کل تابش کی غیر موجودگی شدت سے محسوس کر رہی تھیں جس روز نانا ماموں اپنے پوتے کے ہمراہ پہنچے اسی رات تابش بھی واپس لوٹ آیا تھا۔ اب بہت دن تک راوی نے چین ہی چین لکھنا تھا۔ اس رات جیا، فریال، مناہل اور عرشیہ کو بہت گہری اور پرسکون نیند آئی تھی۔



"یہ جو نانا ماموں کا پوتا ہے۔ اچھی خاصی پرسنالٹی ہے اس کی اور لہجہ اور آواز بھی۔ بہت شاندار ہے کل جب بڑی اماں کے پوچھنے پر اپنی ڈگریوں کی تفصیل بتا رہا تھا تو سچ میں تو بہت امپریس ہوئی اس سے۔" عرشیہ برتن دھوتے ہوئے فریال سے مخاطب ہوئی۔ فریال اس وقت چائے بنا رہی تھی۔

"ہاں بندہ تو واقعی شاندار ہے اور پتا ہے وہ اپنے آفس کے کام سے ہمارے شہر آرہا تھا، نانا ماموں کو پتا چلا تو وہ بھی ساتھ آگئے اور اچھا ہوا جو نانا ماموں چلے آئے وہ نہ آتے تو سوچو کل کیا بنتا ہمارا۔" فریال کو گزرا کل یاد کرکے نئے سرے سے جھرجھری آگئی۔

"بڑی اماں پوچھ رہی ہیں تم لوگ چائے بنا رہی ہو یا پائے۔" اسی لمحے جیا نے کچن میں جھانکا تھا۔

"بس لا ہی رہی ہوں جا کر بتا دو بڑی اماں کو۔ دو منٹ کی دیر سویر بھی برداشت نہیں ہوتی۔" فریال بڑبڑاتے ہوئے ٹرے میں چائے کے مگ سیٹ کرنے لگی۔ اتنے میں عرشیہ کے بھی برتن دھل چکے تھے۔ وہ دونوں اکٹھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ بڑی اماں، نانا ماموں ابتہاج، تابش اور جیا سب کا دھیان ٹی وی کی طرف تھا کرنٹ افیئرز کے پروگرام میں کوئی اہم معاملہ ڈسکس ہو رہا تھا سو سب کا انہماک دیدنی تھا۔ عرشیہ بھی جیا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ فریال سب کو چائے سرو کرنے لگی تھی۔ "ذہین ہاؤس" کے مکین جب تک کھانے کے بعد چائے نوش نہ فرماتے ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا۔ اس وقت بھی ڈنر کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ سب نے اپنے کپ اٹھا لیے تھے مگر ٹرے ابتہاج کے سامنے آئی تو اس نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔

"نو تھینکس میں رات کو چائے نہیں پیتا۔"

"پینی بھی نہیں چاہیے ابتہاج بھائی، نیند اڑ جاتی ہے۔" عرشیہ نے چائے سے لبالب بھرا مگ ہونٹوں

سے لگاتے ہوئے بہت متانت سے ابتہاج کو مخاطب کیا تھا۔ ابتہاج محض مسکرا دیا تھا۔ نانا ماموں کو ہنسی آگئی۔
"تکلف کیوں برت رہے ہو یار۔ بتا دو کہ کافی پیتا ہوں۔" انہوں نے پوتے کو مخاطب کیا۔
"ارے تو پہلے بتانا تھا نا۔ اب تک تو کافی بن بھی چکی ہوتی۔" بڑی اماں ابتہاج کے تکلف پر ذرا خفا ہوئیں پھر پوتیوں پر نگاہ ڈالی۔ تینوں میں سے کسی نے بھی نانا ماموں کی بات سننے کے باوجود کافی بنانے کے لیے اپنی خدمات پیش نہیں کی تھیں۔ مزے سے اپنی اپنی چائے کی چسکیاں لینے میں مصروف تھیں۔ جیا تو موسمی فلو کی لپیٹ میں تھی اور اس نے کچن کے کاموں سے رضاکارانہ دستبرداری اختیار کر رکھی تھی۔ فریال سب کی چائے بنا چکی تھی اس کا دوبارہ کچن میں گھسنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ سطوت آرا نے عرشیہ کو اٹھانا چاہا تھا۔
"جاؤ عرشیہ 'بھائی کے لیے کافی بنا کر لاؤ۔"
"عرشیہ جو کافی بنا کر لائے گی وہ کافی بد مزہ ہو گی' اسے پینے کے لیے خاصی ہمت درکار ہو گی۔" تابش مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ عرشیہ نے تابش کی بات پر اظہار ناراضی کے بجائے اسے نہایت ممنونیت سے دیکھا تھا۔
"مناہل کہاں ہے۔ اس سے کہو وہ کافی بنا کر لائے۔" بڑی اماں نے اپنی تین عدد نکمی پوتیوں کو خفگی سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔
"ہاں مناہل واقعی مزے کی کافی بناتی ہے' میں جا کر کہتی ہوں اس سے۔" بڑی اماں کی تیکھی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے عرشیہ پھرتی سے اٹھی تھی' تین چار منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔
"مناہل کو جگا کر آئی ہوں۔ ابھی بنا کر لا رہی ہے کافی۔"
"مجھے کافی کی کوئی خاص طلب نہیں تھی اگر مناہل سو رہی تھیں تو آپ کو انہیں جگانا نہیں چاہیے تھا۔" ابتہاج جی بھر کر شرمندہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے ناحق کسی کو زحمت اٹھانی پڑے' یہ اسے کب گوارا تھا۔

"اب تو اس نے جاگنا ہی تھا ابتہاج بھائی۔ نہ تو اس نے رات کا کھانا کھایا تھا نہ عشاء کی نماز پڑھی تھی' وہ تو ذرا سر میں درد ہو رہا تھا تو مغرب پڑھ کر بستر میں گھس گئی تھی پھر آنکھ لگ گئی ہو گی۔" اس بار فریال نے آگاہ کیا تھا۔ ابتہاج چپ رہا مگر دل ہی دل میں وہ خوب خفت محسوس کر رہا تھا۔ ذرا دیر بعد مناہل ٹرے میں کافی کا مگ سجائے چلی آئی تھی۔ گلابی آنکھوں میں اب بھی نیند کا خمار باقی تھا۔ خاموشی سے ٹرے بڑی اماں کے آگے کی تھی۔
"مجھے نہیں ابتہاج کو دو۔" سطوت آرا نے اسے مخاطب کیا۔ عرشیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
"میں نے آپ کا نام لے کر ہی جگایا تھا ورنہ اتنے آرام سے بستر کی جان کب چھوڑتی یہ۔" عرشیہ کے کہنے پر مناہل خفیف سی ہو گئی تھی۔ ابتہاج نے دلچسپی سے اس لڑکی کے چہرے پر پھیلنے والے شرمندگی کے رنگ دیکھے تھے۔ وہ بلاوجہ شرمندہ ہو رہی تھی جبکہ عرشیہ اب بھی مزے سے مسکرا رہی تھی۔
"سوری' میری وجہ سے آپ کی نیند ڈسٹرب ہوئی۔" کافی کا مگ تھام کر ابتہاج نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔
"کہا تو ہے ابتہاج بھائی مناہل نے اٹھنا ہی تھا۔" اس بار بھی فریال کی طرف سے جواب آیا تھا۔ مناہل چپ چاپ واپس پلٹ گئی تھی۔ اس کو واقعی ابھی کھانا بھی کھانا تھا اور نماز بھی پڑھنی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے سب نفوس ٹی وی کی جانب ہی متوجہ تھے لیکن کافی پیتے ابتہاج کا دھیان جانے کیوں کافی بنا کر لانے والی کی جانب ہی لگا رہا۔ اسے کافی تو اچھی لگی سو لگی' کافی بنانے والی بھی کافی اچھی لگی تھی۔



نانا ماموں اور ابتہاج واپس لوٹ گئے تھے۔ تابش ایک بار پھر کسی ٹورنامنٹ میں شرکت کی غرض سے دوسرے شہر چلا گیا تھا۔ اب ذہین ہاؤس میں بڑی اماں تھیں اور ان کی چار عدد نکمی پوتیاں۔ بڑی اماں اب

پوتیوں کے نکتے پن پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھیں۔ چاروں کے لیے سخت کیرٹیکر کا بندوبست کردیا گیا تھا۔ چاروں اب واقعی دل لگا کر پڑھنے میں مصروف تھیں۔ پھر ان ہی دنوں رافع اپنی بیگم کو لے کر پاکستان چھٹیاں گزارنے آگئے۔

پانچ برس پیشتر رافع نے اپنے پارٹنر دوست کی بیوہ بہن سے شادی کرلی تھی۔ سطوت آرا نے یہ خبر پوتیوں سے چھپائی تھی مبادا ان کے دل ٹوٹ جائیں۔ بچیاں اتنی نادان نہ تھیں انہیں اس شادی کی سن گن مل گئی تھی۔ رافع اس برس معمول کے مطابق پاکستان نہ آئے پھر ایک دن عرشیہ نے ہی ان سے فون پر کہہ دیا تھا۔

"آپ کی دوسری شادی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں پاپا۔ چاہیں تو آپ اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے آئیں لیکن پلیز پاکستان کا چکر تو لگالیں۔ ہم آپ کو بہت مس کررہے ہیں۔" رافع شرمندہ سے انداز میں بیٹی کو وضاحت دینے لگے تھے اور پھر چند دنوں بعد وہ بیٹیوں سے ملنے آگئے تھے' لیکن نئی بیوی ان کے ہمراہ نہ تھی اور آئندہ آنے والے برسوں میں بھی ان کا یہ معمول برقرار رہا۔ وہ بیوی کو دبئی ہی چھوڑ آتے اور ایک مہینہ پاکستان میں قیام کے بعد واپس دبئی سدھار جاتے۔ اس بار جانے ان کے دل میں کیا سمائی کہ وہ مریم کو بھی اپنے ہمراہ پاکستان لے آئے۔ سطوت آرا نے بہو کا پرتپاک استقبال کیا۔ گاؤں سے کشور بیگم اور عبدالواسع بھی بھائی' بھاوج کا استقبال کرنے پہنچ گئے تھے۔ لڑکیاں مریم سے ملنے سے پہلے ڈبل مائنڈڈ تھیں کہ آیا ان کا استقبال کیا جائے یا انہیں ٹف ٹائم دیا جائے لیکن مریم سے ملنے کے بعد وہ پرسکون ہو گئی تھیں۔ چالیس سالہ مریم جو دیکھنے میں اپنی عمر سے چند برس چھوٹی ہی لگتی تھیں بہت دوستانہ مزاج کی حامل خاتون ثابت ہوئیں اور "تحفہ دینے سے محبت بڑھتی ہے" والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہ اپنے ہمراہ تحفوں کا انبار لائی تھیں جس پر خلوص انداز میں یہ تحفے سب کو پیش کیے گئے اس انداز نے سب کا دل ہی موہ لیا۔

"مریم آنٹی کتنی اچھی ہیں نا کاش وہ پاپا کو پہلی شادی سے پہلے مل جاتیں تو وہ ہماری مما ہوتیں۔" عرشیہ کو آج کل یہ ہی قلق تھا۔

"مریم چچی اتنی ینگ اور اسمارٹ ہیں کہ انہیں چچی کہتے ہوئے بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے' میں تو اس لیے آپ کہہ کر ہی کام چلاتی ہوں۔" یہ فریال تھی جو واقعی مریم کو چچی کہتے ہوئے جھجکتی تھی اور اچھا ہی ہوا جو اس نے مریم کو چچی کہنا نہ شروع کیا تھا۔ مریم اور رافع کی دبئی واپسی سے پہلے مریم' فریال کی نند کے رتبے پر فائز ہو چکی تھی۔

عدیل' مریم کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ مریم کے بڑے بھائی عمیر تو پہلے ہی رافع کے بزنس پارٹنر تھے۔ سب سے چھوٹا عدیل بھی کاروبار میں بھائی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ مریم کو چھوٹے لاڈلے بھائی کے لیے فریال پسند آگئی تھی۔ اس نے سطوت آرا کے سامنے خود یہ رشتہ پیش کیا۔ یہ جان کر کہ لڑکا صرف گریجویٹ ہے' سطوت آرا رشتہ قبول کرنے میں کچھ متذبذب نظر آئیں۔ ادھر فریال کا خوشی سے برا حال تھا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی لڑکیوں نے مریم کے موبائل میں ان کے بھائیوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ مریم کا سب سے چھوٹا بھائی سب سے زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ اس وقت فریال کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چند دنوں بعد اس اسمارٹ سے بندے کا پروپوزل اس کے لیے آجائے گا۔ دبئی تو ویسے ہی اس کے خوابوں کی سرزمین تھی۔ یہ رشتہ اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھا پھر جانے کیوں بڑی اماں رشتہ قبول کرتے ہوئے اتنا ہچکچا رہی تھیں حالانکہ رافع نے عدیل کے کردار اور عادتوں کے متعلق ہر طرح کی گارنٹی دی تھی۔ ان کے بقول عدیل ایک شریف النفس' محنتی اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد بڑی اماں نے فیصلے کی بال عبدالواسع اور کشور سلطانہ کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ انہوں نے سوچنے کے لیے زیادہ ٹائم نہ لیا تھا۔ رافع کی گارنٹی کے بعد سوچنے کی گنجائش بھی کہاں بچتی تھی۔ رافع

اور مریم کی دبئی واپسی سے پہلے ایک سادہ سی تقریب میں فریال کی انگلی میں عدیل کے نام کی انگوٹھی سج گئی تھی۔ فریال کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب پڑھائی کے جھنجھٹ سے اس کی جان چھوٹنے والی تھی۔ مریم وغیرہ اپنے بھائی کی جلد شادی کے خواہشمند تھے لیکن اس بار سطوت آرا نے دوٹوک انداز میں انہیں جتادیا کہ چھ سات ماہ سے پہلے وہ شادی کا نام بھی نہ لیں۔

"جب تک فریال کا بی اے مکمل نہیں ہوجاتا۔ میں اس کی شادی نہیں کروں گی۔" ان کے قطعی انداز پر فریال بھونچکی رہ گئی تھی۔

"لیکن فریال کے پیپرز تو اگلے ماہ ہورہے ہیں بڑی اماں۔" فریال کی بے چاری سی شکل دیکھ کر عرشیہ فریال کی مدد کو آئی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے پہلی اٹیمپٹ میں فریال کا بی اے کلیئر ہوجائے گا۔" بڑی اماں طنزیہ انداز میں مخاطب ہوئیں۔

"فریال کا جو حال ہے میرا تو خیال ہے وہ سپلی بھی کلیئر نہیں کرپائے گی۔ اس صورت میں ہم لوگوں کو زیادہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میری مانیں تو مریم آنٹی وغیرہ کی خواہش کے مطابق جلد شادی کی کوئی تاریخ رکھ دیں۔" مدبرنی عرشیہ نے بڑی اماں کو مفت مشورے سے نوازا تھا۔ بڑی اماں نے اسے جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہ کی محض گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ عرشیہ شرمندہ سی ہو کر واپس پلٹ گئی۔

اور سسرالیوں کے سامنے متوقع بے عزتی کا خوف تھا یا بڑی اماں کے اندازے غلط ثابت کرنے کی دھن فریال کے سر پر سوار ہوگئی تھی اس نے پیپرز کی تیاری میں دن رات ایک کردیے تھے اور پہلی دفعہ میں ہی انگلش سمیت سارے سبجیکٹ کلیئر ہوگئے تھے۔ یہ ایک معجزاتی کامیابی تھی۔ سب مسرور اور شاداں تھے اور پھر فریال کی شادی کی تیاریوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ رشتہ طے ہوتے وقت فریال کی بتیسی اندر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی اور اب اس کی آنکھیں کسی پل خشک ہونے کا نام نہ لیتیں۔ چاروں سکھیاں ایک دوسرے سے مل کر خوب ہی نیر بہاتیں۔ بڑی اماں کبھی پوتیوں کو سینے سے چمٹائے ان کے آنسو پونچھتیں تو کبھی کشور بیگم تو تسلی دیتے دیتے خود بھی آبدیدہ ہوجاتیں۔ آخر گلابی جاڑوں کی ایک شام فریال عدیل کے سنگ رخصت ہوگئی تھی۔

"سسرال میں کسی سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے فری۔ یہ یاد رکھنا کہ تمہارے نندوئی تمہارے سگے چاچو ہیں' کسی نے بھی تنگ کیا تو جھٹ پاپا سے شکایت لگادینا۔" عرشیہ آخری وقت تک فریال کو نادر مشوروں سے نوازتی رہی تھی۔



فریال رخصت ہو کر چکوال گئی تھی۔ وہاں عدیل اور مریم کا آبائی گھر تھا۔ ساری فیملی اگرچہ دبئی میں مقیم تھی لیکن پاکستان میں مقیم اپنے رشتہ داروں کے لیے انہوں نے ایک ریسپشن بھی دیا جبکہ ولیمہ کی باضابطہ تقریب دبئی جاکر منعقد کی گئی۔ فریال کے جانے کے بعد بہت دنوں تک ذہین ہاؤس پر اداسی کا راج رہا لیکن آہستہ آہستہ سب پھر سے اپنی زندگیوں میں مگن ہوگئے۔ جیا اور مناہل فورتھ ایئر میں تھیں اور عرشیہ تھرڈ ایئر میں۔ جیا کو امید تھی کہ وہ بھی بہن کی طرح پہلی کوشش میں ہی بی اے کلیئر کرلے گی۔ مناہل اپنے بارے میں زیادہ پریقین نہ تھی پھر بھی دادی کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے جان توڑ محنت کررہی تھی۔ عرشیہ اب بھی پڑھائی کے معاملے میں کوئی سنجیدگی دکھانے کو تیار نہ تھی اور پھر فریال کی طرح عرشیہ کی بھی اچانک اور فوری شادی ہوگئی۔ عبدالواسع ہائپر ٹینشن کے مریض تھے۔ پچھلے کچھ برسوں سے ہارٹ پرابلم بھی ہورہی تھی انہیں اپنی زندگی سے متعلق جانے کیا دھڑکا لگ گیا کہ انہوں نے ماں سے تابش اور عرشیہ کی جلد از جلد شادی کی فرمائش کردی۔

"میں جانتا ہوں اماں کہ ابھی عرشیہ کچھ کم عمر ہے لیکن میری خواہش ہے عرشیہ اور تابش جلد از جلد

شادی کے بندھن میں بندھ جائیں ہو سکتا ہے اللہ مجھے پوتا پوتی کھلانے کی مہلت دے ہی دے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو واسع۔ اللہ صحت و تندرستی کے ساتھ بھرپور زندگی دے' اپنے سب بچوں کی خوشیاں دیکھو۔ بیٹا جانے کی عمر تو اب میری ہے اور سچ پوچھو تو میں خود بہت دنوں سے تابش کی شادی کے متعلق ہی سوچ رہی ہوں۔ عرشیہ کا پڑھائی میں تو دماغ چلتا نہیں پھر تابش کو کس لیے عرشیہ کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کروایا جائے۔ شادی کے لحاظ سے تابش کی تو مناسب ترین عمر ہے۔ عرشیہ پر بھی ذمہ داری پڑے گی تو آپ عقل اور سمجھ آجائے گی۔" سطوت آرا نے بیٹے کی تجویز کی تائید کردی۔ عبدالرافع سے بات کرکے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ رافع' مریم اور فریال شادی سے پندرہ دن پہلے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ عدیل نے عین وقت پر پہنچنا تھا۔



عرشیہ اور تابش کی شادی پر ذہین ہاؤس میں رونق کا الگ ہی سماں تھا۔ تابش کے ننھیالی رشتہ دار شادی کی رونق بڑھانے آن پہنچے تھے۔ نانا ماموں بھی اپنی بہو کے ہمراہ شادی سے ٹھیک دو دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ عرشیہ نے چونکہ رخصت ہو کر سسرال نہیں جانا تھا سو وہ بڑی مطمئن قسم کی دلہن تھی اس کا بس چلتا تو وہ اپنے مایوں' مہندی میں خود لڈی ڈال لیتی لیکن بڑی اماں کی خشمگیں نگاہوں کے خوف سے اسے شرمیلی سی دلہن بننے کی ایکٹنگ کرنا پڑ رہی تھی۔ تابش سے اس کی جتنی بے تکلفی اور دوستی تھی' اس سے شرمانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کم از کم رخصتی سے پہلے تک عرشیہ کا یہ ہی خیال تھا۔ لیکن ولیمہ کی تقریب میں وہ شرم سے دہری ہوئے جا رہی تھی۔

"دیکھو عرشیہ! اگر کل تک تم شرمانے کی ایکٹنگ کر رہی تھیں تو آج اوور ایکٹنگ کر رہی ہو اور یہ اوور ایکٹنگ تم پر بھلی نہیں لگ رہی۔" جیا نے "نند" بن کر پہلا وار کر ہی دیا تھا۔

"ہائے اللہ جیا کی بچی! میں ایکٹنگ نہیں کر رہی۔ مجھے واقعی بہت شرم آرہی ہے۔" عرشیہ نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"شرم مگر کس سے؟" جیا جرح کے موڈ میں تھی۔ عرشیہ نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بے حد وجیہہ تابش مہمانوں کو ریسیو کر رہا تھا اور اسی لمحے تابش کی نگاہ عرشیہ پر پڑی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ عرشیہ نے سٹ پٹا کر پھر گردن جھکالی۔ اسٹیج پر دلہن کے دائیں' بائیں بیٹھی فریال اور جیا نے بھائی اور بھابھی کی نگاہوں کا تصادم باآسانی تاڑ لیا تھا۔

"بے تکلف اور بے ضرر سا دوست محبت کرنے والے شوہر کا روپ دھار چکا ہے جیا۔ ہماری بنو کا شرمانا بنتا ہے۔" فریال نے شرارت سے عرشیہ کو چھیڑا۔ جیا بھی عرشیہ پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرادی۔ اتنے میں منال بھی اپنی گھیر دار کامدانی فراک اور بڑا سا دوپٹہ سنبھالتی ان لوگوں کے پاس آئی تھی۔

"میں نے تم سے کہا بھی تھا فریال کہ میرا میک اپ کرتے ہوئے ہاتھ ہولا رکھو۔ خود تو کیک پیسٹری بنی ہوئی ہو' مجھے بھی کارٹون بنادیا۔" اس نے آتے ہی فریال پر چڑھائی کردی۔

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ بیوٹی کوئین بنادیا تمہیں اور تمہارے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔" فریال نے جوابی چڑھائی کی۔

"مجھے لگ رہا ہے میں بہت اوور لگ رہی ہوں ہر کوئی مجھے ہی گھور رہا ہے۔ پیچھے ٹیبل پر نانا ماموں کی فیملی بیٹھی ہے۔ وہ لوگ بھی مجھے دیکھ کر مسکرا کر آپس میں کوئی بات کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے مذاق ہی اڑا رہے ہوں گے۔" منال کی بدگمانی عروج پر تھی۔ جیا' فریال اور عرشیہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نانا ماموں تو چاروں بچیوں پر بے تحاشا شفقت لٹاتے تھے۔ اس بار ان کی بہو بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مومنہ آنٹی ہر وقت منال کو اپنی نگاہوں کے حصار میں رکھتیں۔ لیکن یہ نگاہیں جانچتی' پرکھتی نگاہیں نہ تھیں بلکہ بہت میٹھی میٹھی واری صدقے جانے والی نگاہیں

تھیں اور ابتہاج جو بارات والے روز علی الصبح پہنچا تھا وہ بھی کئی بار مناہل کو کن انکھیوں سے تاڑتا ہوا پایا گیا اور یہ بونگی مناہل سمجھ رہی تھی کہ سب مل کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ فریال اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ ایسی ویسی کوئی بات سن کر مناہل بی بی کی بوکھلاہٹ خواہ مخواہ میں بڑھ جائے گی۔

"اچھا اب تم اپنے میک اپ کی فکر چھوڑو اور جلدی جلدی میری اور جیا کی عرشیہ کے ساتھ کچھ تصویریں بنالو۔ عدیل سامنے بیٹھے کب سے میرا انتظار کر رہے ہیں پھر مجھے ان کے ساتھ جا کر یادگار سی سیلفی بنوانی ہے۔" فریال نے مناہل کا دھیان بٹاتے ہوئے کہا۔ بڑی اماں شادی بیاہ کے موقع پر مووی میکر اور پروفیشنل فوٹو گرافر بلانے کی سخت مخالف تھیں اس لیے لڑکیوں کو سیل فون اور ڈیجیٹل کیمرے سے خود ہی فوٹو گرافی کرنا پڑ رہی تھی۔ مناہل کو چونکہ خود تصویریں کھنچوانے کا زیادہ شوق نہ تھا سو فوٹو گرافی کی زیادہ تر ذمہ داری اسی نے سنبھال رکھی تھی۔ اب بھی وہ مستعدی سے اپنی ڈیوٹی نبھانے لگی۔ اسے علم ہی نہ ہوا کہ وہ خود کسی اور کی نگاہوں کے فوکس میں ہے۔ کوئی تھا جو اسے بہت فرصت سے تک رہا تھا۔

"برخوردار! بے خودی کا عالم اپنی جگہ لیکن آداب محفل کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔" اس شخص کو اس کے دادا نے مسکراتے ہوئے نصیحت کی تو وہ بھی خجل سا ہو کر مسکرانے لگا تھا۔ شادی بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچی تو دبئی سے آنے والوں نے بھی واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔ نانا ماموں کی بہو ابتہاج کے ہمراہ لوٹ گئی تھیں لیکن نانا ماموں ابھی ذہین ہاؤس رکے ہوئے تھے۔ انہوں نے رافع کی روانگی سے پہلے مناہل کے لیے ابتہاج کا رشتہ پیش کر دیا۔ رافع کچھ حیران ہوئے تھے لیکن پھر ماں کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ سطوت آرا کے چہرے پر بڑی مطمئن اور آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی تھی یعنی وہ بھائی کی خواہش سے لاعلم نہ تھیں۔ ایک لمحے کو رافع ماں سے شاکی ہوا۔ کم از کم انہیں رافع کو پہلے اعتماد میں لینا چاہیے تھا تاکہ وہ کوئی ممکنہ خواب سوچ سکتے۔ قابل احترام ماموں کو نہ تو منہ پھاڑ کر انکار کر سکتے تھے نہ سوچنے کی مہلت طلب کرنا بھلا معلوم ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس رشتے کو فی الفور منظور کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے بھانجے۔ میرا ابتہاج تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ پڑھا لکھا، قابل، برسر روزگار، اس کے کردار کے متعلق بھی میں ہر قسم کی گارنٹی دینے کو تیار ہوں، تمہارے چہرے پر چھایا تذبذب میری سمجھ سے باہر ہے۔" نانا ماموں حیرانی سے گویا ہوئے۔ رافع نے گہری سانس اندر کھینچی تھی۔

"آپ کی سب باتیں بجا ماموں جان۔ ابتہاج واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔ جو شخص بھی اسے اپنی فرزندی میں قبول کرے گا وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرے گا اور اسے۔"

"جو بھی شخص کیوں۔ تم کیوں نہیں؟" نانا ماموں نے سرعت سے ان کی بات کاٹی۔

"میری زندگی کا کوئی گوشہ آپ سے ڈھکا چھپا نہیں ماموں جان۔ نغمانہ اور میری شادی شدہ زندگی اسی لیے ناکامی سے دوچار ہوئی کہ میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ وہ بہت قابل اور تعلیم یافتہ عورت تھی میں واجبی سا پڑھا لکھا کاروباری بندہ، ہماری ذہنی ہم آہنگی ممکن ہی نہ ہو پائی۔ میں اپنے تلخ تجربے سے بہت خوفزدہ ہوں ماموں! اور اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کوئی تجربہ نہیں ہونے دینا چاہتا۔ ابتہاج ماشاء اللہ بہت پڑھا لکھا اور قابل بچہ ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے کتنی ڈگریاں اکٹھی کرلی ہیں۔ میری مناہل تو بہت سیدھی سادی بچی ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر ابتہاج جیسے شاندار شخص کے ساتھ قدم ملا کر کیسے چل پائے گی۔" رافع نے سیدھے سبھاؤ اپنے خدشات کا اظہار کر دیا تھا۔ نانا ماموں نے بھرپور سنجیدگی سے ان کی بات سنی تھی۔

"جس طرح تمہاری زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے پوشیدہ نہیں بھانجے! اسی طرح تم بھی میری زندگی کے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ برسوں پہلے میں نے اپنے

ہاتھوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو لحد میں اتارا تھا اس کے بعد اس کی چھوڑی نشانیوں کو دیکھ کر جیا ہوں۔
جب شہزاد کا انتقال ہوا تو وہاج چھ برس کا اور ابتہاج محض تین برس کا تھا۔ میں نے اپنے پوتوں کو دادا بن کر نہیں باپ بن کر پالا ہے اس لیے میں پورے اعتماد اور یقین سے تمہیں ابتہاج کے متعلق ہر قسم کی گارنٹی دینے کو تیار ہوں۔ اس کی بھاری بھرکم ڈگریوں کی وجہ سے تم اس کا موازنہ اپنی سابقہ بیوی سے مت کرو۔ میرا پوتا خود سے وابستہ رشتوں کو محبت اور خلوص سے نبھانا جانتا ہے۔ میں شاید وہاج کے معاملے میں اتنے یقین سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مختلف مزاج کا لڑکا ہے اس نے شادی بھی اپنی پسند سے کی لیکن ابتہاج نے پوری دلی آمادگی کے ساتھ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے اور اپنی ماں کو سونپ رکھا ہے اور مجھے اپنے پوتے کے لیے مناہل سے بڑھ کر پیاری بچی اور کوئی نہ ملے گی۔ مومنہ کو بھی مناہل بہت پسند آئی ہے اگر تم اپنے تحفظات بالائے طاق رکھتے ہوئے اس رشتے کے لیے ہاں کردو گے تو ہم تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے ورنہ ظاہر ہے مناہل کے باپ ہونے کی حیثیت سے تم ہر فیصلہ کرنے کے مجاز ہو اور ہمیں تمہارا فیصلہ تسلیم کرنا پڑے گا۔"

"ماموں جان! اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" ان کی طویل بات کے اختتام پر رافع یہی کہہ پائے تھے۔ قابل احترام ماموں کے سامنے وہ واقعی بہت خفت محسوس کر رہے تھے۔

"مناہل آج سے آپ کی ہوئی۔ شادی بیاہ کے متعلق باقی تمام تفصیلات طے کرنے کی مجاز اماں جان ہیں۔" رافع نے ماں کو دیکھا۔ وہ بھائی کو دیکھ کر مسکرادیں' خوشی جن کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"بھئی جہانگیر' کم از کم تمہیں مناہل کے گریجویشن مکمل ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر ابھی ہم نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں بھگتائی ہیں۔ کچھ مہلت ملنی چاہیے۔ اگر تم پہلے عندیہ دے دیتے تو شاید ہم عرشیہ کے ساتھ ہی مناہل کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جاتے۔" سطوت آرا نے بھائی کو رسانیت سے مخاطب کیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے آپا ہم انتظار کرلیں گے۔" نانا ماموں بشاشت سے مسکرائے تھے پھر دوبارہ رافع پر نگاہ ڈالی۔

"رافع میاں اب ذہن پر کسی قسم کا بار ہرگز نہ ڈالنا۔ بتانا مناسب تو نہیں مگر محض تمہاری تسلی کے لیے بتا رہے ہیں کہ ہمیں تو اپنی چاروں پوتیاں ہی بہت پیاری تھیں اور ہم ابتہاج کو اپنے ہمراہ اسی لیے لائے تھے کہ وہ عرشیہ کے علاوہ جس بچی کو پسند کرے' ہمیں بتادے اور اس نے خود ہمارے سامنے مناہل کا نام لیا۔ مناہل اور ابتہاج کا بندھن ان چاہا نہیں بلکہ من چاہا ہوگا۔ ان شاء اللہ۔" نانا ماموں نے ایک بار پھر رافع کو یقین دلایا۔ رافع کے چہرے پر مطمئن سی آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے ماموں کی بات سن کر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔



عرشیہ اور جیا نے مناہل کو چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ ان کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں فقط "بکواس نہ کرو۔" کہہ پائی تھی۔ جبکہ شرم کے مارے اس کا چہرہ گلابی پڑ جاتا تھا۔

"اچھا بس میری بیٹی کو زیادہ تنگ مت کرو۔" شفیق سی تائی جان قریب ہوتیں تو مناہل کی مدد کو آتیں۔ کشور سلطانہ اور عبدالواسع کا زیادہ تر وقت اب شہر میں گزرتا۔

"ہمارا جی اب بچوں میں ہی لگتا ہے اماں۔ اپنے بیٹے کو سمجھائیں کہ بہت ہوگئی زمینداری' اب کسی بھروسے کے بندے کو زمینوں کا انتظام سونپ کر ہمیں اپنے بچوں میں رہیں۔" کشور سلطانہ نے ساس کو مخاطب کیا۔

"دیکھ رہی ہیں اماں اپنی بہو بیگم کو۔ انہوں نے تو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے بچوں کے ساتھ ہی گزارا ہے۔ اب بڑھاپے میں کچھ دن شوہر کے پاس رہ کر اس

کی خدمت کرنی پڑ گئی تو جان چھڑانا چاہ رہی ہیں۔"
عبدالواسع شرارتی انداز میں بیوی کو چھیڑتے۔

"ویسے سچ کہوں تایا ابو تو تائی جان کی ہمت ہے کہ اتنی زندگی انہوں نے آپ سے دور رہ کر گزاری۔ تابش تو دس پندرہ دن کے لیے کسی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے شہر سے باہر جاتے ہیں تو مجھے تو وہ دس دن بھی دس مہینوں کے برابر لگتے ہیں۔" ساس سسر کے سامنے بے تکلفی سے حال دل کہنے والی یہ ان کی چہیتی عرشیہ تھی۔ عبدالواسع اور کشور تو مسکرا دیے البتہ سطوت آرا کو خوب تاؤ چڑھا تھا اور عرشیہ نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو ان کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی وہاں سے رفوچکر ہونے میں عافیت جانی۔



مناہل کی سالگرہ تھی۔ یہ چاروں سہیلیاں ایک دوسرے کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتی تھیں۔ فریال کے بغیر سالگرہ منانے کا مناہل کا ہرگز جی نہ کر رہا تھا پھر سکائپ کے ذریعے فریال بھی ان لوگوں کی محفل میں شریک ہوئی تو مناہل نے کیک کاٹا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ مناہل۔ ابتہاج بھائی نے وش کیا یا نہیں۔" فریال شرارتی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں میری ڈیٹ آف برتھ کا کیا پتا۔" ابتہاج کا نام سنتے ہی مناہل کے گال گلابی ہو جاتے تھے۔

"پتا ہونا چاہیے تھا نا۔ میری شادی سے پہلے جب میری سالگرہ آئی تھی تو یاد ہے نا عدیل نے کتنا چھپ چھپا کر مجھے گفٹ بھجوایا تھا اور وش بھی کیا تھا۔ ابتہاج بھائی تو یہیں پاکستان میں بستے ہیں۔ انہیں تمہیں گفٹ بھی بھجوانا چاہیے تھا اور وش بھی کرنا چاہیے تھا میں تو کہتی ہوں تم خود انہیں فون کر کے شکوہ کرو۔" فریال نے مفت مشورے سے نوازا تھا۔

"تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ ان معصوم لوگوں کا کوئی ٹیلی فونک رابطہ نہیں ہے پھر بھی ایسے نادر مشوروں سے نواز رہی ہو۔ یہ محترمہ ابتہاج بھائی کا نام سنتے ہی شرم سے لال گلابی ہو جاتی ہیں اگر بات کرنی پڑ گئی تو مارے شرم کے فوت ہی ہو جائیں گی۔" جیا نے ہنستے ہوئے بہن کو مخاطب کیا۔

"ہائے اللہ مناہل! تم کسی دور میں جیتی ہو۔ سچ بہت خوش قسمت ہیں ابتہاج بھائی جو انہیں تم جیسی شرمیلی، معصوم، سادہ دل اور پیاری سی بیوی ملے گی۔" ہزاروں میل دور بیٹھی فریال کو مناہل کا شرم سے گلابی پڑتا چہرہ دیکھ کر خوب ہی پیار آیا تھا۔

"بالکل یہی بات تمہارا بھائی میرے متعلق بھی کہتا ہے۔" عرشیہ نے شرماتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

"بے چارہ میرا بھائی۔ اچھا خاصا عقل مند و سمجھ دار بندہ تھا مگر تم جیسی کم عقل کی صحبت میں رہ کر عقل سے پیدل ہوتا جا رہا ہے۔" جیا نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"دیکھ رہی ہیں تائی جان۔ یہ جیا کی بچی آپ کے بیٹے کے ساتھ ساتھ بہو کی بھی بے عزتی کر رہی ہے۔" اسی لمحے کشور سلطانہ کا وہاں سے گزر ہوا تھا تو عرشیہ نے ان سے جھٹ شکایت لگا دی۔ وہ کشور کی ہمیشہ سے بہت لاڈلی تھی اور شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے انہیں جو "خوش خبری" سنادی تھی تو وہ لاڈلی ترین بن گئی تھی بلکہ وہ اس معاملے میں فریال سے خفا تھیں جو "ابھی تو ہمارے انجوائے کرنے کے دن ہیں۔" کہہ کر بچے کی ذمہ داری سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔ اب بھی فریال کو دیکھ کر کشور سلطانہ کو یہ ہی خیال آیا تھا۔

"بس بہت ہو گیا انجوائے فری۔ میں تجھے آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سیدھے طریقے سے مجھے "خوش خبری" سنا دے ورنہ میں خود عدیل سے بات کروں گی۔" انہوں نے اسے دھمکایا۔ فریال نے اس بار بھی بات ہنسی مذاق میں اڑا دی۔ ماں کی دھمکی دینے کا یہ انداز نیا نہ تھا۔ بچپن سے ہی وہ کشور سلطانہ کے اس اسٹائل سے آگاہ تھی۔

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ انتہائی سخت لب و لہجے میں کوئی وارننگ دیتیں لیکن کبھی اس وارننگ پر عمل درآمد کی نوبت نہ

آتی۔ ان کا وجود محبتوں اور شفقت سے گندھا تھا۔ اولاد پر غصہ کرنے کی ایکٹنگ تو کرسکتی تھیں، کبھی بھی غصہ نہ کرسکتی تھیں اور فریال کے کب وہم و گمان میں تھا کہ ماں کی یہ آخری وارننگ واقعی "آخری" ثابت ہوگی۔ چار دن بعد شہر سے گاؤں جاتے ہوئے گاڑی کی ٹرالر کے ساتھ ٹکر کے نتیجے میں عبدالواسع اور کشور سلطانہ جان کی بازی ہار بیٹھے۔ کوئی قیامت سی قیامت تھی جو "ذہین ہاؤس" پر ٹوٹ پڑی تھی۔ عبدالواسع نے دل کی بیماری کو بنیاد بناتے ہوئے عرشیہ اور تابش کی شادی کی جو جلدی مچائی تھی وہ وہم بے بنیاد نہ تھا، بس بچھڑنے کا بہانہ کچھ اور بن گیا تھا۔ شدت غم سے ذہین ہاؤس کے مکینوں کے حواس سلب ہوگئے۔ دبئی سے آنے والوں کو بروقت فلائٹ نہ مل سکی تھی۔ وہ تدفین کے بعد پہنچ پائے تھے۔ فریال کو غش پر غش آرہے تھے۔ اسے ماں باپ کی حادثاتی موت سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ بس یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں چوٹیں آئی ہیں اور وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔

ذہین ہاؤس کے لان میں بچھی دریاں دیکھ کر فریال حقیقت پاگئی تھی اور پھر وہ تابش کی بانہوں میں جھول گئی۔ کوئی کسی کو تسلی دیتا بھی تو کیسے، غم مشترک تھا اور بہت بڑا بھی۔

"بیٹیوں کو اتنی دور نہیں بیاہنا چاہیے کہ وہ ماں باپ کے چہرے بھی نہ دیکھ سکیں۔" وہ ہوش میں آتی اور پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوجاتی۔ جیا خالی خالی نگاہوں سے بہن کو دیکھتی۔ کاش وہ بھی فریال کی طرح ہوش و حواس کھو بیٹھتی، کم از کم کچھ دیر کے لیے سہی اس بھیانک حقیقت سے فرار تو ممکن ہوتا۔ عرشیہ اور مناہل کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ عبدالواسع شفیق ترین تایا تھے اور کشور سلطانہ کہنے کو تائی تھیں لیکن انہوں نے دونوں کو ماں بن کر ہی پالا تھا اور وہ دونوں انہیں ماں جیسا درجہ ہی دیتی تھیں۔ مناہل کا ذہن ان کی حادثاتی موت کا صدمہ سہار نہ پارہا تھا وہ مسلسل ٹرانکولائزر کے زیر اثر تھی اور عرشیہ جو خود ماں بننے جارہی تھی اور اس کی ماں اس مرحلے پر قدم قدم اس کی رہنمائی کررہی تھی، وہ یہ خوشی دیکھے بغیر منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر سوجائے گی، یہ کیسے ممکن تھا۔ عرشیہ بلک بلک کر روتی تو تابش کو اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ ماں باپ کی جدائی کا صدمہ سہنا اس کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا لیکن وہ "مرد" تھا سو اسے ضبط اور برداشت کا مظاہرہ کرنا تھا اور وہ کررہا تھا۔

سب کو اپنا دکھ عظیم ترین لگ رہا تھا لیکن اس بوڑھی ماں کے دکھ کی شدت کا اندازہ لگانا کسی کے لیے ممکن ہی نہ تھا جس کا بیٹا اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے دنیا میں موجود نہ رہا تھا۔ عبدالواسع، ان کا پہلوٹھی کا بیٹا، کل کی بات لگتی تھی جب اس نے ان کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں اور آج اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلیں۔ وہ ان کا کتنا فرمانبردار اور ذمہ دار بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد کتنی چھوٹی عمر میں اس نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی، کسی مرحلے پر ماں کی حکم عدولی نہ کی تھی، ہاں بس شادی کے معاملے پر ماں کی خواہش کے برعکس فیصلہ کیا تھا (اور آنے والے برسوں میں ثابت ہوگیا کہ یہ فیصلہ صائب ترین فیصلہ تھا) لیکن ماں کا خیال کرتے ہوئے اس نے بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے شہر میں ماں کے پاس ہی رکھا۔

"گاؤں میں رہ کر بچوں کی خاک تعلیم و تربیت ہوپائے گی، بچے شہر میں میرے پاس رہیں گے۔" یہ سطوت آرا کا فیصلہ تھا۔ فرماں بردار بیٹے بہو نے خوش دلی سے فیصلے کو قبول کیا۔ ان کی جوانی کے سنہری سال اسی طرح گزرے۔ پندرہ بیس دن بعد عبدالواسع شہر میں بیوی بچوں کے پاس آتے پھر واپسی کی راہ پکڑتے اور جن بچوں کی تعلیم کی خاطر شہر میں رہائش رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا ان میں سے کوئی بچہ تعلیمی میدان میں کوئی کارکردگی دکھا ہی نہ پایا۔ گاؤں میں بسنے والی کشور سلطانہ کی اپنی بھانجیاں، بھتیجیاں ماسٹر کرگئی تھیں تو اگر وہ عبدالواسع کو بیوی بچوں سمیت گاؤں میں رہنے دیتیں تو کیا حرج تھا بھلا۔ بچوں نے شہر میں رہ کر کون سا

تیر مار لیا تھا لیکن ہاں عرشیہ اور منائل بھی تو تھیں جنہیں پالنے پوسنے کی ذمہ داری کشور سلطانہ نے ہی اٹھائی تھی۔ نغمانہ کے ہوتے ہوئے بھی بچیاں تائی سے زیادہ قریب تھیں اور نغمانہ کے بعد تو کشور سلطانہ ہی بچیوں کی ماں بن گئی تھیں' یہ ذمہ داری انہوں نے پورے دل سے نبھائی اور بچوں کے بڑا ہونے کے بعد عبدالواسع کی طبیعت خرابی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کشور سلطانہ کو ان کے ساتھ گاؤں رہنے کا حکم دیا تو وہ یہ حکم بھی فوراً" بجالائیں۔

عبدالواسع اور اس کے بیوی بچوں نے کتنی غیر فطری زندگی گزاری' اس کا احساس سطوت آرا کو اب ہو رہا تھا۔ محض ان کی خواہش اور ان کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے وہ سب ایک دوسرے سے دور دور رہنے پر مجبور ہوئے۔ اگر گھر کی خاطر عبدالواسع کو زمینداری اختیار کرنا پڑ ہی گئی تھی تب بھی اس کے بیوی بچوں کو اس کے ساتھ رہنے کا پورا پورا حق تھا۔ سطوت آرا سوچتیں اور پچھتاوے کا احساس بڑھتا جاتا۔ کلیجہ پھاڑ دینے والا دکھ اپنی جگہ لیکن یہ احساس جرم تھا جو سطوت آرا کو اپنی لپیٹ میں لیے جا رہا تھا اور وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید بوڑھی' مزید چڑچڑی اور مزید غصیلی ہوتی جا رہی تھیں۔ "ذہین ہاؤس" کے در و دیوار سے لپٹی اداسی کسی طور ختم نہ ہونے پا رہی تھی لیکن کسی بہت اپنے کے بچھڑنے پر بھی کاروبار زندگی بھی رکتا ہے بھلا۔ دھیرے دھیرے زندگی کی گاڑی آگے سرکنا شروع ہو گئی تھی۔ فریال' عدیل کے ہمراہ کچھ روز پہلے ہی واپس چلی گئی تھی اور اب رافع اور مریم نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا تھا۔



"برسوں کا جما جمایا کاروبار میں اچانک وائنڈ اپ نہیں کر سکتا اماں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کچھ عرصے بعد مستقل پاکستان شفٹ ہو جاؤں گا۔" رافع نے جاتے جاتے ماں کو یقین دلایا۔

"تم اپنی مرضی کے مالک ہو بیٹا اور اب یہاں پاکستان میں بوڑھی ماں کے جنازے کو کندھا دینے کے سوا تمہاری کوئی ذمہ داری بچی ہی کب ہے' تمہارے حصے کی ساری ذمہ داریاں تمہارا بہشتی بھائی نبھا کر چلا گیا۔ تمہاری بچیاں تمہاری بھاوج نے پالیں۔ بہت چاؤ سے عرشیہ کو اپنی بہو بنایا۔ رہ گئی منائل تو شکر ہے اس کا رشتہ بھی طے ہو گیا۔ میں بہت جلد اس کی ذمہ داری سے فراغت کا ارادہ رکھتی ہوں پھر اللہ سے یہ ہی دعا ہے کہ میری جیا کا نصیب بھی جلد کھل جائے وہ میری آنکھوں کے سامنے ہی گھربار کی ہو جائے میری بس یہی تمنا بچی ہے۔" سطوت آرا نے تھکے تھکے لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رافع کو شرمندہ کر چکی تھیں لیکن سچ یہی تھا کہ انہیں رافع پر غصہ تھا۔ دنیا میں سیکڑوں ہزاروں لوگوں کی شادیاں ٹوٹتی ہیں لیکن ہر کوئی رافع کی طرح دنیا سے منہ چھپا کر بھاگ نہیں جاتا۔ اک عمر گزار کر بھی اس نے دوسری شادی کی ہی تھی نا' تو وہ یہ شادی یہیں پاکستان میں مناسب وقت پر کر لیتا اور اپنی بچیوں کو خود پالتا پوستا۔ عبدالواسع اور کشور سلطانہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنی مرضی کی زندگی جیتے۔ منائل اور عرشیہ کا خیال نہ ہوتا تو شاید سطوت آرا کشور کو اپنے ساتھ شہر رکھنے پر اصرار ہی نہ کرتیں۔ اس نوعیت کی سوچوں نے سطوت آرا کے اعصاب پر قبضہ جما لیا تھا۔ وہ پہروں سوچے جاتیں اور کڑھتی رہتی تھیں اور جب اعصابی بوجھ بالکل ناقابل برداشت ہو جاتا تو ذہین ہاؤس کا کوئی بھی مکین ان کے بلاوجہ کے عتاب کی زد میں آجاتا۔

اس روز بھی منائل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ اس نے یونہی ورق گردانی کے لیے اخبار اٹھا لیا۔ پچھلے صفحے پر ایک ٹریفک حادثے کی چھوٹی سی خبر پڑھ کر اس کا دل پھر سے لہو لہو ہو گیا۔ تائی جان اور تایا ابو کے حادثے کی بھی تو اتنی چھوٹی سی خبر ہی چھپی تھی نا' پڑھنے والے روزانہ اس نوعیت کی کتنی خبریں سرسری طور پر پڑھتے ہیں' کس کو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چھوٹی سی خبر کسی کی زندگی میں کیسا کہرام بپا کر دیتی ہے۔

"بہت خوب اخبار پڑھنے کا شغل فرمایا جارہا ہے۔" سطوت آرا کی آواز سن کر مناہل چونکی تھی۔ اس نے اخبار واپس میز پر رکھ دیا۔

"تھوڑے دنوں بعد سپلیمنٹری پیپرز ہونے والے ہیں اور میں دن کے کسی پہر تمہارے ہاتھ میں کتاب نہیں دیکھتی۔ تمہارے سسرال میں تمہارے سالانہ امتحان میں ناکامی کی میں نے یہ توجیہہ پیش کی تھی کہ تایا' تائی کا غم تازہ' تازہ تھا بچی بالکل پڑھ ہی نہ پائی۔ کم از کم اس بار تو اپنی عزت کی فکر کرلو۔ پتا بھی ہے ابتاج کتنا پڑھا لکھا اور قابل بچہ ہے۔ اسے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی' صرف اپنے بوڑھے دادا کی خواہش کے احترام میں وہ تم سے شادی پر راضی ہوا ہے۔ اگر اس کی بیوی گریجویشن بھی نہ کرپائی تو ذرا سوچو کیا بیتے گی اس کے دل پر۔" سطوت آرا پوتی کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کچھ "احساس" دلوانا چاہ رہی تھیں۔

شاید فریال کی طرح وہ بھی سسرال کے پریشر میں آکر بی اے پاس کرلے۔ ان کا مطمح نظر یہی تھا' لیکن انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ الفاظ کے چناؤ میں وہ کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی ہیں۔ مناہل کو تو اول روز سے ہی اپنا اور ابتاج کا بندھن بے جوڑ لگتا تھا۔ یہ تو عرشیہ' جیا اور فریال تھیں جنہوں نے نہ صرف ابتاج کی آنکھوں میں مناہل کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھا تھا بلکہ مناہل کو یہ باور بھی کروایا تھا کہ یہ رشتہ سراسر ابتاج کی پسند پر طے ہوا ہے۔ سہیلیوں کی بات سن کر مناہل کے خدشات سے دھڑکتے دل کو قرار آیا اور اس نے اپنی پلکوں پر سنہری سپنے سجالیے۔ پھر بھی کبھی کبھار اپنے ماں باپ کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کے متعلق سوچتی تو دل میں پھر سے بے نام سے وسوسے سر اٹھانے لگتے۔ وہ ابتاج کے مقابلے میں کتنی عام اور معمولی سی لڑکی تھی پھر جانے ابتاج کو اس میں کیا بات نظر آئی کہ اس نے اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ حقیقت تو اب بڑی اماں کی زبانی پتا چلی تھی کہ ابتاج نے محض دادا کی خواہش کے سامنے سر

جھکایا تھا۔ فرماں برداری کی بنیاد پر قائم ہونے والا رشتہ مستقبل میں کتنا پائیدار ثابت ہوگا' مناہل اس بارے میں سوچتی اور دل اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جاتا۔ نعمانہ نے جو کچھ اس کے باپ کے ساتھ کیا ابتاج وہی کہانی اس کے ساتھ نہ دہرادے۔ رافع مرد تھے اس کرائسس سے نکل گئے لیکن مناہل کے ساتھ کچھ ایسا ہوا تو وہ کیسے جی پائے گی۔ اس کم عمر اور کم عقل سی لڑکی نے بلاوجہ کے خدشات پال کر اپنے اعصاب تھکالیے تھے۔ گھر میں کسی سے وہ یہ خدشات شیئر بھی نہ کرسکتی تھی۔ عرشیہ کی پریگنینسی کی وجہ سے وہ اسے کوئی ٹینشن نہ دینا چاہتی تھی۔ جیا تو ویسے بھی گم صم سی رہتی تھی اور فریال ہزاروں میل دور۔ اس اعصابی ٹینشن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سپلیمنٹری امتحانات میں مزید برے طریقے سے فیل ہوگئی۔ جیا گزارے لائق نمبروں سے پاس ہوگئی تھی۔

ان ہی دنوں تابش کے ایک دوست کی بیوی اپنے بھائی کے لیے جیا کا رشتہ لے آئی۔ سطوت آرا کو رشتہ معقول لگا تھا۔ وہ مناہل کے ساتھ جیا کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہ رہی تھیں لیکن جیا نے فوری شادی سے انکار کردیا۔ اس نے مزید پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"بی اے میں کون سا تیر مار لیا جو آگے ایم کرنے کا سوچ رہی ہو۔ بس گھر بیٹھو اور شادی کی تیاری کرو۔" سطوت آرا نے قطعی حکم دیا۔

"تیر' ویر کا تو پتا نہیں بڑی اماں' لیکن میں اپنے ابو کی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ ابو مجھے اکثر کہتے تھے جیا بیٹے! تم "ذہین ہاؤس" کا مختلف بچہ ہو۔ اللہ نے تمہیں عمدہ ذہن دیا پھر اسے پڑھائی میں کیوں نہیں چلاتیں میرا کوئی ایک بچہ تو میری ماں کی خواہش پوری کردے اور تم......"

"میں اپنی خواہش سے دستبردار ہوگئی جیا۔ اب تمہیں تمہارے گھر بار کا کرنا ہی میری واحد خواہش ہے۔" سطوت آرا نے پوتی کی بات کاٹی۔

"بات اب آپ کی خواہش کی نہیں ہے بڑی اماں

!یہ میرے ابو کی خواہش تھی کہ میں آپ کی خواہش پوری کروں اور میں ہر صورت اپنے ابو کی خواہش پوری کروں گی۔" جیا نے اٹل لہجے میں کہا۔ سطوت آرا اپنا سر پکڑ کر رہ گئی تھیں۔



عرشیہ نے بہت پیارے 'گل گوتھنے سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ نئے جنم کے بعد "ذہین ہاؤس" کے مکینوں میں بھی زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ ننھے منے زاویار نے سب کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔

اتنا پیارا سا پڑپوتا پا کر سطوت آرا کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ سچ تھا کہ زاویار کو دیکھ کر کشور اور عبدالواسع مزید شدت سے یاد آئے لیکن زاویار کی موہنی صورت غم بھلانے کا باعث بھی بنتی تھی۔ پھر غصے میں زاویار میاں شاید اپنی پڑدادی پر ہی گئے تھے۔ دن کے کسی بھی پہر بلاوجہ کا غصہ چڑھتا تو وہ حلق پھاڑ کر رونا شروع کرتے کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ تابش اور عرشیہ شروع شروع میں منے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس دوڑتے۔

"پریشان ہونے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔ بچہ درد کی وجہ سے نہیں روتا اور رونا ایک طرح کی ایکسر سائز ہی تو ہے۔"

"اگر رونا ایکسر سائز ہو تو پھر دنیا جو صبح سویرے اٹھ کر پارکوں میں جا کر جاگنگ کرتی ہے صرف حلق پھاڑ کر رونے سے کام کیوں نہیں چلا لیتی۔"

"جاؤ تیل کی شیشی لاؤ میں منے کے پیٹ پر تیل کا مساج کروں۔ دیکھ لینا ابھی فرق پڑ جائے گا۔" سطوت آرا روتے چنگھاڑتے زاویار کو اپنی گود میں لیتیں۔ جیا اپنی سریلی آواز میں بھتیجے کو لوریاں سناتی تو منال اسے گود میں لے کر لان کے درجنوں چکر کاٹ لیتی۔ منے میاں نے ذہین ہاؤس کے سب مکینوں کو ٹھیک ٹھاک مصروف کر دیا تھا۔ بھانجے کی ناز برداریاں کرتے ہوئے منال کو بھی اپنے اور ابتہاج کے رشتے کو سوچنے اور پریشان ہونے کا موقع کم ہی ملتا تھا' لیکن پھر نانا ماموں

اور مومنہ آنٹی شادی کی تاریخ لینے آگئے۔

"میں نے جہانگیر سے کہا تھا کہ شادی تمہارے گریجویشن کے بعد ہوگی۔ خیر سے دوبار تو تم فیل ہو چکی ہو اب ان بھلے لوگوں کو اور کتنا انتظار کرواتی' اگلے ماہ کی بارہ تاریخ دے دی ہے میں نے۔ اس مہینے کے اختتام تک تمہارا باپ بھی پہنچ جائے گا۔ نیا اسے کو بھی دیکھ لے گا اور تمہارے فرض سے بھی نمٹ جائے گا۔" سطوت آرا نے سرسری انداز میں منال کو اس کی اگلے ماہ ہونے والی شادی سے آگاہ کیا تھا۔ منال جو کبوتر کی طرح آنکھیں موندے وقت گزار رہی تھی اتنی اچانک شادی کا سن کر ٹکر ٹکر دادی کی شکل دیکھنے لگی۔



عرشیہ نے شادی کی شاپنگ شروع کر دی تھی۔ تایا' تائی کے انتقال کے بعد عرشیہ کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ وہ جو تابش سے شادی کے بعد اترا اترا کر لڑکیوں کو جتاتی تھی کہ رشتے اور رتبے کے حساب سے وہ سب سے بڑی بن گئی ہے' اب وہ واقعی "بڑی" بن گئی تھی۔ ماضی کی حماقتیں قصہ پارینہ بن گئی تھیں۔ اب وہ سمجھ دار اور بردبار سی عرشیہ تھی جو اپنی ذمہ داریاں پہچانتی بھی تھی اور انہیں بخوبی نباہتی بھی تھی۔ اس نے اور تابش نے شادی کے انتظامات اس عمدگی سے کیے کہ سطوت آرا نے شادی والے روز اس کی پیشانی چوم کر بے ساختہ دعاؤں سے نوازا تھا۔

بے شمار دعائیں تو منال کے حصے میں بھی آئی تھیں۔ وہ ان کی سب سے زیادہ سعادت مند اور فرماں بردار پوتی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ اس نے زندگی کے کسی معاملے میں انہیں شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ وہ بہت حساس طبیعت کی مالک تھی۔ سطوت آرا جانتی تھیں کہ وہ اپنے ماں' باپ کی علیحدگی سے ذہنی طور پر بہت متاثر ہوئی تھی۔ باپ دیار غیر جا بسا تب بھی وہ کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتی تھی لیکن اس فطرتاً" صابر شاکر بچی نے اپنے دکھ کو اپنے

اندر اتار لیا تھا۔ اس نے تائی اور دادی کو بھی نہ ستایا تھا اور اب ان کی یہ معصوم اور فرماں بردار پوتی پیا دیس سدھار رہی تھی۔ اسے سینے سے چمٹا کر انہوں نے اسے بے شمار دعاؤں سے نوازا تھا۔ اگر ان کے اپنے آنسو رکنے نہ پا رہے تھے تو مناہل کا وجود بھی ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

"کمال کرتی ہیں آپا آپ۔ مناہل کو میرے پوتے کے سنگ رخصت کرتے ہوئے آنسوؤں کی اتنی برسات۔ ارے یہ کوئی اجنبی یا غیروں میں تھوڑی جا رہی ہے' یہ تو اپنے نانا ماموں کے گھر جا رہی ہے۔" نانا ماموں نے بہن کو ساتھ لپٹا کر تسلی دی۔ مناہل اب باپ کے سینے سے چمٹی تھی اس کا وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا تو دل انجانے خدشوں سے۔

سسرال پہنچ کر کوئی لمبی چوڑی رسمیں نہیں ہوئی تھیں۔ چار گھنٹے کے سفر میں وہ مسلسل روتی رہی تھی مومنہ آنٹی کو اس پر ترس آگیا تھا۔ انہوں نے اسے جلد ہی بیڈ روم میں بھیج دیا۔ ابتہاج کے بڑے بھائی وہاج کی بیوی اسے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔ وہ بے تحاشا حسین اور انتہائی ماڈرن عورت تھی۔ مختصر سے بلاؤز والی ساڑھی میں اس کا متناسب فگر خوب نمایاں ہو رہا تھا۔ مناہل تو اسے نظر بھر کر دیکھ بھی نہ پا رہی تھی۔

"گرینڈ پا تمہاری بہت تعریف کرتے تھے' تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ تم واقعی ان کی پسند ہو۔ پرانے زمانے کی ہیروئنوں کی طرح خوب رونے دھونے والی۔ شرمائی لجائی اور شکل سے ہی کچھ کچھ بے وقوف۔" نادیہ نے ہنستے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ان کمنٹس پر اس نے حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ تعریف تھی' تنقید یا پھر کسی قسم کا طنز۔

"سو سویٹ' یوں آنکھیں پھاڑ کر تو تم اور بھی انوسنٹ لگ رہی ہو۔ چلو اب ذرا ریلیکس ہو جاؤ' میں ابتہاج کو بھیجتی ہوں۔" نادیہ بھابھی اس کا گال تھپتھپا کر چلی گئیں لیکن اس کا دل تو ان کے پہلے فقرے میں ہی اٹک گیا تھا۔ یعنی وہ بھی یہ حقیقت اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ ابتہاج کی نہیں بلکہ صرف اس کے دادا کی پسند ہے۔ بے وقعتی کے شدید احساس نے ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رونے اور مسلسل رونے کے سوا اس وقت اسے کوئی دوسرا کام نہ سوجھ رہا تھا۔ ابتہاج جس وقت بیڈ روم میں داخل ہوا تو مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی دلہن کی حالت غیر ہوئے جا رہی تھی۔ محبت بھرے فقرے بھک سے ذہن سے اڑے اور وہ انتہائی تشویش کے عالم میں مناہل کے قریب آیا۔

"آر یو آل رائٹ مناہل!" اس کا ہچکیوں سے لرزتا کانپتا وجود دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہوا تھا۔

"تم اس رفتار سے روتی رہیں تو رونے کا عالمی ریکارڈ بنا لوگی۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔ یہ لو دو گھونٹ پانی ہی پی لو۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

"میں جانتا ہوں کہ لڑکیوں کا اپنے گھر والوں سے بچھڑ کر رخصت ہونا ان کے لیے بہت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے لیکن جب وہ اس طرح روتی ہیں تو یقین کرو وہ شخص جو انہیں رخصت کروا کر اپنے ہمراہ لاتا ہے' عجیب سے احساس جرم اور شرمندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے' سو پلیز اپنے ساتھ ساتھ میرے حال پر بھی رحم کرو۔ چپ ہو جاؤ۔" وہ خاصی بے چارگی سے مخاطب ہوا۔ مناہل کی سسکیاں دھیرے دھیرے تھمنے لگی تھیں۔

"گڈ گرل۔ یہ ہوئی نا اچھے بچوں والی بات۔" ابتہاج نے سکون کا سانس لیا۔

"مجھے پین کلر چاہیے۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔" بھیگا بھیگا دھیما سا لہجہ مگر ابتہاج نے شکر کیا کہ وہ کچھ بولی تو سہی۔

"میں تمہیں پین کلر دیتا ہوں لیکن ساتھ ہی تم خود کو پرسکون کرنے کی کوشش بھی کرو۔ سفر کی تھکاوٹ اور مسلسل رونے کی وجہ سے تمہاری حالت غیر ہو رہی ہے۔ اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر بالکل ریلیکس ہو جاؤ' اگر چاہو تو میں تمہارے گھر والوں سے

تمہاری بات بھی کروا دیتا ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں منال کو مخاطب کیا۔ اس کے دوستانہ انداز پر منال کے اعصاب واقعی ذرا سے ریلیکس ہوئے تھے۔ اس نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا دی۔ ابتاج نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھول کر کوئی پین کلر تلاشنی چاہی مگر وہ اس کوشش میں ناکام ہوا تھا۔

"میں مما سے درد کی کوئی ٹیبلیٹ مانگ لاتا ہوں۔ میں چونکہ خود دوا کھانے کا چور ہوں' اس لیے میرے کمرے میں سادہ سی پین کلر تک نہیں ہوتی۔" اس نے خوامخواہ وضاحت کی۔

"نہیں... رہنے دیں پلیز...." منال جیسے گولی مانگ کر خود ہی شرمندہ ہوئی' اس نے اسے باہر جانے سے روکا تھا' میں سونے کی کوشش کرتی ہوں' امید ہے درد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ دھیرے سے اجازت طلب کرنے کے انداز میں بولی تھی۔

"او کے ایز یو وش...." ابتاج بے چارہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا' سو اپنے رومانٹک موڈ کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے اس نے اپنی دلہن کو بھی سونے کی اجازت دے دی تھی۔



"یہ تمہاری جٹھانی تو چلتی پھرتی قیامت ہے۔" یہ کمنٹس جیا کے تھے جو ولیمہ کی تقریب میں شعلہ جوالہ بنی نادیہ بھابھی کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"اور وہ دیکھو قیامت صغریٰ' نادیہ بھابھی کی چھوٹی بہن۔" عرشیہ نے جیا کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی۔ دلہن بنی منال نے بھی ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس سمت دیکھا تھا۔ نادیہ بھابھی کی چھوٹی بہن ہادیہ سے صبح ناشتے کی میز پر اس کا تعارف ہوا تھا اور یہ بھی پتا چلا تھا کہ ہادیہ بھی اس کے سسرال میں ہی قیام پذیر ہے۔ وہ مقامی میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ نادیہ بھابھی اور ہادیہ کے والدین کچھ عرصہ پہلے اپنے بیٹے کے پاس امریکہ شفٹ ہو گئے تھے۔ ہادیہ نے ہاسٹل میں رہ کر تعلیم مکمل کرنے کے بجائے' بہن کے سسرال میں قیام کو ترجیح دی تھی۔ اس میں کچھ شبہ نہ تھا کہ وہ بے تحاشا حسین تھی لیکن اس کا فیشن بے باکی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ منال اس پر دوسری نگاہ نہ ڈال سکی تھی۔

"اگر یہ لڑکی واقعی تمہارے سسرال میں رہتی ہے تو تمہارا زیادہ تر وقت تو استغفراللہ پڑھنے میں گزرے گا۔" جیا نے خیال ظاہر کیا۔

"صرف استغفار ہی نہ پڑھتی رہنا' آنکھیں اور کان بھی کھلے رکھنا۔" عرشیہ تو کچھ زیادہ ہی تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ منال کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھ کر اس نے کیا کرنا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ آنکھیں بھی بند رکھتی اور کان بھی۔ کل سے اب تک اس نے لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے صرف حیرت دیکھی تھی اور مومنہ آنٹی ہر آئے گئے سے اس کا تعارف ان الفاظ میں کروا رہی تھیں کہ منال سراسر ان کے سسر کی پسند ہے۔ ان کا لہجہ ہنستا مسکراتا ہی ہوتا تھا لیکن بار بار ایک فقرے کی تکرار سن کر منال کا دل ڈوب رہا تھا۔

"ماشاء اللہ! ابتاج کو اس کی فرماں برداری کا کیا حسین صلہ ملا ہے۔ بیٹا جی ہم بھی دادا کی پسند پر بات چھوڑتے تو فائدے میں رہتے۔" نانا' ماموں کی کسی کزن نے مسکراتے ہوئے وہاج کو مخاطب کیا۔

"ابتاج کی تو بچپن کی عادت ہے' وہ پہلے گرینڈ پا کی بات مانتا ہے' پھر منہ بسورتا ہے اور میں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات مانی ہے۔ بنٹی آنٹی' آپ اچھی طرح جانتی تو ہیں۔" وہاج نے مسکرا کر خاتون کو جواب دیا۔

وہاج کا جواب منال کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ ابتاج واقعی اپنے دادا کا فرماں بردار پوتا تھا۔ فی الوقت وہ فرماں برداری کی انتہاؤں پر تھا۔ اس نے دادا کی پسند کی ہوئی لڑکی سے محبت بھرا برتاؤ اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ منال سے اظہار محبت بھی کر رہا تھا اور بے پناہ وارفتگی کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ اس نے بیتی رات کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ منال کا جی چاہتا کہ وہ اس کے اظہار محبت پر ایمان

لے آئے لیکن پھر دماغ دل کی اس جذباتیت پر اسے ڈپٹ دیتا۔ پہلے پہل ابتہاج نے اس کے گریز کو اس کی شرم و حیا پر محمول کیا لیکن پھر وہ اس کے سرد و سپاٹ رویے سے الجھ سا گیا۔ اس کی بیوی کے دل و دماغ میں کوئی نہ کوئی کشمکش برپا ہے' اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ چپ کی بکل اوڑھے ہوئے تھی اور ابتہاج کو الجھن سلجھانے کا کوئی سرا نہ مل رہا تھا۔



وہ ذہین ہاؤس میں ایک ہفتے قیام کے بعد واپس سسرال لوٹی تو سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ابتہاج نے اپنا آفس جوائن کر لیا تھا۔ وہاج بھائی ڈاکٹر تھے۔ وہ دن کے گیارہ بجے گھر سے نکلتے تو رات کو گیارہ بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتے۔ نادیہ بھابھی نے بھی کوئی این جی او جوائن کر رکھی تھی' وہ بھی زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتیں۔ سب کی روٹین کا اندازہ ہونے کے بعد منابل کو خاصا اطمینان ہوا تھا۔ دن کے وقت گھر پر نانا ماموں اور مومنہ آنٹی ہی ہوتے تھے۔ مومنہ آنٹی اس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں اور رہے نانا ماموں جو اب اس کے دادا سسر تھے۔ اس کے لیے سسرال کی اجنبی سرزمین پر مانوس اور شفیق ترین ہستی ان ہی کی تھی اور وہ سسرال میں اس کا دل لگانے کے لیے ہر ممکن جتن کر رہے تھے۔

اپنا اسٹڈی روم جس میں وہ کسی کو مشکل سے ہی جانے کی اجازت دیتے تھے۔ منابل کی وہاں عام رسائی تھی' بلکہ اکثر وہ اسٹڈی میں ہی منابل کے ساتھ سکریبل اور شطرنج کی بازی لگاتے۔ ان کی سنگت میں منابل کا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ سسرال میں آہستہ آہستہ اس کا دل لگ رہا تھا لیکن جس شخص کے نام سے جڑ کر وہ یہاں آئی تھی اس کے لیے اس نے اپنے دل کے کواڑ سختی سے بند کر رکھے تھے۔ کیا خبر کہ فرماں بردار پوتے کی فرماں برداری کا دی اینڈ ہو جائے۔ منابل اگر اس سے دل بھی لگا لیتی تو پھر تو وہ کہیں کی نہ رہتی لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ابتہاج کی شان دار شخصیت کے سحر میں ضرور گرفتار ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہوتا' شام کو لیپ ٹاپ کھولے کسی کام میں مصروف ہوتا یا پھر فون کان سے لگائے اپنے کسی کولیگ سے آفس کے کسی مسئلے پر بات چیت کر رہا ہوتا۔ وہ کتنی روانی سے کیسی شان دار انگلش بولتا تھا' بلکہ اس گھر میں ہر کوئی کتنا قابل اور پڑھا لکھا تھا۔ ناشتے کی میز پر انگریزی اخبار پڑھتے ہوئے وہ شستہ انگریزی میں ہی خبریں ڈسکس کرتے۔ یہ نہیں تھا کہ یہ سب منابل کے سر پر سے گزرتا' اس نے بھی بی اے میں انگلش لٹریچر ہی پڑھا تھا لیکن اسے زبان و بیان پر ان لوگوں جیسا عبور نہ تھا۔ ان سب کے سامنے اسے اپنا آپ بہت معمولی اور کم تر لگتا۔ ابتہاج کے ساتھ واقعی اس کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ اسے تو کوئی اپنے جیسی پڑھی لکھی اور قابل لڑکی ملنی چاہیے تھی۔ کوئی اور ہی کیوں' یہ نادیہ بھابھی کی ہادیہ بھی تو اس کی ٹکر کی تھی' پڑھی لکھی' خوب صورت اور بہت ماڈرن بھی۔

"آج ڈرائیور چھٹی پر ہے۔ ابتہاج آپ مجھے کالج ڈراپ کر دیں گے؟" ناشتے کے بعد نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے جس بے تکلفی سے ابتہاج کو مخاطب کیا' منابل کی ساری حسیات ایک دم چوکس ہوئی تھیں۔

"اگر بالکل ریڈی ہو تو ٹھیک ہے چل کر گاڑی میں بیٹھو اور اگر کچھ دیر ہے تو سوری' مجھے آج آفس جلد پہنچنا ہے۔" ابتہاج ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں بس کمرے سے اپنا بیگ اٹھا لاؤں۔" ہادیہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ منابل کا ناشتے سے ایک دم ہی اچاٹ ہوا تھا۔

"منابل شام کو تیار رہنا۔ یاد ہے نا سعد کے ہاں ہم ڈنر پر انوائیٹڈ ہیں۔" ابتہاج نے بالکل اچانک اسے مخاطب کیا۔ وہ جیسے ایک دم چونکی تھی' پھر دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ سعد اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ دو دن پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ نئے نویلے جوڑے کو

اپنے ہاں کھانے پر مدعو کرنے آیا تھا۔ اس کی بیوی مناہل کو خاصی معقول لگی تھی' اس لیے ان کے ہاں دعوت پر جانے کا سوچ کر اسے کوئی الجھن نہ ہوئی' ورنہ ابتہاج کے ننھیالی اور ددھیالی رشتہ داروں کے ہاں جاکر اس کا احساس کمتری بڑھ جاتا تھا۔ سب کے سب انتہائی پڑھے لکھے اور پروفیشنل قسم کے لوگ تھے۔ ابتہاج کی کزنز میں سے کوئی ڈاکٹر تھی' کوئی انجینئر اور ایک دو تو ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ایگزیکٹو پوسٹ پر تھیں۔ مناہل کو ڈر ہی لگا رہتا کہ کبھی کوئی اس کی ایجوکیشن کے متعلق نہ پوچھ لے' مگر شکر ہے آج تک ایسی نوبت نہ آئی تھی' لیکن دل ہی دل میں وہ سطوت آرا سے بہت خفا تھی' انہیں اسے اتنے بے جوڑ بندھن میں نہیں باندھنا چاہیے تھا۔ شادی کو ابھی اتنے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے لیکن اس کے دل و دماغ پر دھرا بوجھ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جارہا تھا۔ اس کا سسرال روایتی سسرال نہ تھا جہاں وہ خدمت گزاری کے بل پر سسرالیوں کے دل جیتنے کی کوشش کرتی۔ خانساماں سمیت گھر کے سب ملازمین بہت تربیت یافتہ تھے اور اپنے فرائض بخوبی بجالاتے۔ دل جیتنے کے لیے نہ سہی وقت گزاری کے لیے ہی مناہل نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کی تھی اور جب پہلی بار اس نے خانساماں کی مدد کے بغیر خود کھانا بنایا تو خلاف توقع سب نے ہی خوب تعریف کی۔ حالانکہ اس نے سادہ سا آلو گوشت اور یخنی والا پلاؤ ہی بنایا تھا۔

"آج لگ رہا ہے جیسے ہم ہوٹلنگ نہیں کررہے' بلکہ گھر میں بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ نزاکت تو کانٹی نینٹل اور چائنیز کے چکر سے ہی نہیں نکلتا۔" وہاج بھائی نے سب سے پہلے تبصرہ کیا تھا۔

"نزاکت کی کیا بات کرتے ہو میاں۔۔۔ اس سے تو کبھی فرمائش کرکے آلو گوشت بنواؤں' تب بھی یوں لگتا ہے کہ چائنیز آلو گوشت کھا رہے ہیں۔" نانا ماموں نے خانساماں کی شان میں قصیدہ پڑھا۔

"مجبوری ہے ابو۔ جب سے تجھے جوڑوں کا مرض لگا ہے۔ کچن میں کھڑے ہوکر کام کرنا خواب و خیال بن گیا۔ اب تو نزاکت کے ہی رحم و کرم پر ہیں' جو کھلا دے۔ چپ کرکے کھانا مجبوری ہے۔" مومنہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"اب مناہل ہے نا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ اسی طرح کے مزے مزے کے کھانے بناکر ہمیں کھلاتی رہے گی۔ کیوں مناہل ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔" وہاج بھائی نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جو سب کی توجہ اپنی جانب مبذول پاکر پزل ہوگئی تھی۔ دھیرے سے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پھر دھیرے دھیرے اس نے کچن کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ نزاکت کی حیثیت ایک ہیلپر کی سی تھی۔ وہ نانا ماموں کے لیے پرہیزی کھانا بناتی' اس کی کوشش ہوتی کہ تیز مسالوں کا استعمال کیے بغیر کھانا نانا ماموں کی پسند کا بن جائے' اپنی کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب تھی۔ پھر نانا ماموں دوا کھانے کے بہت چور تھے۔ مناہل نے غیر محسوس طریقے سے انہیں میڈیسن دینے کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ مومنہ آنٹی جو عرصے سے تنہائی کی ماری تھیں۔ مناہل کی صورت میں انہیں بہت اچھا سامع مل گیا تھا۔ ان کی زندگی کی داستان سن کر مناہل کی آنکھیں کئی بار نم ہوجاتیں۔ عین جوانی میں محبت کرنے والے شریک سفر کی جدائی کیسا عظیم سانحہ تھا۔ وہ آج بھی اپنے مرحوم شوہر کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ مناہل کو پرانے فوٹو البمز دکھاتیں' ہر تصویر کے ساتھ ان کی کوئی نہ کوئی یاد جڑی تھی اور مناہل بہت اشتیاق سے ان کے ساتھ ان کے ماضی میں جھانکتی۔

"زندگی میں پہلی بار احساس ہورہا ہے کہ بیٹی کو اللہ کی رحمت کیوں کہا جاتا ہے۔ ماں کی ہمدم و دمساز تو بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ تم مجھے آنٹی مت کہا کرو' مما کہا کرو۔" مومنہ آنٹی کی فرمائش اتنی اچانک تھی کہ مناہل ہکابکا رہ گئی مگر اگلے ہی پل اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اپنی ماں تو بچپن میں ہی ممتا سے محروم کرکے نئی دنیا بسانے چلی گئی تھی' پھر قدرت نے کشور سلطانہ جیسی بے لوث محبت لٹانے والی تائی کی ممتا ان

دونوں بہنوں کی جھولی میں ڈال دی تھی اور تائی دنیا سے رخصت ہوئیں تو مومنہ آنٹی جیسی ساس مل گئیں جو بہت محبت بھرے لہجے میں فرمائش کر رہی تھیں کہ وہ انہیں ان کے بچوں کی طرح مما کہہ کر مخاطب کرے، اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ دیکھ کر مومنہ آنٹی نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ابتہاج کسی کام سے ماں کے کمرے میں داخل ہوا تو اندر کا منظر حیران کن تھا۔ وہ مومنہ بیگم کے سینے سے چمٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اسے ان کے وجود سے لپٹ کر اپنی ماں یاد نہیں آئی تھی، بلکہ ماں جیسی تائی کی شفقت آغوش یاد آئی تھی۔ مومنہ بیگم کے ہاتھ کا لمس بالکل کشور سلطانہ کے ہاتھ کے لمس جیسا تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپک رہی تھیں۔

"مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہاں کوئی اموشنل سین چل رہا ہے ورنہ میں دستک دے کر اندر آتا۔ بہرحال مما فارغ ہو کر میری بات سن لیں، میں باہر لاؤنج میں ویٹ کر رہا ہوں۔" ابتہاج سنجیدگی سے کہتا واپس پلٹا تھا۔

مناہل نے اس کے لہجے کی سنجیدگی کو جی جان سے محسوس کیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ابتہاج کے رویے میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ جس محبت اور وارفتگی کا اظہار کرتا تھا اب وہ رویہ یکسر بدل گیا تھا۔ شاید فرماں برداری کا پیریڈ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا اور وہ اس بے جوڑ بندھن سے اکتانے لگا تھا۔ مناہل نے اول روز سے کوشش کی تھی کہ ابتہاج سے اس کی دلی وابستگی قائم نہ ہونے پائے، لیکن وہ اپنے دل کے کواڑ بند کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اسے احساس تک نہ ہوا۔ وہ تو کب سے اس کے دل کی مسند پر براجمان ہو چکا تھا۔ اس کی بے گانگی متوقع سہی، مگر مناہل کے لیے بہت تکلیف دہ تھی اور اب تو وہ ابتہاج سے وابستہ رشتوں سے بھی محبت کے اٹوٹ بندھن میں بندھ چکی تھی۔ ان سب سے بچھڑنے کا تصور ہی بہت اذیت ناک تھا۔ شفیق ترین نانا ماموں، ماں جیسی مہربان مومنہ بیگم، ہنس مکھ اور خوش مزاج وہاج بھائی اور تو اور نادیہ بھابھی جو شروع میں اس سے ذرا فاصلہ رکھ رہی تھیں۔ وہ بھی اس سے بہت بے تکلف ہو گئی تھیں۔ شادی کے چھ برس بعد بھی وہ ماں کے رتبے پر فائز نہ ہو سکی تھیں۔ زندگی کی یہ محرومی انہیں حد درجہ ڈپریشن میں مبتلا کر چکی تھی۔ سائیکاٹرسٹ کے مشورے پر انہوں نے دھیان بٹانے کے لیے سوشل ورک کا آغاز کیا تھا۔ مناہل کی پر خلوص طبیعت کا اندازہ ہونے کے بعد انہوں نے اس سے اپنے دل کے سارے دکھڑے روئے تھے۔

"وہاج اور میری لو میرج تھی۔ مومنہ آنٹی اور گرینڈ پا کی شدید مخالفت کے باوجود وہاج نے مجھ سے شادی کی۔ ہمارے گھروں کے ماحول میں بہت فرق تھا۔ میں چاہتی تو وہاج کی محبت میں خود کو بدل سکتی تھی، لیکن آنٹی اور گرینڈ پا کی نگاہوں میں مجھے دیکھ کر جو بے زاری اترتی تھی، وہ مجھے مزید ضد دلاتی تھی۔ میں نے خود کو بدلنے کا ارادہ ترک کر کے آنٹی کو چڑانے کے لیے ہر اوٹ پٹانگ کام کیا۔ آنٹی وغیرہ کو سب سے قابل اعتراض تو میری ڈریسنگ لگتی ہے، لیکن میں نے شادی کے پہلے روز سے ہی اپنی شخصیت پر اتنے اعتراض سہے کہ اس کا رد عمل مزید قابل اعتراض ڈریسنگ کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ وہاج میرے ساتھ تھے اور مجھے کسی کی پروا نہ تھی لیکن پھر اس گھر میں تم آگئیں۔" نادیہ بھابھی بات کرتے کرتے رکیں اور وہ جو بہت منہمک ہو کر انہیں سن رہی تھی، اپنا ذکر آنے پر یک دم چونکی۔

"تمہاری شادی سے پہلے ہی آنٹی نے مجھے جتانا شروع کر دیا تھا کہ ابتہاج نے گرینڈ پا کی منتخب کردہ لڑکی سے رشتہ جوڑا ہے اور بزرگوں کی بات مان کر وہ ہمیشہ خوش و خرم رہے گا۔ وہ تو شاید ہماری بے اولادی کو بھی والدین کی نافرمانی کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ انہوں نے تو کبھی میری گود ہری ہونے کی دعا بھی نہ کی ہو گی۔" نادیہ بھابھی کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ مناہل کو اس سے ان پر جی بھر کر ترس آیا۔ وہ اسی وقت ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ مومنہ آنٹی کی تو شاید زندگی کی سب

سے بڑی خواہش ہی یہ رہ گئی تھی کہ وہ وہاج بھائی کے بچے کو گود میں کھلا سکیں۔ ابھی کل ہی تو مومنہ آنٹی دکھ بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔
"میں وہاج اور نادیہ کے سامنے کبھی بچے کی خواہش کا تذکرہ نہیں کرتی۔ نادیہ سے لاکھ اختلاف سہی مگر جانتی ہوں یہ محرومی اسے اندر ہی اندر گھلا رہی ہے۔ ہم لوگ بھی بچے کی خواہش کا برملا اظہار شروع کر دیں تو اور ڈپریس ہو جائے گی۔ جیسی بھی ہے، میری بہو ہے اور ظاہر ہے وہاج کے حوالے سے مجھے عزیز بھی ہے۔ اللہ سے یہ ہی دعا ہے جلد اس کی گود ہری کرے۔"
مومنہ آنٹی نے آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے دعا کی تھی۔ مناہل نے صدق دل سے آمین کہا تھا لیکن نادیہ بھابھی ساس کے متعلق کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھیں، مومنہ نے فی الحال انہیں ٹوک کر غلط فہمی کی تصحیح کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چاہتی تھی نادیہ بھابھی سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کریں۔
"ابتہاج کا رشتہ طے ہونے کے بعد سے میں تمہارے متعلق بہت تجسس میں مبتلا تھی۔ گرینڈ پا اور آنٹی نے تو مجھے بڑی بہو ہونے کا کوئی حق ہی نہ دیا۔ حالانکہ ابتہاج کی منگیتر دیکھنے کو میرا بہت جی کرتا تھا لیکن کبھی کسی نے مجھے تمہارے ہاں چلنے کی آفر ہی نہ کی۔ خیر مجھے اندازہ تھا کہ گرینڈ پا نے ابتہاج کے لیے کیسی لڑکی منتخب کی ہوگی۔ گھریلو سی مشرقی دوشیزہ جو میری طرح شرم و حیا سے عاری نہ ہوگی۔" نادیہ بھابھی نے قہقہہ لگاتے ہوئے گویا اپنا تمسخر اڑایا تھا۔
"اور پھر گرینڈ پا اور مما تمہیں کسی فخریہ پیش کش کی طرح رخصت کروا کر یہاں لے آئے۔ تمہاری سادگی اور معصومیت دیکھ کر میں واقعی حیران رہ گئی تھی۔ آنٹی ہر آئے گئے کے سامنے یہ ہی راگ الاپ رہی تھیں کہ ابتہاج نے دادا کی پسند پر سر جھکایا ہے۔ وہ درحقیقت مجھے جتانا چاہ رہی تھیں کہ میں ان لوگوں کے لیے کتنی ان وانٹڈ تھی، جس طرح آنٹی نے تمہارے چاؤ چونچلے اٹھائے، میری باری میں صورت حال یکسر مختلف تھی، لیکن ان دنوں وہاج کی محبت کا جادو

میرے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا، مجھے کسی اور کی ناز برداری کی ضرورت ہی نہ تھی، لیکن گھر والوں کے ساتھ تمہارا ریلیشن دیکھ کر مجھے بھی اپنی زندگی میں کسی کمی، کسی خلا کا احساس ہوا۔ حالانکہ اس گھر میں میری اپنی سگی بہن بھی رہتی ہے، لیکن اسے بھی بہن کی زندگی کے کسی معاملے، کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ یا تو اپنی پڑھائی میں مگن ہوتی ہے یا اپنے منگیتر کے ساتھ مصروف۔"
"منگیتر...!" مناہل اس بار نادیہ بھابھی کی بات کاٹے بنا نہ رہ پائی۔ "ہاں میرے چاچو کا بیٹا امریکہ میں ہوتا ہے، لیکن نیٹ اور موبائل کے ہوتے ہوئے آج کل فاصلوں کی اوقات۔" وہ مسکرائی تھیں۔
"خیر نادیہ کا یہاں کیا ذکر۔ میں تو تمہاری بات کر رہی تھی۔ کبھی مجھے لگتا کہ تم گھر والوں کی نظروں میں نمبر بنانے کے لیے ان کے آگے پیچھے پھرتی ہو لیکن پھر جن دنوں میری طبیعت خراب ہوئی اور اتفاق سے وہاج بھی ہفتے بھر کے لیے شہر سے باہر تھے تو تم نے نہ صرف پورے خلوص سے میری تیمارداری کی۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھا، بلکہ میرا دھیان بٹانے کی خاطر میرے کمرے میں آکر مجھ سے گپ شپ لگانے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی پرخلوص نظر آنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ یہ حقیقت میں بھی اتنی ہی پرخلوص اور بامروت ہے کیونکہ سسرال میں نمبر بنانے کے لیے کم از کم اسے میرے آگے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ میرے قریب آنے سے تو اس کے اپنے نمبر گھٹنے کا خدشہ تھا، پھر بھی اس نے کسی کی پروا کیے بغیر میرا ہر ممکن خیال رکھا اور مجھے۔"
"اب بس بھی کریں نادیہ بھابھی... ایسا کون سا خاص خیال رکھا میں نے۔" اس نے جھینپتے ہوئے ان کی بات کاٹی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے نادیہ بھابھی کو خاصا تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ وہاج بھائی کی غیر موجودگی میں اس نے بیمار پڑی نادیہ بھابھی کو ذرا سی کمپنی دینے کی کوشش کی تھی اور وہ اسی بات کو کتنا بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی تھیں۔ مناہل اپنی تعریف سن کر جھینپ رہی تھی۔

"تم بہت اچھی ہو مناہل۔ اس گھر کے باقی لوگوں سے بالکل مختلف۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر اسے سراہا اور اب بولنے کی باری مناہل کی تھی۔

"اس گھر کے سب مکین ہی بہت اچھے ہیں' نادیہ بھابھی سمیت' آپ لوگوں کے درمیان فقط کمیونیکیشن گیپ ہے اور تھوڑی سی بدگمانی کی فضا قائم ہے اور اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس سب کے لیے کسی حد تک آپ کو قصوروار گردانوں گی۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"میں واقعی برا نہیں مانوں گی' لیکن تم اپنی بات کی وضاحت تو کرو۔" نادیہ بھابھی نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی زبانی اپنے حصے کے قصور سننا چاہے۔

"آپ کو گلہ ہے کہ وہاج بھائی کی فیملی نے آپ کو اول روز سے قبول نہ کیا' لیکن آپ نے بھی تو سسرال والوں کے دل میں جگہ بنانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ آپ اپنی ڈریسنگ کی ہی مثال لے لیں۔ یہ جانتے بوجھتے کہ اس گھر کے ماحول میں ایسا لباس قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے' آپ نے کبھی خود کو مومنہ آنٹی کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہ کی' بلکہ نادیہ بھابھی آپ نے ان کی ضد میں اپنا بڑا نقصان کیا۔ ساس کی ناراضی مول لیتے لیتے آپ اپنے رب کی ناراضی بھی مول لے بیٹھیں' آپ خود سوچیں ایک مسلمان عورت کو ایسا پہناوا زیب دیتا ہے۔ ہمارے مذہب میں ستر پوشی کے کتنے واضح احکام ہیں' سچ کہوں تو ایک عورت ہونے کے باوجود کبھی کبھار مجھے بھی آپ کے وجود سے نگاہیں چرانی پڑتی ہیں۔ کھلے گریبانوں والا کتنا چست لباس ہوتا ہے آپ کا۔" مناہل نے موقع غنیمت جان کر سب سے پہلے نادیہ کی توجہ اس کی سب سے قابل اعتراض عادت کی جانب دلائی تھی۔

"میں اولاد کی محرومی کی وجہ سے آپ کے ہونے والے ڈپریشن کو سمجھتی ہوں' جس سائیکاٹرسٹ نے آپ کو سوشل ورک کا مشورہ دیا ہے۔ یقیناً" بہت درست مشورہ ہے لیکن آپ ایک مشورہ میرا بھی مانیں۔ اپنے دل کے اطمینان کے لیے اپنے رب کی رضا تلاش کریں۔ اس کے واضح احکامات کی نفی کرتے ہوئے آپ کو سکون قلب کیسے مل سکتا ہے۔" اس نے پورے خلوص سے انہیں سمجھانا چاہا' ساتھ ہی مومنہ آنٹی کی طرف سے ان کا دل صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ مناہل جانتی تھی کہ یہ غلط فہمیاں ایک دم سے ختم نہیں ہوں گی۔ لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ کبھی مومنہ آنٹی سے بات کرتے ہوئے نادیہ بھابھی کے طرز عمل کی توجیہات پیش کرتی۔ نادیہ بھابھی کے رویے کو عمل اور رد عمل کے تناظر میں سمجھانے کی کوشش کرتی تو کبھی نادیہ بھابھی کو احساس دلاتی کہ ان کی ساس ہرگز بھی دل کی بری نہیں اور وہ وہاج بھائی کے حوالے سے انہیں بھی عزیز رکھتی ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی کوششیں رنگ لانے لگیں۔ ساس بہو کے تعلقات کی سرد مہری تیزی سے ختم ہونے لگی۔ نادیہ بھابھی خود کو ساس کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مناہل ان کی بھرپور مدد کر رہی تھی۔



اس روز بھی وہ نادیہ بھابھی کے ہمراہ شاپنگ کر کے گھر لوٹی تو پورچ میں ابتجاج کی گاڑی کھڑی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ آج کل آفس سے لیٹ نائٹ گھر آتا تھا' آج جانے جلد گھر کیسے آ گیا۔ نادیہ بھابھی بہت شوق سے اپنی شاپنگ مومنہ آنٹی کو دکھانے لگیں۔ مناہل کے مشورے سے خریدے گئے مشرقی ملبوسات مومنہ آنٹی کو واقعی بہت پسند آئے تھے۔

"تم نے اپنے لیے کچھ نہیں خریدا؟" انہوں نے حیرت سے استفسار کیا "ابھی تو بری' جہیز کے کپڑے یوں ہی پڑے ہیں مما۔" وہ مسکرائی "میں دیکھ رہی ہوں مناہل تم اپنے سجنے سنورنے میں ذرا دلچسپی نہیں لیتیں اور لڑکیوں کو تو شاپنگ کا کریز ہوتا ہے اور میں تو کہوں گی کہ ہونا بھی چاہیے یہ ہی تو ارمانوں بھرے دن

ہوتے ہیں لیکن تم تو دنیا جہان سے انوکھی لڑکی ہو۔"
مومنہ بیگم اس پر خفا ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سجنے' سنورنے میں تو وہ جب دلچسپی لیتی جب شوہر اس کی ذات میں دلچسپی لیتا۔ وہ تو بالکل لاتعلق اور اجنبی بن کر رہنے لگا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی وہ خوش مزاجی جو مناہل کے دل میں بعض اوقات کسی خوش فہمی کو بھی جنم دے دیتی تھی۔ وہ اب خواب و خیال ہوگئی تھی۔ وہ مناہل کو انتہائی ضرورت کے وقت مخاطب کرتا اور مخاطب کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ اتنا روکھا اور خشک ہوتا کہ مناہل کو آنسو ضبط کرنا دوبھر ہوجاتا۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی کے انجام سے تو واقف تھی' لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوجائے گا۔ اسے اندازہ تک نہ تھا۔ فی الحال تو وہ کبوتر کی طرح آنکھیں موندے سسرال والوں کے معاملات درست کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اپنا معاملہ اس نے اللہ کے سپرد کررکھا تھا۔

"ابتاج کی کچھ طبیعت صحیح نہیں ہے۔ کافی دیر ہوگئی اسے آفس سے لوٹے۔ جاؤ چائے وائے کا پوچھ لو اس سے۔" مومنہ بیگم کو اچانک خیال آیا تو اسے ابتاج کی طبیعت خرابی سے آگاہ کیا۔ وہ "جی مما" کہتی بیڈ روم میں چلی گئی۔ ابتاج آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ آہٹ پر بھی اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ اب ایک سوئے ہوئے بندے سے وہ کیسے چائے پانی کا پوچھتی۔ کچھ دیر کھڑی یہ ہی سوچتی رہی' پھر واپس جانے کے لیے قدم دروازے کی جانب بڑھائے۔

"کہاں جارہی ہو۔" اس نے ایک دم پکارا تھا۔ وہ ٹھٹک کر پلٹی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ مما بتارہی تھیں کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آپ آفس سے جلد آگئے تھے۔" اس نے ابتاج کو مخاطب کیا۔ ابتاج نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس تیکھی نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" مناہل اس کی نگاہوں سے پزل ہوئی۔ آج تو اس کے تیور ہی الگ تھے۔

"کہاں گئی تھیں تم۔" سوال گندم' جواب چنا۔

"نادیہ بھابھی کے ساتھ گئی تھی' انہیں کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔" مناہل نے دھیرے سے بتایا۔

"سب سسرال والوں کے دل میں بہت جلد جگہ بنالی ہے تم نے۔" وہ کاٹ دار لہجے میں گویا ہوا۔ مناہل چپ چاپ ہونٹ کاٹنے لگی۔ اب بھلا اس بات کا وہ کیا جواب دیتی۔

"پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ میرا کیا قصور ہے۔ میرے ساتھ سوتیلی بیویوں والا برتاؤ کیوں کرتی ہو۔" کیا انوکھی اصطلاح استعمال کی تھی اس نے۔ مناہل ہکابکا ہوکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"مطلب کیا ہے آپ کا۔" پوچھتے ہوئے اس کے لب کپکپا رہے تھے۔

"مطلب تو میں نے تم سے پوچھنا ہے مناہل۔ تمہارے اس عجیب و غریب رویے کو سہنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میں اب ایک نارمل زندگی جینا چاہتا ہوں۔" ابتاج اس بار قدرے بے چارگی بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ مناہل کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"شروع میں مجھے لگا کہ تم اس شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھیں۔ میں اظہار محبت کرتا تھا اور تم اتنی گم صم اور سپاٹ رہتی تھیں جیسے میں تم سے نہیں کمرے کی دیواروں سے ہم کلام ہوں۔ پھر میں نے تم سے دوستی بھرا برتاؤ اختیار کیا۔ اس کا بھی کوئی رسپانس نہ ملا۔ پھر اپنی دانست میں' میں نے تمہیں لاتعلقی کی مار' مارنا چاہی لیکن تمہیں پھر بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ تم میرے ساتھ شادی کرکے خوش نہیں ہو' یہ بات میری سمجھ میں آگئی لیکن پھر تم میرے گھر والوں کے ساتھ پیار کی پینگیں کیوں بڑھا رہی ہو۔ جب تمہیں میری ذات سے ہی کوئی سروکار نہیں تو یہ رشتہ قائم رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے۔ لیکن تم حقیقت سے فرار حاصل کرنے کے بجائے مجھ سے اس موضوع پر بات تو کرو۔ تمہاری زندگی کا فیصلہ تمہاری خواہش پر ہوگا۔" وہ رسانیت سے مخاطب ہوا۔ مناہل حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کس قدر چالاک شخص ہیں۔ میرے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ اس بے جوڑ بندھن سے اکتا گئے ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔" شدت جذبات سے اس کی آواز کپکپا گئی تھی۔ ابتاج نے گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے غور سے دیکھا' وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے بیوی کو بولنے پر اکسا لیا تھا' شاید آج الجھن کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں آسکے۔ وہ جی جان سے مناہل کی جانب متوجہ ہوا۔ جس کے چہرے پر خفگی اور برہمی جھلک رہی تھی' آنسو تواتر سے گر کر گال بھگو رہے تھے۔

"آپ نے محض اپنے دادا کی خوشنودی کے لیے یہ بندھن جوڑا' لیکن آخر کار آپ اس بے جوڑ بندھن سے اکتا گئے اور مجھے علم تھا کہ ایسا ہی ہوگا' اس لیے میں نے شروع دن سے آپ کو لفٹ نہیں کروائی تھی۔" روتے روتے کیسا معصومیت بھرا انکشاف کیا تھا اس نے۔ ابتاج بہت دلچسپی سے اس کے انکشافات سن رہا تھا۔

"بے جوڑ بندھن سے کیا مراد ہے تمہاری۔ ذرا وضاحت کروگی۔ میری ناقص عقل تو اس ٹرم کو سمجھنے سے قاصر ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ مناہل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ یقیناً" اس کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ لیکن اگر اسے مناہل کی زبانی سن کر مزید تسکین ملنی تھی تو وہ اسے اس تسکین سے محروم نہ کرنا چاہ رہی تھی۔ اس وقت وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔

"محض اپنے دادا کی خواہش پر آپ جیسے پڑھے لکھے شخص کو ایک ایف اے پاس لڑکی سے شادی کرنا پڑی' لیکن اب آپ کو اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہو ہی گیا ہے تو مزید وقت ضائع کیے بغیر اس بے وقوفی سے چھٹکارا پا لیں۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔ ابتاج کے سر سے جیسے منوں ٹنوں کے حساب سے وزنی بوجھ اتر گیا۔ الجھن کا سرا مل گیا تھا۔ گرینڈ پا کی زبانی وہ مناہل کے والدین کی علیحدگی کی داستان سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ مناہل کی نفسیاتی گتھی میں بھی اس حوالے سے کوئی گرہ پڑی ہوگی۔

شادی کے بعد سے مناہل کے عجیب و غریب رویے کو سوچ سوچ کر اس کا دماغ پک گیا تھا' لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اب وجہ سمجھ میں آئی تو ذہن ایک دم ہلکا پھلکا ہوگیا۔ اپنے سامنے بیٹھی سوں سوں کرتی اپنی بے وقوف سی بیوی پر اسے شدت سے پیار آیا تھا۔

"کیا کہا تم نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اس بے وقوفی سے چھٹکارا پالوں۔" وہ بظاہر سنجیدگی سے مخاطب تھا' مگر آنکھوں میں شرارتی چمک موجود تھی۔" مناہل نے زاروقطار روتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

"اتنی خوب صورت بے وقوفی سے چھٹکارا پالوں۔ ایسا بے وقوف سمجھا ہے مجھے۔" اس نے مناہل کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچا تھا۔ مناہل نے آنسوؤں سے بھری حیران آنکھیں اس پر گاڑیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں دنیا جہان کا پیار سموئے اسے ہی تک رہا تھا۔

"میری بے وقوف سی زوجہ محترمہ! جانے یہ بات آپ کے دماغ میں کس نے بٹھادی کہ میں محض گرینڈ پا کی خواہش پر اس شادی کے لیے راضی ہوا۔" وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بول رہا تھا۔ مناہل حیران پریشان اسے سن رہی تھی۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ گرینڈ پا کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ اپنی پیاری آپا کی کسی پوتی کو اپنے چھوٹے پوتے کی شریک حیات بنادیں۔ وہاج بھائی نے پسند کی شادی کرکے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ ان کی ساری توقعات مجھ سے ہی وابستہ تھیں' لیکن گرینڈ پا زبردستی مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتے تھے اور ظاہر ہے میں بھی اتنا بے وقوف نہ تھا کہ محض اپنی فرماں برداری کے اظہار کے لیے ان کے کسی بھی فیصلے پر سر جھکادوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ذہین ہاؤس اس لیے لے کر گئے تھے کہ میں ان کی پیاری پوتیوں کو ایک نظر دیکھ لوں اور کوئی لڑکی میرے من کو بھاتی ہے تو ٹھیک' ورنہ وہ بخوشی اپنی خواہش سے دستبردار ہوجائیں گے اور ہوا کچھ یوں کہ ان کی ایک پوتی نہ صرف میرے من کو بھائی' بلکہ وہ تو

پہلی ہی نظر میں میرے من میں اتر گئی۔ لیکن وہ لڑکی تو مجھ پر ایک نظر ڈالنے کی بھی روادار نہ تھی۔ پہلے مجھے لگا وہ صرف پوز کرتی ہے ' ورنہ میری پرسنالٹی نظر انداز کرنے کے قابل تو نہ تھی ' لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی رہنے والی اس لڑکی کو واقعی میری ذات سے کوئی سروکار ہے ہی نہیں۔ اپنی نٹ کھٹ بہن اور شرارتی کزنز سے یکسر مختلف وہ لڑکی صرف اس فکر میں ہلکان رہتی تھی کہ اس سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو اس کی بڑی اماں کی ناراضی کا باعث بن جائے ' بس اس کی فرماں برداری پر میرا ایسا دل آیا کہ میں نے بھی گرینڈپا کا فرماں بردار پوتا بننے کا فیصلہ کرلیا۔ چپکے سے ان کے سامنے تمہارا نام لے دیا اور آگے کے سب مرحلے ان پر چھوڑ دیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔ منائل حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے سنے گئی۔

"ویسے ہاں ایک بات کا مجھے واقعی علم نہ تھا۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق تو آپ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھیں ' جبکہ ابھی آپ نے بتایا کہ آپ ایف اے پاس ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوا۔" وہ اس کے چہرے پر جھولتی ہوئی لٹ کو کھینچتے ہوئے بولا تھا۔

"بی اے کی اسٹوڈنٹ ہونا اور بات ہے اور بی اے پاس کرنا دوسری بات۔ میں فیل ہوگئی تھی۔" منائل نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیرے سے بتایا۔ اچھا ہے ' یہ بات اس کے علم میں آجائے ' ورنہ ابھی جو محبت کی گردان کر رہا ہے اس کے دعوے کی صداقت کو بھی پرکھ لیا جائے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ بڑی اماں نے بی اے پاس کرنے کے لیے اسے سسرال کے پریشر میں رکھا تھا ' لیکن شاید انہوں نے اس کی ناکامی سے سسرال والوں کو آگاہ ہی نہ کیا تھا۔

"میں پہلے اینول ایگزام میں فیل ہوئی تھی اور پھر سپلیمنٹری پیپرز میں اس سے بھی برے طریقے سے فیل ہوئی۔" اس نے ابتہاج کو مزید تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بہت دلچسپی سے اس کے چہرے کے تاثرات ملاحظہ کر رہا تھا اس اہم اطلاع پر اس نے

محض سہلانے پر اکتفا کیا۔
"فیصلے کا اختیار اب بھی آپ کے پاس ہے۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔" منائل کی آنکھیں پھر ڈبڈبانے لگی تھیں۔
"ایک دم بے وقوف ہو تم۔" ابتہاج نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا' اتنی پیاری سی بیوی کو مزید ستانا ہرگز مناسب نہ تھا۔
"یہ میرے دل کا معاملہ ہے میری جان۔ میرے آفس کی کوئی خالی سیٹ نہیں ہے' جس پر کسی اعلا تعلیم یافتہ شخصیت کا تقرر کرنا ضروری ہو۔ تم تو اس وقت سے اس دل کی مسند پر براجمان ہو جب میں تمہیں ٹھیک سے جانتا بھی نہ تھا اور اب' جب تمہاری خوبیاں مجھ پر پوری طرح آشکار ہو چکی ہیں تو اس دل میں تمہاری قدر و منزلت اور بڑھ چکی ہے۔ لہٰذا نہ تو آئندہ میں تمہارے پیارے پیارے لبوں سے ایسی فضول بات سنوں اور نہ ان آنکھوں میں آنسو دیکھوں۔" وہ وارننگ دے رہا تھا مگر منائل پر اس وارننگ کا الٹا اثر ہوا' وہ اس کے شانے سے سر ٹکائے مزید زور و شور سے آنسو بہانے لگی تھی۔ ابتہاج ہولے ہولے اس کا سر تھپکتا رہا۔
"اب جو بات کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور اس بار بھی یقین نہ کیا تو تمہاری پٹائی کروں گا۔ منائل کی سسکیاں تھمنے کے بعد وہ دھیرے سے بولا تھا۔"
"کہیے' سن رہی ہوں۔" منائل اب فرماں بردار بیوی بن کر بولی۔
"آئی لو یو' سوئٹ ہارٹ۔" جذبے لٹاتا' محبتوں کا یقین دلاتا لہجہ' منائل اس بار یقین نہ کرنے کی غلطی ہرگز نہ کر سکتی تھی۔ شرمیلی سی دھیمی مسکان اس کے لبوں پر بکھر گئی۔
"ویسے آئی لو یو کوئی سوال نہیں ہے' پھر بھی جانے کیوں ہر کوئی اس کا جواب سننے کا متمنی ہوتا ہے۔" ابتہاج نے شرارتی انداز میں خود کلامی کی تھی۔
"بڑی اماں کہتی تھیں نکاح کے دو بولوں کے ساتھ ہی میاں بیوی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔" منائل نے بہت گھما پھرا کر اظہار محبت کیا تھا۔
"ہاں وہ تو تمہاری بڑی اماں کہتی تھیں' تم کیا کہتی ہو۔" ابتہاج مسکراہٹ دباتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"آپ بہت خراب ہیں۔" وہ اس کے سینے میں سر چھپا کر فقط یہ ہی کہہ سکی۔



ذہین ہاؤس میں رونق کا سماں تھا۔ کتنے برسوں بعد وہ سب یوں اکٹھے تھے اور اب تو اکٹھے ہونا بنتا ہی تھا۔ کل جیا کی رخصتی تھی۔ چاروں سکھیاں رت جگے کے موڈ میں تھیں۔ بچے سارا دن کھیل کود کراتنے تھک چکے تھے کہ آج ماؤں کے کہے بغیر ہی شرافت سے سو گئے تھے۔
تین برس پہلے رافع اور مریم پاکستان شفٹ ہو گئے تھے۔ تابش اور عرشیہ کے تین بچے تھے اور تین بچوں کو پال کر عرشیہ اتنی تھک گئی تھی کہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی تھی بچے تین ہی اچھے۔ فریال کو اللہ نے جڑواں بیٹیوں سے نوازا تھا اور وہ ان ہی کو سنبھالنے کے چکر میں ہلکان ہوئے جاتی تھی۔ ڈیڑھ برس پہلے جب فریال پاکستان آئی تھی' تب منائل ذہین ہاؤس نہ آسکی تھی' ایک تو ان دنوں ریان بیمار تھا' پھر اس کا فائنل سمسٹر سر پر تھا۔ فریال اس سے ملنے اس کے سسرال ہی پہنچ گئی تھی۔ بعد کے عرصے میں بھی' منائل کو میکے آنے کا موقع کم کم ہی مل سکا تھا۔ ابتہاج کی فقط یہ ہی عادت بری تھی کہ وہ اسے میکے نہ چھوڑتا تھا۔ اس کے ساتھ آتا اور وہ دو دن ذہین ہاؤس ٹھہر کر اسے ساتھ ہی واپس لے جاتا۔ یہ اس کی محبت کی شدت تھی۔ اس لیے منائل کچھ کہہ بھی نہ پاتی۔ ابتہاج کے مشورے اور حوصلہ افزائی پر ہی اس نے تعلیم کا ادھورا سلسلہ مکمل کیا تھا۔
"میں نہیں چاہتا کہ تم زندگی کے کسی موڑ پر کمپلیکس کا شکار ہو' پھر آج کے دور میں ڈگری کی

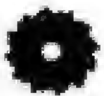
افادیت سے انکار بھی ممکن نہیں لڑکیوں کے پاس کم از کم اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ وہ کسی مشکل وقت میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔" بہت بار کی پڑھی ہوئی بات جب کسی اپنے نے بہت پیار سے سمجھائی تو مناہل سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنے لگی تھی۔

"کسی دباؤ میں آکر نہیں، پوری دلی رضامندی سے فیصلہ کرو۔ میرے خیال میں تو پہلے بھی ناکامی کی بڑی وجہ بڑی اماں کا ڈنڈا اور مضامین کا غلط انتخاب تھا۔ میں نے جب بھی تمہیں گرینڈپا کی اسٹڈی سے کوئی کتاب لاتے دیکھا ہے تو وہ اردو ادب کی کوئی معیاری کتاب ہوتی ہے اور تم نے بی اے میں سبجیکٹ رکھا انگلش لٹریچر، بائی داوے یہ مشورہ کس کا تھا؟" وہ دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ "بڑی اماں کہتی تھیں انگلش لٹریچر کا اسکوپ کہیں زیادہ ہے۔" اس نے سادگی سے بتایا۔ ابتہاج نے سرہلایا تھا۔

"بہرحال اب فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا۔ پڑھائی جاری رکھنے سے لے کر مضامین کے انتخاب تک۔ ناکامی کے خوف کو ذہن سے نکال کر اور کسی دباؤ میں آئے بغیر پڑھو گی تو پھر دیکھنا نتیجہ کتنا مختلف ہوگا۔" ابتہاج نے نرمی سے سمجھایا اور وقت نے اس کا کہا سچ کر دکھایا۔ بی اے کے بعد کتنی سہولت سے اس نے ایم اے اردو بھی کرلیا تھا۔ قدرت نے اس عرصے میں ریان کی صورت میں پیارے سے بیٹے سے بھی نواز دیا۔ ریان تو گھر بھر کا لاڈلا بچہ تھا، پڑھائی کے ساتھ چھوٹے بچے کی پرورش میں مناہل کو قطعاً" کوئی دشواری نہ ہوئی۔ دن میں تو زیادہ تر اس کی تائی ماما ہی اسے سنبھالتی تھیں۔ کبھی کبھی تو مناہل کو لگتا کہ ریان اس کی نسبت نادیہ بھابھی سے زیادہ اٹیچڈ ہے اور ایسے میں اسے کشور سلطانہ شدت سے یاد آتیں۔ خود سے وابستہ رشتوں سے بے لوث محبت کا ہنر اس نے ان ہی سے سیکھا تھا، اسے بھلا نادیہ بھابھی اور ریان کے تعلق پر کیا اعتراض ہونا تھا، لیکن دل کی گہرائیوں سے وہ نادیہ بھابھی کی گود ہری ہونے کی بھی دعا کرتی۔ اس کا وجدان کہتا تھا کہ جس دعا کے بعد دل اطمینان سے بھر جائے وہ قبولیت کا درجہ پاتی ہے اور اسے اپنی دعا کی قبولیت کا انتظار تھا۔

جیا نے ذہین ہاؤس کا اگلا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ ایم اے کے بعد ایم فل کر کے وہ مقامی گرلز کالج میں لیکچرار تعینات ہو گئی تھی اور وہاں وہ اپنے اچھے اخلاق، سلجھی ہوئی عادات اور من موہنی صورت کے باعث پرنسپل کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا اور اب جیا بھی بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا دیس سدھار رہی تھی۔ آج ذہین ہاؤس میں اس کی آخری رات تھی۔ عرشیہ کے بیڈ روم میں وہ چاروں سہیلیاں سر جوڑے بیتی باتیں دہرا رہی تھیں اور عین برابر والے کمرے میں سطوت آرا لیٹی اپنی پوتیوں کی کھلکھلاہٹیں سن رہی تھیں۔ وہ اب بہت ضعیف ہوگئی تھیں۔ عرشیہ اور تابش نے اپنا بیڈ روم ان کے بالکل برابر والے کمرے میں شفٹ کرلیا تھا۔ رات کو کتنی ہی بار عرشیہ ان کے بیڈ روم میں جھانکتی۔ عرشیہ اور تابش بوڑھی دادی کا بچوں سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے۔

اپنے جن پوتا، پوتیوں کے نکمے پن سے سطوت آرا زندگی بھر عاجز رہی تھیں، اب وہی پوتے، پوتیاں ان کے فخر کا سامان تھے۔ انہیں ساری زندگی یہ خدشہ ستاتا رہا تھا کہ ان کے نکمے بچے زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ان بچوں پر اللہ کے خصوصی کرم کے باعث سطوت آرا کے تمام خدشات غلط ثابت ہوئے۔ ایک واجبی پڑھی لکھی عورت نے ان بچوں کو اپنے سے وابستہ رشتوں سے بے غرض محبت کا جو ہنر سکھایا تھا شاید وہی ہنر زندگی کے میدان میں ان کی کامیابی کا باعث بنا تھا۔ سطوت آرا نے معمول کے مطابق اپنی مرحومہ بہو اور بیٹے کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی اور مسکراتے لبوں کے ساتھ اپنی پوتیوں کی کھلکھلاہٹیں سنتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر گئیں۔



سمیہ یاسمین

میں ایک اچھی بیوی ہوں

آج پھر رات کے دو بجے گھر میں گھسا ہے۔ پتا نہیں اتنی رات کو اس کے کون سے یار بیلی باہر بیٹھے اس کے انتظار میں سوکھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کون سی پہیلی ڈال کر بیٹھے ہوتے ہیں جو بوجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مجھے تو پکا یقین ہے یہ پہیلی نہیں بلکہ اس کی کوئی سہیلی ہے۔ جس کے پاس گوڈے سے گوڈا جوڑ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہائے رے میرے نصیب! تو کہاں سویا ہوا ہے؟

میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے جو میں نے اس سے شادی کی ہامی بھری تھی۔ سب نے کتنا روکا مگر میری آنکھوں کے آگے عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں مجھے اس ویلے نکمے 'سارے جہاں کے آوارہ گرد' میں کیا خوبیاں نظر آئی تھیں' جو اس کے ساتھ متھا جوڑ لیا تھا۔ ہائے! میری ماں بہنوں نے کتنا واویلا مچایا۔ مجھے کتنا ڈرایا کہ ایسے گھر نہ جاؤ' آٹھ آٹھ آنسو رونے پڑیں گے' مگر وہ عشق ہی کیا جو انسان کو آبلہ پا نہ نچائے۔ اب میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح چکراتی پھرتی ہوں بےچین ہے کہ پڑتا ہی نہیں۔ دل ہے کہ سنبھلتا ہی نہیں اور میرا بندہ ہے جو سدھرتا ہی نہیں' بلکہ مجھے واثق امید ہے کہ اس نے اپنا قبلہ درست نہیں کرنا۔ میں نے ضرور ڈھیٹ ابن ڈھیٹ ہو جانا ہے۔ آیئے' میں بتاتی ہوں کہ میں کس طرح اس کی بیوی بنی۔

میں ملیحہ ملک جس میں ملاحت نام کو نہیں۔ ایم اے انگلش' کمپیوٹر کورسز' کوکنگ کورسز' ڈیکوریشن کورسز اور نہ جانے کیا کیا کچھ سیکھا ہوا ہے' مگر ایک چیز نہ سیکھ سکی کہ بگڑے ہوئے بندے کو کیسے سدھارتے ہیں۔

میں ابھی بی اے میں تھی کہ کھٹاک سے میرے دل کے سنگھاسن پر میرے تایا کے بڑے بیٹے شاہ میر کا قبضہ ہو گیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ میرے اتنے مہنگے دل پر قابض ہو گیا ہے۔ غلطی سے میں ایک دن ابو کے ساتھ تایا کے گھر چلی گئی' ورنہ میری امی کو قطعاً" یہ پسند نہیں کہ ان ________ اردو بولنے والوں کے گھر جایا جائے۔ شروع ہی سے میری تائی اور امی میں مخاصمانہ رقابت چل رہی ہے۔ تائی کا اردو بولنے والی فیملی سے تعلق تھا اور میری امی پکی پنجابن۔ تائی میری کوئی لگی لپٹی رکھتی نہیں تھیں۔ جب بولنے پر آتیں تو تڑ تڑ تڑ کر کے اگلے کے منہ پر گولیوں کی برسات کر دیتیں اور میری امی ہونق بنی' منہ کھولے دیکھتی رہ جاتیں۔ ابھی وہ جواب سوچ ہی رہی ہوتیں' تائی اپنی بات کر کے یہ جا اور وہ جا۔ امی کے دل کی بہت سی باتیں دل ہی میں رہ جاتیں۔ جب باتوں کا ڈھیر ہو گیا تو امی کا دل تائی کی طرف سے میلا ہی نہیں بلکہ میلا کچیلا ہو گیا۔

امی ہم سے برملا کہتیں کہ ان "چالاکوں" کے گھر میں بیٹی ہرگز نہ دوں گی۔ یہ عورت تو باتوں کی کلاشنکوف چلا کر مار ڈالے گی۔ ابو میرے امی کے بالکل برعکس تھے۔ وہ تائی اور تایا کی بہت تعریف کرتے کہ دونوں بڑے سلیقے سے گھر چلا رہے ہیں۔ بچت بھی ہو جاتی ہے اور بچے بھی اچھے طریقے سے پل رہے ہیں۔

میرے تایا کے چار بچے ہیں۔ شاہ میر' ضمیر' نائلہ اور جویریہ' نائلہ اور جویریہ میری ہم عمر ہیں۔ شاہ میر نے سمپل بی۔ اے کرنے کے بعد کافی سال "ویلے مصروف" گزارے ہیں۔ تایا جان نے بہت چاہا کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرلے مگر یہ میر کے بس کا روگ

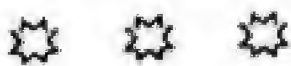


نہیں تھا۔ شہنشاہ بندہ بھلا محنت و مشقت کہاں کر سکتا تھا، مگر باتیں بڑی خوب صورت کرتا تھا اور اتنے خوب صورت پیرائے میں کہ انسان مدتوں ان باتوں کے حصار میں اپنے آپ کو گم پاتا ہے۔ اتنا زبردست شکنجہ کہ انسان لاکھ سر پٹخے مگر اس کا دل صرف پھڑپھڑا کر رہ جائے۔

میں بات کر رہی تھی ابو کے ساتھ، تایا جان کے گھر آنے کی۔ نائلہ اور جویریہ نے ایف۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ نائلہ اپنی عمر سے تین سال اور جویریہ دو سال پیچھے تھی۔ اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ان کے گھر میں ان دونوں "لائق فائق" بہنوں کے "شاندار" نمبروں سے پاس

ہونے کی خوشی میں دعوت تھی۔
امی ۔۔۔ جل کر نہیں گئیں کہ یہ سارے پیسے بٹورنے کے بہانے ہیں۔ آگے کچھ رکھتے نہیں اور پیسے ہتھیا لیتے ہیں۔ مجال ہے کبھی بازار کا سامان لا کر رکھا ہو۔ وہی گھر کے دہی بھلے' چاٹ' سموسے اور بسکٹ۔ زیادہ گرمی ہو تو شربت ورنہ ساتھ چائے' وہ بھی زمانے بھر کی "تکمی"۔ بقول امی کے "کوڈوں کے اتھرو" (آنسو) جس میں دودھ نام کو نہیں اور پتی کو اتنے ابال دیے ہوتے کہ وہ جل جل کر توے کی طرح سیاہ ہو جاتی اور پھر اس میں دو بوندیں دودھ کی ٹپکا دیتے ہیں۔ چینی بھی اتنی کم کہ بس مٹھاس کا تصور ہی کر سکو۔ چلو جی چائے تیار ہے۔
تمہاری تائی کے گھر جانا تو اپنی شامت بلوانا ہے۔ بھوکے پیٹ جاؤ اور بھوکے پیٹ واپس آؤ۔ خاطر کرنا تو اس عورت کو کبھی آیا ہی نہیں۔ جو گھر میں پکا ہوتا ہے وہی پلیٹ میں ڈال کر سامنے رکھ دیتی ہے مجال ہے کبھی کوئی چیز بازار سے منگوائی ہو۔ دو بندے کھاتے ہیں تو ان کے دو بندے بے چارے بھوکے رہ جاتے ہیں اور چٹنی پیاز سے ان کو روٹی کھانی پڑتی ہے۔ ایسی بھوکی اور ندیدی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ بندہ بے چارہ شرمندہ ہو جاتا ہے کہ میں کاہے کو ان کے گھر آگیا۔ اتنا مِنا مِنا۔ (تھوڑا) سا پکاتی ہے کہ آخر والے بندے کو دیگچی میں منہ دینا پڑتا ہے۔ کبھی مہمانوں کے سامنے ڈونگے میں کھانا نہیں رکھا بلکہ پلیٹ میں ناپ کر دیتی ہے کہ آدھی روٹی انسان سوکھی کھا کر اٹھے۔ انتہائی کنجوس عورت ہے۔ بچوں کو ترسا ترسا کر مارتی ہے۔
اس لیے جب تمہارے تایا کے بچے کبھی گھر میں آئیں تو میں ان کو خوب "رجھا" کر بھیجتی ہوں۔ اس طرح کھل کر کھاتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اگر اب نہیں کھائیں گے تو مر جائیں گے۔"
خیر یہ تو امی کے زریں خیالات تھے۔ آج کل جمہوریت کا دور ہے۔ کسی کو زبردستی اپنا ہمنوا نہیں بنایا جا سکتا۔

میں نے اس گھریلو دعوت پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بھی میرے دل کا فیصلہ تھا۔ مجھے بچپن ہی سے شاہ میر کا چہرہ بڑا پیارا لگتا تھا۔ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے دن تھے۔ میں پنک کلر کا کڑھائی ۔۔۔ کیا ہوا سوٹ جو ایک مہنگی بوتیک سے خریدا تھا پہن کر چلی گئی۔ میچنگ شوز اور جیولری کے ساتھ۔ میں خوب صورت تو پہلے ہی تھی۔ اس تیاری نے میرے حسن کو دو آتشہ کر دیا۔
گالوں کا رنگ سوٹ سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑ کر کلپ سے باندھ لیا تھا۔ بالوں کا ڈھیر تھا جس نے میری پشت کو ڈھانپ لیا تھا۔ پنجاب کا سارا حسن سمٹ کر میرے چہرے پر ٹھہر گیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ کسی کے پر فینچ کرنے کے لیے میری ایک تیکھی ادا ہی کافی ہے۔ یہ تو پھر شاہ میر کا معاملہ تھا۔ میرے ان کے پانچ مرلے کے گھر میں داخل ہوتے ہی شاہ میر کی نظر مجھ سے ٹکرائی اور پھر "پتھرا" گئی۔ اتنا بے خود ہوا کہ ابو کو سلام کرنا بھول گیا۔
دعوت میں پھوپھو بھی آئی ہوئی تھیں۔ تائی کی اپنی بہن اور بھائی اولادوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ جو کے سارے عام سے بھی کم شکل و صورت کے مالک تھے۔ ہمارے آتے ہی دعوت شروع کر دی گئی۔ امی کی کمی کو بڑا محسوس کیا گیا۔ میرا چھوٹا بھائی سمیر' وہ تو شاذ و نادر ہی "ایسی" محفلوں کا حصہ بنتا ہے۔ بہنیں میری بیاہی ہوئی' اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم۔ انہیں کیا ضرورت ہے اتنے "وختوں" (مصیبتوں) میں پڑنے کی۔
مجھے شاہ میر نے ایک جذب کے عالم میں کہا "ملیحہ! لگتا ہے کہ یہ سوٹ تو بنا ہی آپ کے لیے ہے' اس سوٹ کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔" میں نے شرماتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ویسے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ منڈا پھنس گیا ہے جبکہ شاہ میر لڑکی پٹا لینے پر مسرور تھا۔



میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے انگلش میں داخلہ لے لیا جبکہ شاہ میر ہنوز فارغ تھا۔ آخر کار تایا اور تائی کے شرم دلانے پر اس نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنی شروع کر دی۔ تایا خود کلرک تھے جو

کہ ترقی کرتے ہوئے سولہویں گریڈ تک پہنچ گئے تھے۔ اب اس سے آگے وہ جا نہیں سکتے تھے۔ شاہ میر بھی کلرک ہو گیا۔

یونیورسٹی میں آکر بہت سے لوگوں نے مجھ سے دوستی کی کوشش کی مگر میرے نینوں میں شاہ میر کا بسیرا تھا، اس لیے سارے بے مراد ٹھہرے۔

میرے ایم۔ اے کرتے ہی فٹ سے دو رشتے میرے گھر میں آ ٹپکے۔ ایک شاہ میر کا اور دوسرا پھوپھو کے بیٹے کمال کا۔ جو کیمیکل انجینئر تھا اور کمال کے ساتھ ساتھ جمال بھی رکھتا تھا یعنی مردانہ حسن سے لبریز تھا۔ میری پھوپھو اور پھوپھا بڑے خوب صورت تھے، جبکہ کمال ان کا اکلوتا ولی عہد تھا۔ جتنا خوب صورت تھا اتنا لائق فائق بھی تھا۔ ان ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ اتنا "مسٹرا ایسا" ہوتا کہ بندے کا منہ حلق تک کڑوا ہو جاتا۔ ہر وقت کریلے اور نیم چباتا رہتا۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا توپ چیز سمجھتا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی گورے چٹے مرد پھیکے شلجم لگتے ہیں۔

امی کی کوشش تھی کہ ان کی باقی دو بیٹیوں کی طرح میری شادی بھی ان کے میکے میں ہو۔ مگر میرے جتنا وہاں کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ زیادہ تر انگوٹھا چھاپ تھے یا پھر میٹرک ایف۔ اے اور میں نے شرط بی۔ اے تک کی رکھی تھی وہ بھی شاہ میر کو دیکھ کر۔ اب میرے گھر والوں کو ان ہی دو رشتوں میں سے چناؤ کرنا تھا۔ سب کو قوی امید تھی کہ کمال جیت جائے گا۔ ابو کو چونکہ اپنی بہن اور بھائی دونوں عزیز تھے اس لیے انہوں نے ووٹ کا حق مجھے دے دیا۔

اس وقت سب گھر والے حق دق رہ گئے جب شاہ میر کے جیتنے کی خوش خبری میں نے سنائی۔ مدیحہ آپی اور صبیحہ آپی بھاگی بھاگی آئیں کہ یہ کیا غضب کرنے جا رہی ہو۔ امی کو تو خوف کے مارے بخار چڑھ گیا کہ اب وہ اپنی بیٹی کی "بلی" چڑھانے لگی ہیں۔ سوائے ابو کے میرا فیصلہ کسی کو پسند نہیں آیا۔ سب نے مل کر لاکھ سر پٹخا مگر میں بھی ایک انچ نہ ہلی۔ میرے بچپن کی پسند، جوانی کی امنگ اور دل کی ترنگ کے جلترنگ بجنے کا دن آرہا تھا۔ میں بھلا کیسے انکار کر سکتی تھی۔ مجھے تو سوتے جاگتے شاہ میر کے خواب آتے تھے۔ یونیورسٹی میں اتنے چانسز تھے مگر میں نے کسی "گھوڑے" کو گھاس نہیں ڈالی۔ اب بھلا میں اپنی دلی خواہش سے کیسے دستبردار ہو سکتی تھی۔

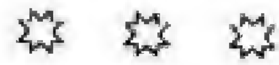


یہ بات طے ہے کہ شاہ میر کو میں دل سے پسند کرتی تھی۔ وہ تمام خامیوں سمیت میری آنکھوں میں گھسا تھا۔ جب عشق کا معاملہ ہو تو پھر نفع و نقصان نہیں دیکھا جاتا۔

شاہ میر مجھے سارے کا سارا اچھا لگتا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز، ہونٹوں کا خم، بالوں کا سڑا ہوا اسٹائل۔ بڑی بڑی مخمور آنکھیں اور شاہ بلوط کی طرح اونچا لمبا قد۔ بالکل تایا کی کاپی تھا مگر رنگ اپنی ماں سے چرایا تھا۔ میرے ساتھ کھڑا ہو کر ایسے لگتا تھا جیسے بلیک اینڈ وائٹ کی جوڑی ہو۔ اب اتنی خوبیوں کے ساتھ اک "ذرا" سی خامی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات میری گوری چٹی بہنوں اور ماں سے ہضم نہیں ہو رہی تھی، جبکہ سمیر نیوٹرل تھا۔ کہاں میری بہنیں، خوب امیر گھروں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ مدیحہ آپی قصور کے ایک قصبے میں بیاہی ہوئی تھی۔ بڑے جاگیردار لوگ تھے۔ گھر میں ہی ان کی عورتیں ایسے زیور چڑھائے پھرتیں جیسے کسی شادی پر جا رہی ہوں۔ بڑی آپی بھی بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں دونوں کلائیوں میں گھماتی رہتیں۔ کان اور گلا کبھی ننگا نہیں رہتا۔ صبیحہ آپی ایف اے پاس بزنس مین سے بیاہی ہوئی تھی۔ جس کی شاہ عالمی میں کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ دس بارہ تو ملازم ہی رکھے ہوئے تھے۔ فاروق

بھائی خود کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے پھیل رہے تھے۔ جبکہ مدیحہ آپی کے میاں اکبر علی بھی ڈیل ڈول کے تگڑے تھے۔



میری شاہ میر کے لیے ہامی بھرنے پر سب سے زیادہ "تڑفا" کمال کو ہوا۔ وہ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا توپ چیز سمجھ رہا تھا کہ اس کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ وہ جل جل کر "سوا" (خاک) ہوگیا۔ اسے مجھ سے یہ امید نہ تھی۔ خیر مجھے کیا میں نے اسے کون سی امید سد ہوائی تھی۔

آخر کار اتنی مخالفتوں کے بیچ' میری شادی خانہ آبادی شاہ میر سے ہوگئی۔

ابو میرے سوت کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے خوب جی بھر کر جہیز دیا۔ جبکہ ازل سے کنجوس تائی سات سڑے ہوئے سوٹ اور پونے تین تولے کا وزنی سیٹ لے کر آئی جس کو پہن کر شرم کے مارے میری گردن جھکی جارہی تھی۔ بارات میں تین سو کے قریب باراتی لے کر آئے اور ولیمہ پر انہیں اسلام کی سادگی کے سنہری اصول یاد آگئے۔

صرف گھر کے ہی لوگ آئے۔ جن کو گھر کا پکا ہوا شوربے والا سالن جس میں ڈبکی مارو اور بوٹی ڈھونڈو' کھلایا۔ میٹھے میں گڑ والے چاول پکالیے۔ چلو بھئی! ولیمہ کی دعوت ہوگئی۔ ولیمہ میں نائلہ اور جویریہ کے سلیقے کی اتنی گردان کی گئی کہ پھوپھو بار بار نائلہ کو لپٹانے لگیں۔ میں دلہن بنی ہوئی کلس کر رہ گئی۔ کمال انتقاماً" شادی میں شریک نہیں ہوا۔ ٹور کا بہانہ کرکے اسلام آباد سدھار گیا۔



شادی کے چند دنوں بعد ہی میں مجھے احساس ہوگیا کہ شاہ میر' میرا سچا اور پکا دیوانہ ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اتنے بھرپور انداز سے میری پذیرائی کی کہ میں اپنی قسمت پر نازاں ہوگئی۔ آنکھ تو میری اس وقت کھلی جب میں نے تائی کے بدلے بدلے تیور دیکھے۔

ان کی سلیقہ شعار اور ہنرمند بیٹیاں جو کام کرکے تھکتی نہ تھیں۔ اب کام سے شاکی نظر آنے لگیں۔ ہر وقت کام کی زیادتی اور تھکن کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا۔ بیچاریاں دن سے رات کردیتیں۔ اور کام ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ پتا نہیں کونسی کنکریوں والی گندم چھننے بیٹھتی تھیں جو صاف نہیں ہوتی تھی۔

دن میں ایک بار سالن پکتا تھا۔ تیل اس میں برائے نام ہوتا اور لمبا شوربہ ہوتا جو کہ دونوں وقت چلایا جاتا۔ روٹی ایک بار نائلہ پکاتی تو دوسری بار جویریہ۔ ہفتے میں ایک بار مشین لگتی۔ صفائی بھی مل بانٹ کر کی جاتی۔

تائی کے گھر آکر میں' پہلی بار مختلف سالن کے ذائقوں سے آشنا ہوئی جیسے شوربے والی بھنڈیاں' لوکی کا لمبا سالن' پتلا پتلا آلو پالک۔ دالیں اکثر پکتیں اور ایسی ہوتیں کہ انسان ذائقہ تلاش کرتا رہ جاتا۔ پھر بھی پتا نہ چلتا کونسی دال پکی ہے۔ مرغی ہفتہ میں ایک بار پکتی وہ بھی صرف گردنیں۔

پہلے پہل میں حیران ہوئی پھر پریشان ہونا شروع ہوگئی۔

✲ ✲ ✲

تائی نے پینترا بدلا تو میں نے بھی کینچلی اتاردی۔ تایا تو بے چارے تائی کے "تھلے" (نیچے) لگے ہوئے تھے۔ ایک ضمیر' واحد بندہ ایسا تھا جو باضمیر تھا۔ تائی کا سب سے لائق بیٹا جو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ برا ہی منہ پھٹ' بدتمیز اور انصاف پسند تھا۔ وہ سب کے منہ پر کہتا تھا کہ ____ میں گھر بسانے کے بعد اپنی بیوی کو کبھی بھی یہاں نہیں رکھوں گا۔ تائی اسے کوسنے دیتیں کہ اس پر اتنا روپیہ پیسہ لگایا اب کھانے کی باری آئی ہے تو کیسی پرایوں جیسی باتیں کرتا ہے نگوڑمارا' بے فیض۔ اس کے سارے اطوار اپنے داد کو پر گئے ہیں۔

تائی' امی کو پینڈو کہتی۔ تائی دراصل اپنی سانولی سلونی' پھینی سی بھانجی لانا چاہتی تھی مگر شاہ میر نے

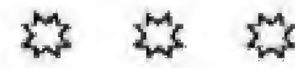
"رولا" ڈال دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف مابدولت سے۔ اب ایسے میں میں مغرور نہ ہوں تو کیا ہوں۔"

شاہ میر روزانہ دفتر سے واپسی پر کبھی تکہ کبھی لیگ پیس اور کبھی دہی بھلے ہیلمٹ میں چھپا کر لے آتا اور ہم اسے بند کمرے میں کھاتے۔ ساس میری بلی کی طرح خوشبو سونگھتی پھرتیں۔ انہیں یہی کہہ کر مطمئن

کیا جاتا کہ ساتھ والے گھر میں کچھ پک رہا ہے۔ وہ بھی ایسی کائیاں ــــ یہی کہتیں کہ خوشبو باہر نہیں گھر کے اندر سے آرہی ہے۔ اب ان کے نتھنے اتنے حساس ہیں تو ہم کیا کریں!

"میرا تمکین شہزادہ" ہفتے میں دو تین بار شام کو باہر لے جاتا' رات کو کھانا بھی باہر کھاتے۔ تائی جو اب میری پکی ہٹلر ساس بن چکی تھیں' پوچھتیں کیا کھا کر آئے ہو۔ میں فٹ جواب دیتی۔ نان چنے یا نان پکوڑے۔ جب میرا زیادہ ہی اچھا کھانا کھانے کو جی چاہتا پھر میں شاہ میر کے ساتھ امی کے گھر آجاتی۔

امی میری' بچھ بچھ جاتیں۔ خوب خاطریں کرتیں۔ سمیر اور ابو بھی شاہ میر کو خوب کمپنی دیتے۔ ساس کا بڑا دل چاہتا بیٹے کے سسرال جانے کو' مگر موٹر سائیکل کی سواری بنانے والوں کا خدا ڈھیروں ڈھیر بھلا کرے' دو لوگ ہی بیٹھ سکتے' آخر کو موٹر سائیکل ہے کوئی چھکڑا تو نہیں۔ رکشے کے پیسے یہ کنجوس عورت خرچ نہیں کر سکتی۔ ایسے میں انہیں اچھا کھانا کہاں سے نصیب ہو؟



دیر سے سونا اور دیر سے اٹھنا۔ میں نے وتیرہ بنالیا۔ جب گیارہ' بارہ بجے اٹھتی اس وقت تک سب کام ہو چکے ہوتے۔ ساس میری کو ٹینکے لگ جاتے مگر وہ کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ میں ایک چپ سو سکھ والے محاورے پر عمل کر رہی تھی کہ ایسے میں کمال کی بات پھوپھا کے بھائی کے گھر طے ہو گئی پھر تو گھر میں سوگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کمال نے "بلیک کو مین" سے

شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ انتقاماً "بھی ایسی حرکت کرنے سے گریزاں تھا۔ پھوپھو کو طوعاً" و کرہاً" بیٹا سسرالیوں میں دینا پڑا۔

نائلہ کا رشتہ بھی آناً "فاناً" طے ہو گیا اور شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ ازل سے کنجوس تائی نے قارون کے خزانے کا منہ کھول دیا۔ نائلہ کو جی بھر کے جہیز دیا۔ شادی بھی تھری اسٹار ہوٹل میں کی۔ اب سارا اسلام بھولا ہوا تھا۔

بقول تائی کے "جب دل کی خوشی ہو تو پھر تھوڑی سے فضول خرچی کی جا سکتی ہے۔"

نائلہ شادی کے پندرہ دن کے اندر اندر علیحدہ ہو گئی۔ اور میں نے مہینہ بھر کا راشن پندرہ دن میں ختم کر کے تائی کے گھر پہلا اور آخری ریکارڈ قائم کیا۔ تائی تملا کر رہ گئیں۔ مجھے بہت کہا کہ تیل کم ڈالا کرو۔ دالیں پتلی رکھا کرو۔ زود ہضم ہوتی ہیں مگر میں وہ ملیحہ ہی نہیں جو کسی کی غلط بات سنوں۔ ایک کان سے سنا' دوسرے سے اڑا دیا۔ ضمیر بڑا خوش کہ اب گھر میں کھانے کا مزہ آتا ہے۔ سلاد بھی بنتا ہے اور سالن میں ذائقہ بھی ہوتا ہے۔ میرا کلرک بادشاہ بھی میری پیٹھ ٹھونکتا رہتا۔



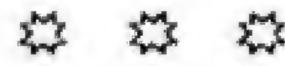
چند مہینوں میں' میں نے گھر میں اتنے کھلے دل سے پکایا۔ ہر آئے گئے کا خیال رکھا۔ دن میں' دو دو بار سالن پکایا۔ سسر جو بیچارے میرے تایا ہوتے ہیں' کا خوب خیال رکھا۔ نائلہ اور اس کے کالے کلوٹے شوہر کو مرغ مسلم پکا کر کھلایا۔

میری ساس اور نند میری برائیاں ہر آئے گئے سے کرتیں۔ جب اگلا پوچھتا "کیا کام چور ہے؟ آگے سے جواب دیتی ہے۔" تب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ میرا ان کے گھر رہنا گویا ان کے سینے پر سانپ بلکہ بچھو اور کن کھجورے لوٹنا تھا۔ میں ہر وقت دھیمی دھیمی مسکراہٹ لیے سارے گھر میں دندناتی پھرتی۔

آپ بھی سوچتے ہوں گے کیا میں تھکتی نہیں تھی؟ تو جناب! میں پنجاب کی جٹی ہوں۔ کام کر کے نہیں

تھکتی۔ اگر تھک بھی جاتی تو ہمت نہ ہارتی۔ آخر کو میں نے ان کو اسی طرح جلا جلا کر مارنا تھا۔ یہ دونوں کام چور حسینائیں (ساس اور نند) اب مجھے علیحدہ کرنے کا منصوبہ ترتیب دینے لگیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اور وہ اس کو ملنے والی تھیں۔ میں نے آخر ان کی ساری بچت تباہ و برباد کردی تھی۔

بیاہی نند بھی میری طرف دار بن گئی۔ آخر اسے یہاں آکر پروٹوکول ملتا تھا۔ سسر اور دیور تو پہلے ہی میری مٹھی میں تھے۔



آج مجھے علیحدہ ہوئے تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ چند مہینے تو۔۔۔۔ بڑے سکون سے گزرے اس کے بعد میں جیسے سکون کو ترس گئی۔ دل ہر وقت ڈر، خوف اور وہم کا شکار رہتا۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ جس "نٹ پونجیے" کی خاطر جوگ لیا تھا وہ لاپروا بلکہ بے وفا ہو رہا ہے۔

اب دیکھیں نا! جو بندہ ہفتے میں چار دن، رات کے دو دو بجے گھر آئے وہ تو مشکوک ہوا نا! آرام اس کی "ہڈیوں" میں اس طرح سمایا ہوا ہے کہ مجال ہے کوئی پارٹ ٹائم جاب کرے۔ اب تو اس کی ایک بیٹی مریم بھی دنیا میں آگئی ہے۔

جب میرے گھر بیٹی پیدا ہوئی تو میں ڈر کے مارے اسے دیکھ نہیں رہی تھی کہ پتا نہیں "دادکو" پر گئی ہے کہ "نانکو" پر۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمام نقوش میرے چرائے۔ اتنی پیاری اور حسین بچی کو پاکر میں تھوڑی مغرور ہوگئی۔ شاہ میر تو مریم کو حد سے زیادہ چاہتا تھا مگر پھر بھی کوئی سائیڈ بزنس کرنے کو تیار نہ تھا۔

آرام جس کی "ہڈیوں" میں بیٹھ جائے اس بندے سے محنت و مشقت بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟ جس پانچ مرلے کے مکان میں ہم اب رہ رہے ہیں وہ میرے ابو اور شاہ میر کے چاچا نے اس وقت دیا جب میری ساس نے مجھے گھر بدر کردیا کہ وہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ ہر وقت گھر میں لنگر جاری رکھا جائے۔ تایا اور ضمیر نے بڑی کوشش کی مگر اس "آمر" کے آگے معصوم سی حزب اختلاف کی کچھ نہ چلی۔



ضمیر شادی کے بعد اپنی مرضی سے بیوی کو لے کر انگلینڈ مزید اسٹڈی کے بہانے چلا گیا۔ سارا خرچہ اس کے سسرال والوں نے اٹھایا۔ تائی کو حسرت ہی رہی کہ بہو رانی کے "ناز" اٹھاسکیں۔ بہو رانی، فرحت جانتی تھی کہ وہ ان کے ناز برداشت نہ کرسکے گی۔

سسرال میں رہنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

اب تایا کا گھر ویران ہوگیا۔ تائی کو سارا کام خود کرنا پڑتا۔ جویریہ پہلے کون سا دل سے کام کرتی تھی۔ شادی ہو نہیں رہی تھی اس لیے ہر وقت مرچیں چباتی رہتی۔

بات ہو رہی تھی شاہ میر کی۔ شاہ میر سے شادی کرنے کے بعد آپ سمجھ رہے ہوں گے، میں پچھتاوؤں کی زد میں آگئی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ کام چور، نکما مجھے دل سے پیارا ہے۔ اب اتنا بھی نمکین نہیں، میں ہی کچھ زیادہ گوری چٹی ہوں تو اس میں بیچارے بندے کا کیا قصور؟

شاہ میر کو مجھے الگ رکھ کر دیکھا جائے تو وہ دنیا کا حسین مرد ہے، جس پر لڑکیاں دل و جان نثار کرسکتی ہیں۔ اب میں حسین ترین ہوں تو اس بیچارے کو کیا کہنا۔ جو بندہ گورنمنٹ کی نوکری ایک بار کرے اور وہ بھی کلرکی، پھر تو آرام اس کی نس نس میں سما جاتا ہے۔ وہ کسی اور کام "جوگا" نہیں رہتا۔

میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میں میٹرک فیل ہوتی اور پھر میں اپنی زبان کے جوہر دکھاتی۔ آہا۔ ہاں پھر دیکھتے میں کیسے سب کے پر کاٹتی۔ ایک ایک کو پکڑ کر سیدھا کردیتی۔ ہر کوئی میری زبان دانی سے خوف کھاتا اور اپنے اگلے پچھلے تمام گناہ بخشواتا۔ اگر میں میٹرک فیل ہوتی تب نا!

ویسے ایک بات ہے۔ مرد کے لیے بیوی میٹرک پاس یا میٹرک فیل ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ اگر زیادہ تعلیم ہو تو مرد پھیل جاتے ہیں اور نہ بھی پھیلیں تو ان کی ذہنیت وہی دقیانوسی اور تھرڈ کلاس رہتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی بیوی کی صحیح بات مانی ہو۔ ہر بات پر اختلافی نوٹ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

لیکن میرے شاہ میر میں ایسی کوئی برائی نہیں ہے۔ بس وہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے خاوند پر ہر کوئی اسی طرح پردے ڈالتا ہے۔



ایک تقریب میں کمال کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ اچھی بھلی خوب صورت لڑکی تھی مگر ڈری ڈری اور سہمی سہمی۔ جیسے اس چڑیا کو باگڑ بلے کا خوف ہو۔

میرے کریدنے پر سہمی بولی۔ "کمال کو پسند نہیں ہے کہ میں کسی سے ہنس کر بات کروں۔ صنف مخالف سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میک اپ تک نہیں کرنے دیتے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس شکی طبیعت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ پھر کئی کئی دنوں تک بول چال بند کر دیتے ہیں۔ اپنی امی کی بات بھی نہیں مانتے۔"

میں نے دور سے نثار ہوتی نظروں سے شاہ میر کو دیکھا۔ مجال ہے کہ میری کسی "حرکت" کا برا منایا ہو۔ میں جس سے مرضی ہنس بول رہی ہوں۔ قہقہے لگا رہی ہوں کبھی بھی باز پرس نہیں کی۔ بات ساری اعتماد کی ہوتی ہے۔ اب شاہ میر کو مجھ پر حد سے زیادہ اعتماد ہے تو دوسروں کو اس سے جلنے کی ضرورت نہیں۔

بس مجھے ہی اعتبار نہیں ہے۔ راتوں کو دیر سے آنا مجھے شک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مانا کہ اسے رات کو میرے بغیر نیند نہیں آتی مگر یہ "ہڈی" کسی طور بھی میرے حلق سے اترنے والی نہیں۔ آخر سوچنے والی بات ہے کہ آدھے گھنٹے کا کہہ کر تین چار گھنٹے کے لیے

غائب ہو جانا 'دل کو واہموں کے "وس" ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ ایک ان دیکھی "چڑیل رانی" مسلسل میرے اعصاب پر ہتھوڑے برساتی رہتی ہے اور کہتی رہتی ہے "نہ کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے، وچ پسوڑی پاواں گے۔" اب آپ ہی سوچئے مجھے اس "نمک پارے" پر غصہ نہ آئے تو کیا آئے۔



آج کتنے دنوں سے رات کو دیر سے گھر نہیں آئے بلکہ دوپہر کے بعد جو گھر بیٹھتے ہیں بیٹھے ہی رہتے ہیں۔ اتنے فارغ بندے پر غصہ نہ چڑھے تو اور کیا چڑھے۔ میں نے بھی غصے سے برتن توڑنے شروع کر دیے۔ مریم کے ضد کرنے پر ایک کس کر تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ یہ "پلاؤ ڈش" اپنی بیٹی کے رونے پر تڑپ اٹھا۔

"آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ نہ تم گھر میں چین لینے دیتی ہو اور نہ باہر۔ چاہتی کیا ہو تم؟ آج ذرا کھل کر بتا دو۔"

"میں نے کیا چاہنا ہے؟ آخر میری اوقات ہی کیا ہے؟ آپ نے کبھی میری مانی ہے۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کرلیں۔ مہنگائی اتنی ہو گئی ہے۔ آپ کی تنخواہ پوری نہیں پڑتی۔ بچے بڑے ہوں گے 'مزید خرچے بڑھیں گے۔ کشکول تھامے کس کے دروازے پر جائیں گے۔"

"تو نہیں علیحدہ ہونا تھا۔ عورتوں کو علیحدہ ہونے کا شوق بڑا ہوتا ہے۔ بعد میں خرچوں کے لیے واویلا کرتی ہیں۔ مجھ سے بس یہی کچھ ہو سکتا ہے' سمجھیں تم اور ویسے بھی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے لیے بھی تین چار لاکھ چاہیے۔ وہ میں کہاں سے لاؤں؟ کیا ڈاکا ڈالوں یا چوری کروں؟" شاہ میر تنک کر بولا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے۔ اس کے لیے میرا زیور حاضر ہے۔ شاہ میر آپ کام کے لیے سوچئے تو سہی۔ میں اپنا سارا زیور بیچ دوں گی۔"

میرے پاس پونے تینتیس تولے سونا ہے۔ جس میں تیس تولے جہیز کا اور پونے تین تولے بری کا۔ مگر یہ "ویلا مصروف" سہل پسند پھوا' کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا کہ مجھے کسی چیز کا تجربہ ہی نہیں۔ فضول میں اپنا قیمتی زیور گنواؤ گی۔

بس پھر کیا تھا مجھے غصہ چڑھ گیا۔ شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار۔ میں نے اپنے اور مریم کے ضروری کپڑے بیگ میں ٹھونسے اور گھر سے یہ کہہ کر باہر آ گئی کہ "جب کوئی کام کا ارادہ ہو تو لینے آجانا۔ ورنہ میں اپنے ماں باپ کے گھر خوش اور تم جس طرح مرضی رہو۔ بلکہ تمہیں تو کھلی چھٹی مل گئی ہے۔ اب رات کو بھی گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہنا وہیں اپنی کسی "موتی سوتی" کے پاس۔"

بادشاہ سلامت کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تو میں نے دیکھا مگر اب پلٹنا ممکن نہیں تھا۔ اس افریقہ کے بادشاہ نے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے اس کا ہر طرح کے حالات میں ساتھ دیا۔ اب یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش نہیں پوری کر سکتا تھا۔



آج تیسرا دن ہے مجھے امی کے گھر آئے ہوئے۔ کسی کو بھی نہیں پتا کہ میں لڑ کر آئی ہوں۔ میرا مثالی عشق سب پر عیاں ہو گیا تھا۔ امی تو اب شاہ میر کے گن گاتی تھیں۔ تیمر کی بھی شادی ہو گئی تھی وہ آج کل اپنی بیوی کو لے کر پنڈی گیا ہوا تھا۔ بس آج کل میں آنے والا تھا۔ امی نے مجھے دونوں آپیوں کے شوہر نام داروں کے متعلق بتایا کہ مدیحہ آپی کے شوہر نظروں کو سینکنے کے لیے کوٹھے پر جاتے ہیں اور صبیحہ آپی کے بے ڈھنگے "میاں" کسی بلی کو پھنسانے کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں 'جو ان کی دکان سے کپڑے لینے آتی ہے اور مفت میں ڈھیروں کپڑے لیے کر اس "سانڈ" کو الو بنا کر چلی جاتی ہے۔ یہ ۔ چھچھڑوں کا ذائقہ ہی محسوس کرتے رہ جاتے ہیں۔

دو دن تو میں نے صبر کیا اور تیسرے دن رکشا منگا کر گھر کے دروازے پر آ گئی۔ بیل دینے کے لیے ابھی انگلی بٹن پر رکھی ہی تھی کہ میری دل کی دنیا نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"شکر ہے تم آ گئیں۔ میں تمہیں ہی لینے آ رہا تھا۔ سچ، تمہارے بغیر یہ گھر کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ مجھے تو رات کو نیند ہی نہیں آتی تھی۔ تمہارے بغیر اب سونے کی عادت نہیں رہی۔ مریم نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا۔ تم دونوں تو میری زندگی ویران کر کے چلی گئی تھیں۔ دو دن سے دفتر بھی نہیں گیا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے تو اب احساس ہوا ہے کہ میں تو تمہارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ تم نے مجھے اپنا اتنا عادی بنا لیا ہے۔"

جان عالم بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ مجھے ذرا بھی شرمندگی کا احساس نہیں دلایا کہ اس کے بلائے بغیر ہی آ گئی ہوں۔ بلکہ میرے دل پر ملال کے بادل کو پیار کی پھوار سے دھو ڈالا۔

میں بھی دو راتیں سو نہ سکی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے بھی اس مغل اعظم کے بغیر نیند نہیں آتی، جب تک میرے بادشاہ کا ہاتھ میرے کندھے پر نہیں ہوتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تیسری رات بھی ہم نے جاگ کر گزاری۔ پوچھیے بھلا کیوں۔؟



شاہ میر نے میری بات کا مان رکھ کر میرے پیار پر اپنے اثبات کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے شاہ میر کے ساتھ مل کر اپنے ہی علاقے میں ایک پرائمری اسکول کھولا۔ شروع میں کافی دقت کا سامنا ہوا مگر پھر اچھے معیار کی بدولت اسکول چل پڑا۔

اب شاہ میر کلرکی نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ہائی اسکول کا پرنسپل ہے۔ میں نے شروع میں اسکول چلانے میں اس کی کافی مدد کی، مگر اس کے بعد میں نے اسکول شاہ میر کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کو چلانا اور سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ میں آپ کا گھر اور بچے سنبھالتی ہوں۔"

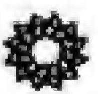
بولیے! میں نے ٹھیک کیا نا۔ دراصل جب عورت مرد کی بیساکھی بن جاتی ہے تو پھر مرد، دوڑنا پسند نہیں کرتا۔ ہر کام میں بیوی کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ یہیں سے کام چوری کی ابتدا ہوتی ہے۔ مانا کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں مگر اس گاڑی میں پیٹرول ڈلوانا اور دھکے لگانا مرد آہن کا کام ہے صنف نازک کا نہیں۔



اف توبہ! اب تو پانچ بجنے والے ہیں۔ اسکول کا ٹائم تو ڈیڑھ بجے تک کا تھا۔ یہ مصروف بندہ اب تک گھر کیوں نہیں پہنچا؟ ایک تو اسکول میں اس نے کم عمر حسینائیں ٹیچرز رکھی ہوئی ہیں۔ یہ مرد بھی نہیں سدھر سکتے۔ گھر میں چاہے ان کی حسین و جمیل بیوی موجود ہو مگر یہ نظرباز، کسی نوجوان "چوڑی" (جمعدارنی) کو دیکھنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اسکول میں تو پھر اپ ٹو ڈیٹ دوشیزائیں رکھی ہوئی ہیں۔ کتنا کہا، بڑی عمر کی ٹیچرز صحیح رہتی ہیں، مگر یہ میری مانے تو بات ہے نا۔ ان مردوں کا دل چیرا جائے تو اس میں سے ایک لمبی لسٹ نکلے گی جس میں مختلف لڑکیوں کا ذکر ہوگا۔ ہر ایک سے ان کا سچا اور پکا عشق ہوتا ہے۔ کسی لڑکی کی کوئی ادا پسند ہے تو کسی کی کوئی اور۔

بس یہ ایک شک ہی تو ہے جو عورت کو چین نہیں لینے دیتا۔ اگر عورت شک نہ کرے تو یہ مرد مزید پھیل جائیں۔ یہ شک ہی تو ہے، جو مردوں کو روکنے کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے، مگر جس نے رسیاں تڑوانی ہوں وہ کسی چابک سے نہیں ڈرتے۔ ویسے سوچنے والی بات ہے کہ پانچ سے اوپر کا ٹائم ہو چلا ہے، میرا مصروف شہزادہ ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا؟۔

اف! آج پھر کراکری کی شامت آئے گی۔ آخر کب تک!!!



نمرہ احمد

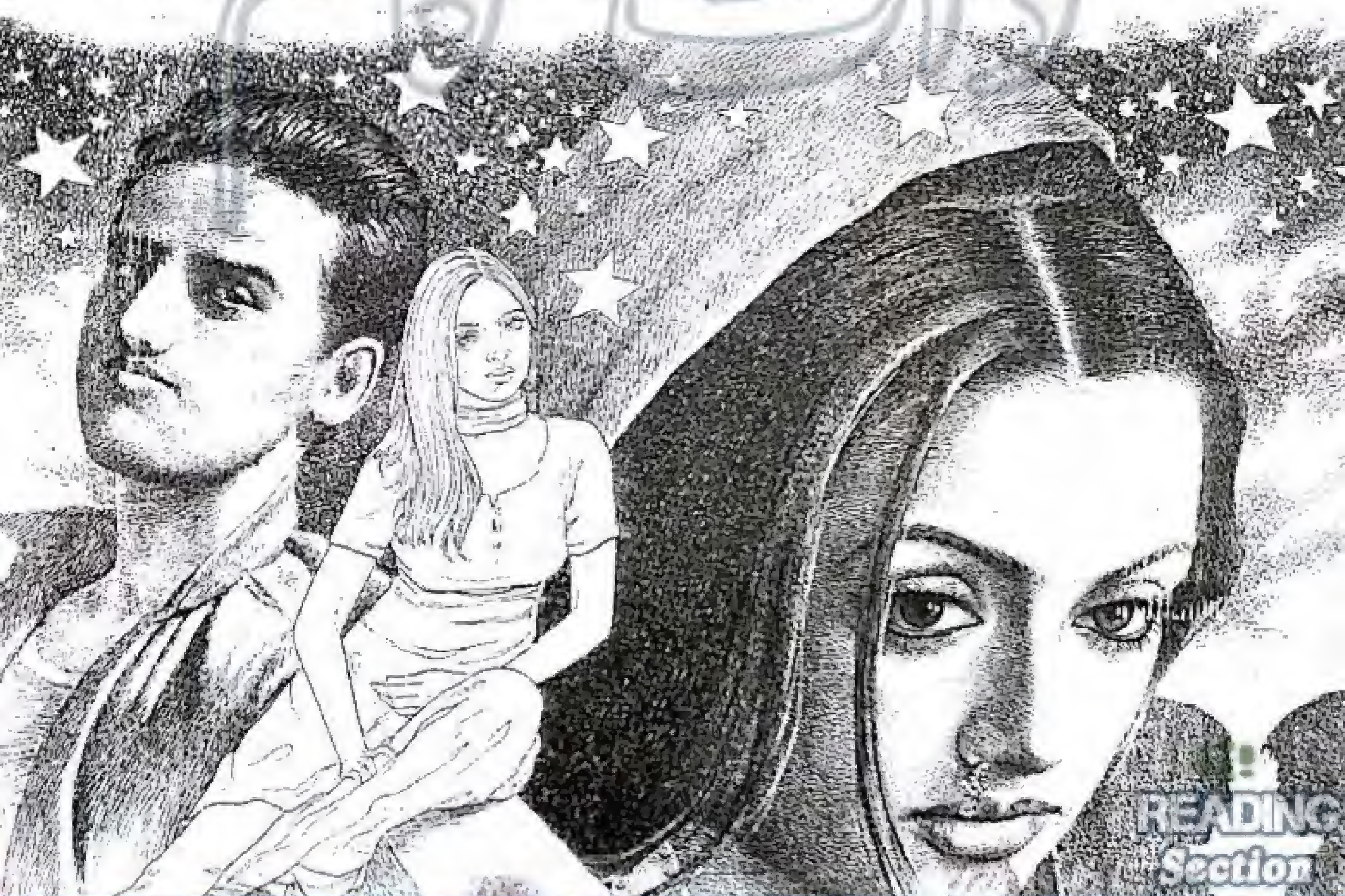
نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔



جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔
فارس غازی، ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں، جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔
والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی، ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے، جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے، بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
چیف سیکریٹری آفیسر خاور، ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔
نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "انس اینڈ آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس ' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کررہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی' ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضایع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کررہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام

ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی' زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے' مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی بیسٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین' وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں' مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کرچکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے' جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہوجاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم' حنین کو بتادیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔
فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔
ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔
ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے 'کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔
وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔
اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔
تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔
حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیروا پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔
سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" زمر نے پوچھا۔
"مثلاً"..... مثلاً "ہاشم کا کردار....." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔
زمر کو ہاشم کا کردار کے ملوث ہوتے پر یقین نہیں آتا سعدی' زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔
حنین' علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے' جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو اِن کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے

کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔
ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔
اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے ________ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

پندرہویں قسط

"اور وحی کی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف!"

یہ وہ کمرہ ہے جہاں میں کبھی نہیں گئی
یہ وہ کمرہ ہے جہاں میں کبھی سانس نہیں لے سکی
اندھیرا یہاں چمگادڑ کی طرح پھیلا ہے
کوئی روشنی نہیں سوائے ایک مدھم ٹارچ کے
(شہد کی مکھیوں کی) چینی زردی ہر شے پہ ہے
اور سیاہ غلبہ۔ سیاہی ہم۔ساس ملکیت
مگر یہ وہ ہیں، جو میری مالک ہیں
نہ ظالم نہ بے حس۔ صرف لاعلم
یہ شہد کی مکھیوں کا وقت ہے!
سرما میں وہ خود کو سارے برف زار میں پھیلا لیتی ہیں
جہاں گرم دنوں میں مکھیاں صرف اپنے لاشے اٹھاتی تھیں
شہد کی مکھیاں سب عورتیں ہوتی ہیں
کنیزیں اور ملکہ
وہ اپنے مردوں سے چھٹکارا پا چکی ہوتی ہیں
موسم سرما عورتوں کے لیے ہے
کیا اس سرما میں ان کا چھتہ برقرار رہ پائے گا؟
کیا وہ اگلے سال میں داخل ہو سکے گا؟
وہ کس چیز کا ذائقہ محسوس کریں گی؟
کرسمس کے گلابوں کا؟
شہد کی مکھیاں آزاد اڑنے لگی ہیں
وہ بہار کی چمک محسوس کر رہی ہیں
(سلویا پلاتھ)

ہاشم سے جلد معذرت کر کے وہ دونوں واپس آگئیں۔ خاموش۔ بالکل خاموش۔
گھر میں کھانے کی میز سیٹ تھی۔ حنین اور زمر چپ چاپ آکر بیٹھ گئیں۔ کھانا شروع ہوا۔ حنین نے چند لقمے بمشکل لیے۔ زمر کی تو بھوک مر چکی تھی۔
فارس کھانا کھاتے ہوئے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

ادھر کھانا ختم ہوا' ادھر حنہ تہہ خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ بھی تیزی سے پیچھے گئی۔ سب مڑمڑ کر ان کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں کیا ہوا؟

پہلے زمر نے تہہ خانے کا دروازہ لاک کیا۔ پھر نیچے آئی تو دیکھا' حنہ ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ ساتھ میں نفی میں سرہلا رہی تھی۔

"حنین! یاد ہے میرے نکاح والے روز سعدی کسی حلیمہ سے اس کے باس سے ملنے کی اپائنٹمنٹ لے رہا تھا؟"

"سارے شہر میں ایک ہاشم کی سیکرٹری تو نہیں ہوگی حلیمہ نام کی۔" حنین ماننے کو تیار نہ تھی۔ زمر تیز نظروں سے اسے گھورتی' سامنے آکھڑی ہوئی۔

"مگر سارے شہر میں جس حلیمہ کا باس تمہارے ایگزام میں چیٹنگ والی بات جانتا تھا' وہ ہاشم ہی تھا۔"

حنین ایک دم شل رہ گئی۔

"دیکھو حنہ' ہاشم ہمیں پہلے دن سے کہہ رہا ہے کہ وہ سعدی سے اس شادی کے بعد سے نہیں ملا۔" اس نے کرن' حماد کے جاننے والوں کی شادی کا ذکر کیا (وہ شادی جس پہ زمر نے سبز جواہرات سے مدد مانگی تھی) "مگر ہاشم ہم سے جھوٹ بول رہا تھا۔ نوشیرواں بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ دونوں ضرور کچھ جانتے ہیں۔"

"کبھی نہیں۔ وہ کبھی ایگزام والی بات بھائی کو نہیں بتائیں گے۔" وہ نفی میں سرہلا رہی تھی۔ "اور بھائی کو ہاشم سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ کی کیا ضرورت؟ بھائی کے کال ریکارڈز میں بھی آپ کے نکاح کے وقت کسی کو کال کرنے کا ریکارڈ نہیں ملا تھا۔"

"ہو سکتا ہے وہ کوئی اور سم استعمال کر رہا ہو۔ کچھ تو تھا اس ملاقات میں جو ہاشم نے اسے ہم سے چھپایا۔"

"ہاشم۔۔۔ ہاشم! بس کر دیں پھپھو!" وہ ایک دم چلائی تھی۔ "ہر وقت ہاشم برا ہے کی گردان۔ کیا بگاڑا ہے انہوں نے آپ کا؟"

زمر کے ابرو ناگواری سے بھنچے۔ "تمہاری عقل پہ جو پٹی چڑھی ہے اس کو اتار کر دیکھو گی تو نظر آئے گا۔"

"مجھے آپ کو وہ سب بتانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پتا تھا ایک دن آپ مجھے یونہی جج کریں گی۔" بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر آنکھیں رگڑیں۔ ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"وہ نیکلس۔۔۔ جو بھائی کی جیب میں کسی نے پارٹی والے دن ڈالا تھا۔ وہ نیکلس بھائی کی چیزوں میں نہیں تھا جب ہم ادھر آئے تھے۔ اگر واقعی بھائی' ہاشم سے ملنے گیا تھا تو ہو سکتا ہے وہ وہی واپس کرنے گیا ہو۔ کیا بتاتے ہاشم ہمیں؟ چوری شدہ نیکلس واپس کرنے آیا تھا سعدی؟ ان کو لگا ہوگا کہ ہم غلط سمجھیں گے' سو بھائی کی عزت رکھی۔" وہ زمر سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔

"تو پھر سعدی کی کون سی عزت رکھنے کے لیے ہاشم نے اس کو ایگزام والی بات بتائی؟"

ایک دم حنہ کی آنکھوں میں غصہ در آیا۔ "انہوں نے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتی۔ مگر آپ تو مجھے جج کریں گی نا اب۔ ٹھیک ہے' ساری عقل آپ میں ہے' میں اندھی سہی۔"

زمر پیر پٹخ کر مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ حنین گہرے گہرے سانس لیتی وہیں کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کی رنگت اڑ چکی تھی اور ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ مگر گردن نفی میں ہل رہی تھی۔ (میں کبھی یقین نہیں کروں گی۔ زمر اپنے بغض اپنے پاس رکھیں۔ کبھی ان کو فارس ماموں قاتل لگتے ہیں' کبھی ہاشم)۔

اس نے موبائل اٹھایا اور اسکرین روشن کی۔ ہاشم کا آخری پیغام "کین آئی کال یو؟" ڈیڑھ ماہ پہلے آیا تھا۔ پورا اگست دونوں کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ابھی پھر اس کا میسج آیا۔

"زمر جانتی ہیں کہ تم مجھ سے بات کرتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں تو پچھلے سات سالوں سے آپ سے بات کرتی آئی ہوں' اس میں چھپانے والی کیا بات ہے؟" وہ بظاہر حیران ہوئی' مگر ذہن مزید الجھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ بات کر گئی۔

زمر اوپر کمرے میں آکر بیٹھی تو شدید غصے میں

تھی۔ وہ صوفے پہ بیٹھا سیل فون پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا' نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

وہ چونک کر فارس کو دیکھنے لگی۔ "کیا؟"

"وہی' جو آپ کہنا چاہتی ہیں۔ بتائیں' کیا مسئلہ ہے؟"

اور اس ایک لمحے میں زمر کو لگا' اگر کوئی ایک شخص تھا جو واقعی تحمل سے اس کی ساری بات سنے گا تو وہ' وہی تھا۔ وہ اس کی طرف گھومی۔

"تم نے کوئی اتنا اندھا انسان دیکھا ہے' کبھی جس کے سامنے ایک ہزار ثبوت لا کر رکھو' تب بھی وہ نہ مانے؟"

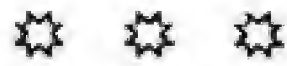
فارس نے نظر اٹھا کر سر سے پیر تک زمر کو دیکھا۔ "جی۔ دیکھا ہے۔" زمر غور کیے بنا کہہ رہی تھی۔

"لوگ اتنے اندھے کیوں ہو جاتے ہیں کہ نہ بات سنیں' نہ سمجھیں؟"

"کیونکہ ان کے ایموشنز انوالوڈ ہوتے ہیں۔"

زمر بالکل چپ ہو گئی' پھر سر جھٹک کر رخ پھیر لیا۔ وہ چند لمحے اس کو دیکھتا رہا۔ "آپ اور حنہ تہہ خانے میں کیوں گئی تھیں؟" زمر کے پاس جواب پہلے ہی سے تیار تھا۔

"حنین سے کہا تھا ایک کلائنٹ کے لیے کچھ کام کرنے کو' وہی دیکھ رہی تھی۔" اسے پتا تھا زمر جھوٹ نہیں بولتی' سو مطمئن ہو گیا۔ مگر وہ خود بے چین تھی اور اس سب میں دراز میں رکھی کی چین اس کے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھی۔



جب کنج قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریبان طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسم گل' اس درد جگر کا کیا ہو گا؟

نیچے تہہ خانے میں بیٹھی حنین موبائل پہ ٹائپ کر رہی تھی۔ "اوکے گڈ نائٹ۔"

فون رکھا تو خمار کا اثر ہوا ہونے لگا۔ سکون ختم ہو گیا۔ وہ تو زخم پہ صرف برف کی ڈلی رکھ رہی تھی۔ ادھر برف پگھلی' ادھر جلن پھر سے شروع۔

جب سوچوں سے تنگ آ گئی تو شیخ کی کتاب اٹھائی اور وہیں فرش پہ بیٹھ گئی۔

پچھلے دو ماہ سے اس نے یہ کتاب نہیں پڑھی تھی۔ جب بھی تکلیف ہوتی' وہ ہاشم میں "پناہ" ڈھونڈتی۔ اب صفحے کھولے تو روشنی کا سا چمکتا دروازہ سامنے نظر آیا۔ اسے دھکیلا تو قدیم دمشق کی ایک دوپہر کھلتی چلی گئی۔

مدرسۃ الجوزیہ کے سامنے کا منظر نامہ زرد سا تھا۔ ایسے میں مسجد کے سامنے درخت تلے بیٹھی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔ تکان بہت شدید تھی اور اپنا آپ کمزور محسوس ہو رہا تھا۔

وہ کتنی دیر وہیں تپتی دوپہر میں بیٹھی رہی۔ قریب میں پانی کا جوہڑ تھا۔ وہ کنکر اٹھا اٹھا کر اس میں پھینکتی رہی۔ پانی میں دائرے بنتے رہے۔ دفعتاً اس نے قدموں کی چاپ سنی۔

سر اٹھایا تو ہر طرف سے لوگ چلتے ہوئے اس کے قریب آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے گرد دائرہ سا بن گیا۔ ہجوم کا دائرہ۔ وہ سب اسے دیکھ رہے تھے' چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ وہ الجھی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ تب ہی لوگوں نے راستہ چھوڑا اور حنہ نے دیکھا' اس کے باریش شیخ استاد قدم قدم چلتے آ رہے ہیں۔ وہ اسی طرح بیٹھے ان کو ٹکر ٹکر دیکھے گئی۔ وہ اس کے قریب آ ٹھہرے۔ تاسف بھری مسکراہٹ سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اور اسی وقت ایک صدا لگانے والے نے صدا لگائی۔

"کیا ہے اس شخص کی دوا جس کو ایک لاعلاج مرض نے یوں جکڑ لیا ہو کہ اس کا دین اور دنیا دونوں برباد ہونے والے ہوں؟"

شیخ نے گہری سانس بھری۔ "اللہ نے اتاری ہے ہر مرض کی دوا۔ جو اسے جانتا ہے' وہ اسے جانتا ہے' جو اسے نہیں جانتا' وہ اسے نہیں جانتا۔"

اور تب حنہ نے دیکھا کہ شیخ کے ساتھ کوئی موجود ہے۔ اس پرانے زمانے کے پرنٹ میں ایک رنگین لڑکی۔ اس کی آنکھوں پر عینک لگی تھی' بالوں کی فرنچ

چوٹی تھی۔ چہرہ تازہ اور شاداب تھا، اور وہ حنین کی طرف اشارہ کرکے شیخ سے پوچھ رہی تھی۔

"اسے کیا مرض لاحق ہے؟"

درخت تلے بیٹھی حنہ نمک کا مجسمہ ہو گئی۔ ششدر۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے ساتھ والی لڑکی سے گویا ہوئے۔

"اسے مرضِ عشق ہے۔"

حنین ایک دم بدک کر کھڑی ہوئی۔ بے یقینی سے سر نفی میں ہلایا۔ "یہ سب غلط ہو رہا ہے۔ میں یہاں نہیں ہوں، میں وہاں ہوں" اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں۔۔۔! یہاں تو وہ بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ لاغر، کمزور، ہڈیوں کا پنجر۔ وہ بیمار شخص۔" مجھے، مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

دونوں بازو سینے پہ پھیلائے، وہ وحشت سے کہہ رہی تھی۔ پھر قدم بڑھائے تو جوہڑ کنارے زنجیر پا ہوئی۔ پانی میں اس کا عکس جھلملایا۔ وہ ڈل، کمزور اور بے رونق چہرے والی، کہیں کھوئی کھوئی سی لڑکی۔ وہ واقعی اس کا چہرہ تھا۔ اس نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کے قریب آکھڑے ہوئے۔

"علاج کے لیے ضروری ہے کہ مریض کو اپنے مرض کا ادراک بھی ہو۔ وہ خود صحت یاب ہونا چاہے، تب ہی ہو سکتا ہے۔ کیا تم ٹھیک ہونا چاہتی ہو؟"

حنین کا گویا دل ہی ٹوٹ گیا۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

"یہ میں نہیں ہوں۔۔۔ یہ میں نہیں ہو سکتی۔" ہاتھ مٹی پہ رکھے وہ رونے لگی تھی۔ "میں اس بیمار شخص جیسی نہیں بننا چاہتی۔ میں کیا کروں، شیخ؟" وہ پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھے۔

"میرے پاس تمہارے مرض کا علاج ہے۔ اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" وہ نرمی سے کہہ رہے تھے۔ "دوائے شافی کے سفر پہ۔۔۔ تم چلو گی،

لڑکی؟"

حنین نے کتاب بند کی تو آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ نفی میں سر ہلاتے اس نے آنکھیں رگڑیں۔

"مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پڑھنا اس کتاب کو۔" اس نے گھٹنوں میں سر دے دیا۔ برف کی ڈلی لگانا' زخم پہ مرہم لگانے سے زیادہ آسان تھا۔

☼ ☼ ☼

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

وہ صبح چمکیلی اور گرم طلوع ہوئی تھی۔ اوائل ستمبر کے دن تھے۔ حبس میں کمی تھی مگر گرمی ہنوز ویسی ہی تھی۔ انیکسی میں ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ فارس آفس کے لیے تیار' چائے پی رہا تھا۔ زمر ہاشم کو فون کر کے سالگرہ کی تقریب کے ملتوی ہونے کا بتا کر معذرت کر رہی تھی اور سیم اس پہ خوش نہ ہونے کے باوجود خاموش تھا۔

اسی دوران حنہ نے فارس سے کہا کہ اسے ریسٹورنٹ چھوڑ دے۔ہامی بھر کر وہ کہنے لگا۔

"جیسے زمر کی کلائنٹ کے لیے کیا' ویسے ہی میرا ایک کام کرو گی؟"

حنہ نے چونک کر زمر کو دیکھا۔ زمر نے بظاہر اطمینان سے فون رکھا اور ادھر آئی۔

"فارس پوچھ رہا تھا کہ رات ہم تہ خانے میں کیا بات کر رہے تھے تو مجھے بتانا پڑا کہ کس طرح تم نے میری کلائنٹ کے کانٹیکٹ کا اکاؤنٹ کھول کر دکھایا مجھے۔" آنکھوں سے اشارہ کیا۔ حنین نے نظریں جھکا دیں۔

"جی۔ کروں گی۔"

وہ چابی اور والٹ لینے اٹھ گیا۔ میز کے گرد وہ دونوں رہ گئیں۔ ابا اور سیم کافی فاصلے پہ ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے۔

حنین نے صرف ایک ناراض نظر اس پہ ڈالی۔

"کیا یہ دھمکی تھی؟ کہ اگر میں نے یہ کانٹیکٹ ختم نہیں کیا تو آپ ماموں کو بتا دیں گی؟"

زمر نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں اس سے نہیں' ہاشم سے بات کروں گی اب' اور جس دن میں نے ہاشم سے بات کی نا' وہ تمہاری طرف دیکھنے سے بھی جائے گا' اس لیے بہتر ہے کہ تم خود سے رابطہ ختم کر دو۔" اسے گھورا۔ بہت ہو گئی نرمی اور لاڈ۔

حنین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ (میں کیا کروں' اللہ تعالیٰ؟) پھر ٹی وی پہ نگاہ پڑی۔ ابا چینل بدلتے ہوئے ایک لوکل کیبل چینل پہ رکے' جس پہ تلاوت لگی تھی۔ ایک ہی نظر میں حنہ نے پہلی سطر پڑھی۔

"واوحی ربک الی النحل۔۔۔ (اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف)" مگر فارس واپس آ گیا تھا اور زمر سے آہستہ آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"جب میں رہا ہوا تھا تو سعدی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے جج کو بلیک میل کیا ہے۔ اس کے پاس جج کے خلاف مواد تھا۔ وہ مواد مجھے اس کی چیزوں میں نہیں ملا۔

اس کے لیپ ٹاپ میں بھی کچھ نہیں ہے۔ اس نے یقیناً جج کو واپس کر دیا ہو گا۔"

حنین بے دھیانی سے سننے لگی۔ ندرت اپنا مگ اٹھائے آ بیٹھیں تو ان کی بات پہ رخ موڑ لیا۔ یہ باتیں ان کو عجیب سی وحشت میں مبتلا کرتی تھیں۔ مگر وہ ان کو ان پیچیدگیوں میں پڑنے سے روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ فارس کہہ رہا تھا۔

"مگر سعدی نے ایک کاپی ضرور رکھی ہو گی اور کوئی اس بارے میں ضرور جانتا ہو گا۔"

زمر کھڑی ہوئی۔ "اس "کوئی" کو ریسٹورنٹ بلاؤ' اور اس سے کہو کہ انسانوں کی طرح سب اگل دے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

قصر کاردار کے ڈائننگ ہال کی اونچی کھڑکیوں سے سبزہ زار پہ حنہ اور فارس کار میں بیٹھتے نظر آ رہے تھے۔

اگر ہال میں دیکھو تو سربراہی کرسی پہ بیٹھی جواہرات تمکنت سے گردن اٹھائے خاور کو دیکھ رہی تھی۔ ہاشم بھی ناشتہ کرتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ مودب سا کھڑا کہہ رہا تھا۔

"بظاہر یہ سب گیس لیکیج کی وجہ سے ہوا۔ مگر ڈاکٹر بخاری اور ڈاکٹر ایمن نے کھلم کھلا نیاز بیگ کے بھائی کو الزام دینا شروع کر دیا۔ اس کے خلاف ایک کیس اور بڑھ گیا۔"

"ہاں تو مسئلہ کیا ہے؟ ان کے آپس کے مسئلے ہیں یہ۔" جواہرات نے ناک سے مکھی اڑائی۔ خاور ہلکا سا مسکرایا۔

"مسئلہ یہ ہے مسز کاردار کہ سب کچھ بہت پرفیکٹ تھا۔ گارڈز کو مارا نہیں گیا' جلنے نہیں دیا بلکہ آگ سے دور کر دیا گیا۔ اسٹریٹ لائٹس آف ہو گئیں۔ آگے پیچھے کے سی سی ٹی وی خراب کر دیے گئے۔ علیم بیگ ایک غنڈہ ہے اور غنڈے ایسے پرفیکشن سے کام نہیں کرتے۔"

"فارس!" ہاشم نخوت سے لب بھینچتے ہوئے پیچھے ہو کر بیٹھا۔ "یہ فارس نے کیا ہے' ہے نا؟"

خاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے بھی یہی لگا' یہ اسی کا اسٹائل ہے مگر اس رات وہ گھر پہ ہی تھا۔ گارڈز نے اسے آتے دیکھا... اور پھر صبح جاتے دیکھا۔ وہ رات گھر سے نہیں نکلا۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ہو سکتا ہے اس نے کسی اور کے ذریعے یہ کام کروایا ہو۔"

"بہرحال میں پتا کر رہا ہوں۔" وہ چلا گیا تو شیرواں آتا دکھائی دیا۔ نیند سے بھری آنکھیں' اور سست انداز' کرسی پہ ڈھے سا گیا۔ ذرا حواس بیدار ہوئے تو گفتگو کی طرف توجہ دی۔ جواہرات' فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

"اس ڈاکٹر نے فارس کے خلاف گواہی دی تھی۔ اس کے شوہر نے سعدی کو غائب کروایا۔ یقیناً" فارس نے ان سے بدلہ لیا ہے۔"

"ضروری نہیں ہے یہ اس نے کیا ہی ہو۔ وہ ابھی جیل سے آیا ہے۔ مزید ٹربل افورڈ نہیں کر سکتا۔" ہاشم پُریقین نہیں تھا۔ پھر شیرو کو دیکھا جو اپنے ناشتے پر ڈھکا شیشے کا کور اٹھا رہا تھا۔ ہاشم مسکرایا۔

"یعنی تو شیرواں کاردار آج آفس وقت پہ آئیں گے؟"

شیرو نے جمائی روکتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

"لیکن سعدی پھر ہمارے لیے لازمی کام کرے گا۔" شرطیہ دولائی۔

"بالکل! میں تین چار دن تک جاؤں گا اس سے ملنے۔ جو تفصیلات چاہییں' وہ لے کر ہی آؤں گا۔" سیل فون اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"تم سعدی سے چھٹکارا حاصل کرو ہاشم۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا دے گا۔"

"کچھ نہیں کر سکتا وہ۔" بے نیازی سے سر جھٹکتے وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔



اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت رہزن بھی کئی

"چلیں۔" حنہ کار میں آ کر بیٹھی تو فارس کال پہ کسی سے بات کر رہا تھا' سر ہلا کر فون رکھا۔

"ہم ایک جگہ سے ہو کر ریسٹورنٹ جائیں گے۔ گیس کرو کس نے کال کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے؟" اس کے الفاظ پہ حنہ چونکی۔

جس وقت وہ دونوں ریسٹورنٹ کی طرف جاتی سڑک پہ گامزن تھے' قصر کاردار کی چار دیواری کے ساتھ 'خاور محتاط نظروں سے دیوار کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیوار کا وہ حصہ تھا جو فارس کی انیکسی کے عقب میں تھا۔ اس کے پیچھے سڑک تھی۔ آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا' وہ اس جگہ رکا۔ یہاں ایک لوہے کا دروازہ تھا جو زمانوں سے بند پڑا تھا۔ اس پہ پرانا تالا لگا تھا۔ اس جگہ

گارڈز نہیں تھے 'نہ کیمرے۔ خاور کچھ دیر متذبذب سا اسے دیکھتا رہا پھر جھک کر تالے کو چھوا۔ لبوں پہ مسکراہٹ ابھری۔

تالا پرانا تھا' اور زنگ آلود بھی۔ مگر۔۔۔ اس کے مقفل ہونے کی جگہ پہ زنگ نہیں تھا۔ جیسے تیل وغیرہ ڈال کر صاف کیا گیا ہو۔ چابی داخل کرنے والی جگہ کا زنگ بھی صاف تھا۔

(سو فارس غازی رات کو ادھر سے نکلا تھا۔ گڈ گڈ!)

اس کے ہاتھ خزانہ لگ گیا تھا۔

فارس اور حنین ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو ایک دم حنہ رکی۔ تعجب سے فارس کو دیکھا اور شکل یوں بنائی جیسے حلق تک کڑوا ہو گیا ہو۔

سامنے ایک کونے والی کرسی پہ تازہ دم اور خوب صورت 'شیریں کاردار بیٹھی تھی۔ لبوں پہ سرخ لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی چھوٹی سی پونی۔ فارس کو دیکھ کر مسکرا کر کھڑی ہوئی۔ حنہ پر نظر پڑی تو مسکراہٹ میں کمی آئی۔

"تو آپ پھپھو سے چھپ کر اس سے ملتے ہیں؟" اس کی ددھیالی محبت پھر سے جاگی۔

"بکو مت۔ اس نے پہلی دفعہ ملنے کو کہا ہے۔ کوئی کام تھا۔" اسے گھرک کر وہ آگے آیا۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ حنین بھی (منہ بناتی) ساتھ بیٹھی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا تمہاری بھانجی بھی تمہارے آفس جاتی ہے۔" شیری کو حنہ کا آنا ناگوار گزرا تھا۔ حنین نے صرف ایک کاٹ دار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہم ضروری کام سے جا رہے تھے 'تمہارے فون پہ۔" فارس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "پندرہ منٹ نکالے ہیں۔ اب بتاؤ کیا بات تھی؟"

ایک لمحے کے لیے شیری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے 'پھر ہلکے سے شانے اچکائے۔

"میں سعدی کے کیس کا پوچھنا چاہتی تھی۔ میں نے سنا تھا کوئی مہنگی گن استعمال ہوئی ہے۔ سعدی کی شوٹنگ میں۔ اگر تم کہو تو۔۔۔" ہاتھ میز پہ باہم ملا کر رکھتی آگے ہوئی۔۔۔ "تو میں پاپا سے کہہ کر اس گن کے لائسنسز نکلوا سکتی ہوں' تاکہ۔۔۔"

"میں یہ کام ڈھائی ماہ پہلے کر چکا ہوں۔ جن لوگوں کے پاس وہ گن ہے' ان میں سے کوئی ایک بھی ہمارا دوست ہے نہ دشمن۔"

"تو پھر۔۔۔ وہ گن کس کی ہو گی؟"

"ظاہر ہے اس کا نام اور ریکارڈ لسٹ سے مٹا دیا ہو گا۔" وہ سنجیدگی سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"کون سی گن تھی وہ؟"

"آپ کو گنز کے بارے میں کتنا پتا ہے شیریں؟" حنین رہ نہیں سکی۔ شیری نے تنک کر اسے دیکھا۔ پھر پرس سے ایک Cobilt (پستول) نکال کر میز پہ رکھی۔

"اگر آپ ہاشم کاردار کی بیوی ہوں اور شوٹنگ کلب کی ممبر بھی ہوں' تو آپ کو گنز کے بارے میں بہت علم ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تمہارے 'ہاشم اور شیرو کے پاس کون کون سی گن ہے۔" ذرا اکتا کر اسے ٹوکا۔ "مگر جو برانڈڈ گن استعمال ہوئی ہے' وہ ماڈل آگے پیچھے کسی کے پاس نہیں ہے۔ گلاک جی فورٹی ون۔"

اور شیریں کا سانس اٹک سا گیا۔ بمشکل آنکھوں کو اس پہ رکھے مسکرا پائی۔

"جی فورٹی ون؟ اچھا۔" وہ رکی۔ تاثرات پہ قابو پا لیا۔ وہ گنز کی بات کرنے ہی نہیں آئی تھی۔ وہ تو حنہ کو دیکھ کر بات بنانی پڑی۔ اگر اس نے پہلے چیک کر لیا ہو تاکہ۔۔۔ او نہوں۔

"اگر کچھ اور نہیں ہے تو ہم جائیں؟" وہ فون جیب میں ڈالتا کھڑا ہوا۔ شیری نے جبراً مسکرا کر سر خم کیا۔

حنہ بھی بے دلی سے اٹھی۔ تب ہی نگاہ سامنے دیوار پہ جا ٹھہری جہاں بڑی سی فریم آویزاں تھی اور اس پہ خطاطی سے لکھا تھا۔

"(اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف۔)"

حنین کی آنکھیں سکڑیں۔ صبح والی ٹی وی اسکرین یاد آئی۔ مگر سر جھٹکا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا۔ فارس کے ساتھ وہ باہر نکلی تو ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔

"خوامخواہ ٹائم ضائع کروا دیا اس پلاسٹک نے۔" وہ سخت کوفت کا شکار لگ رہی تھی۔

فارس نے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"پلاسٹک کیا؟"

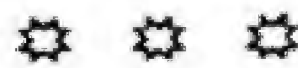
"یہ شہرین۔۔۔ اس کا تعلق Plastics سے ہے۔ آپ کو نہیں پتا Plastics کا؟" تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر ٹیک لگائے بتانے لگی۔ "یہ اپر مڈل کلاس اور ایلیٹ میں پائی جاتی ہیں۔ بچپن سے ان کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ بھاری کتاب سر پر رکھ کر سیدھا چلنے کی، ہونٹوں کو مخصوص زاویے پہ رکھنے کی۔ جب بھی کھڑی ہوں گی کہنیاں برابر اور ہاتھ تین انچ کے فاصلے پر ہوں گے۔ چہرے کو بالکل سپاٹ اور گردن کو اٹھا ہوا رکھتی ہیں۔ وائٹ اور پنچ کا ہر شیڈ ان کے پاس ہوتا ہے۔ بے حد دبلی پتلی اور ڈائٹ کانشس ہوتی ہیں۔ دراصل اینوریکسک ہوتی ہیں۔ فاقے کرتی ہیں۔ کسی دن کچھ زیادہ کھالیں تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتی ہیں۔ اس شدید جسمانی مشقت کے بعد ان کے چہرے پہ گویا خول سا چڑھ جاتا ہے۔ اور یہ پلاسٹک پلاسٹک لگنے لگتی ہیں۔" وہ خبرنامہ پڑھنے کے انداز میں بتا رہی تھی۔

ڈرائیو کرتا فارس بے اختیار ہنس دیا۔

"اچھا۔۔۔ ویسے تمہاری پھپھو کیا ہیں؟"

"وہ پلاسٹک تھوڑی ہیں۔۔۔ وہ نیچرل ہیں۔" ذرا قریب ہو کر آہستہ سے بولی۔ "مگر نیچرل سیپ!"

"وہ بھی کھوکھلا ہوا۔" وہ بڑبڑایا اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ریسٹورنٹ قریب تھا۔



مجھے شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

احمر شفیع جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو دیکھا، سامنے ایک میز کے پیچھے وہ تینوں بیٹھے تھے۔ کسی انٹرویو پینل کے انداز میں۔ بار بار گھڑی دیکھتا، کان کی لو مسلتا فارس، گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتی، مختصر سی زمر، اور انگلیاں مروڑتی گردن جھکائے بیٹھی حنین۔ احمر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

(چلو جی۔ سارا ابا کل خاندان اکٹھا جمع ہے احمر شفیع کی کلاس لینے۔ ان کو بے عزتی کرنے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا؟) منہ بناتا آگے آیا، سلام کیا۔ جس کا کوئی جواب نہ ملا۔ پھر بھی مسکرا کر سامنے بیٹھا۔

"مجھے ہارون عبید کے ساتھ ایک گھنٹے میں چترال جانا ہے اس لیے۔۔۔"

"سعدی نے جج کو کس چیز سے بلیک میل کیا تھا۔" فارس نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ احمر نے گہری سانس بھری۔ (ہو گئی کلاس شروع!)

"مسز زمر کانوں پہ ہاتھ رکھ لیں تو میں بتانا شروع کروں؟" معصومیت سے پوچھا۔

زمر نے گھور کر اسے دیکھا۔ "میں سن رہی ہوں۔"

احمر نے تھوڑی کھجائی۔ "سعدی نے مجھے ایک بورڈ کے آفیسر کانفیڈنشل پریس (او سی پی) کے بارے میں بتایا تھا جو کہ ایک کرپٹ آدمی تھا اور ہر سال پیپر لیک کیا کرتا تھا۔"

حنین یوسف کا سانس رک گیا۔

ذرا دیر کے لیے احمر اور ان تینوں کو یہیں چھوڑ کر ہم پچھلے سال کے جنوری میں واپس جاتے ہیں جب سعدی او سی پی صاحب کے گھر گیا تھا۔

وہ ایک پشیمانی سے بھرا دل اور جھکے کندھے لے کر وہاں آیا تھا۔ حنین کے اعتراف نے اس کے دل پر ایک بوجھ رکھ دیا تھا۔ آنٹی کے پاس ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھے اس نے بھاری ضمیر سے کہا تھا۔

"میں ان کی وفات کے اتنے عرصے بعد آرہا ہوں۔ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے ان کا۔" (یہ حنین کے اعترافِ جرم کے ایک ماہ بعد کا ذکر ہے۔)

"کوئی بات نہیں، جو تمہاری بہن نے کیا، وہی

ہمارے لیے بہت ہے۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا مگر آنٹی بہت محبت اور سادگی سے کہہ رہی تھیں۔ وہ صرف وہی جانتی تھیں جو حنہ نے کیا۔ وہ نہیں جو ان کے شوہر نے کیا۔ اور جس کی پشیمانی ان کو لے کر ڈوبی۔ وہ چائے کے لیے اٹھیں تو سعدی نے سر ہاتھوں میں گرائے' بے اختیار دعا مانگی۔

"اللہ تعالیٰ' میں آپ کے سامنے اپنی بہن کی غلطی کو جسٹی فائی نہیں کروں گا۔ میں کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ لیکن اس کی نیت ان کی جان لینے کی نہیں تھی۔ اللہ' آپ کو پتا ہے کہ اس کو علم نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ پلیز میری مدد کریں' میں کس طرح ان کی فیملی سے معافی مانگ سکوں' ایک ایمان دار افسر کے ضمیر کی قیمت لگانے کے بوجھ سے دل کو آزاد کر سکوں۔ جو آپ پہ بھروسا کرتے ہیں آپ ان کو رسوا نہیں کرتے۔ پلیز مجھے اس بوجھ سے نکال لیں۔"

چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ سیدھا ہوا۔ آنٹی چائے لا رہی تھیں۔

"انکل کی ڈیتھ ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی' کیا زیادہ پریشان رہتے تھے آخری دنوں میں؟" وہ نظریں ملائے بنا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں' ٹھیک تھے بالکل۔ بیٹی کی شادی ہو گئی تو مطمئن تھے۔ بلکہ خوش بھی تھے۔" سعدی نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دیوار پہ ان کی بیٹی کی شادی کی فوٹو شوٹ کی چند فریمز لگی تھیں۔ خوب صورت' جگر جگر کرتے لباس میں موجود گھر کی عورتیں۔ قیمتی زیور۔ سعدی کی نگاہیں ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر دوڑیں۔ قیمتی پردے' ڈیکوریشن۔ اس نے سر جھٹکا۔

"آخری دن کیسے تھے؟ اس دن رزلٹ آیا تھا نا۔"

"بالکل ٹھیک تھے سعدی۔ نارمل باتیں کر رہے تھے اور بلکہ جسٹس صاحب سے بھی ٹھیک گپ شپ کرتے رہے۔ وہ تو ان کے جانے کے کافی دیر بعد میں ان کے کمرے میں گئی تو......" سرنفی میں ہلا کر آنٹی نے آنکھ کا کنارہ صاف کیا لیکن سعدی یوسف خان کا دماغ ایک جگہ اٹک چکا تھا۔

"کون جسٹس صاحب؟"

"ان کے بڑے اچھے دوست ہیں' جسٹس سکندر۔ سیشن کورٹ میں ہوتے ہیں' وہ ملنے آئے تھے' ناحمیرا کے ابو سے۔ کمرے میں ان سے باتیں کرتے رہے' ہم لوگ باہر لاؤنج میں تھے۔ وہ نکلے تو بتایا کہ اوسی پی صاحب ابھی کام کر رہے ہیں' کہہ رہے ہیں بچے شور نہ کریں۔ میری بڑی بیٹی کے دو بچے بھی آئے ہوئے تھے نا۔ ان کے جانے کے کافی دیر بعد میں اور حمیرا اندر آئے تو دیکھا' وہ فوت ہو چکے تھے۔ استعفیٰ بھی لکھا پڑا تھا۔"

سعدی ایک دم آگے ہو کر بیٹھا۔ "آپ نے..... آپ نے ڈاکٹر کو بلایا تھا؟"

"ہاں' ڈاکٹر نے بتایا ہارٹ اٹیک سے موت ہوئی ہے۔"

"آپ نے پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟"

"نہیں بیٹا! اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرے بیٹے نے کہا بھی تو ان کے دوستوں' رشتے داروں نے منع کیا کہ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے ایسے۔"

"جی بالکل میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" جبراً مسکرایا۔ بے چینی سے پہلو بدلا۔ (یعنی بیٹے کو معلوم ہو گیا تھا؟)

"ان کا کمرہ دیکھ سکتا ہوں میں؟ ان کا کمپیوٹر وغیرہ؟"

"بیٹا کمپیوٹر اور فائلز تو محکمے والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ کمرہ دیکھ لو تم۔ اپنے گھر کے بچے ہو۔ صفائی وغیرہ کرتی ہوں' مگر ان کی باقی چیزیں نہیں چھیڑتی۔"

وہ اسے ایک کمرے میں لے آئیں۔ وہ بیڈ روم چھوٹا مگر پرتعیش تھا۔ مگر کافی دفعہ ریڈیکوریٹ ہوا لگتا تھا۔ سعدی کے جھکے کندھے اٹھ چکے تھے اور بھاری دل ہلکا ہو رہا تھا۔ وہ ان کی کتابیں دیکھتا رہا۔ آگے پیچھے کوئی کاغذ' کوئی فائل نہیں چھوڑی تھی "محکمے والوں" نے۔ دفعتاً" وہ رکا۔ اسٹڈی ٹیبل کے وسط میں کپ رکھا تھا۔ اس میں چند پین تھے۔ ایک پین مختلف تھا۔ سعدی نے وہ سلور پین اٹھایا اور ڈھکن کھولا۔ اندر یو

ایس بی پلگ تھا۔ اس نے جلدی سے ڈھکن بند کیا۔ پھر آنٹی کی طرف مڑا۔

"مجھے انکل سے بہت عقیدت تھی' اگر آپ کو برا نہ لگے تو ان کا ایک قلم رکھ لوں؟ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو تا رہے گا۔"

اور آنٹی نے کھلے دل سے اجازت دے دی۔ وہ ان سے چارجر نہیں مانگ سکتا تھا' لیکن کوئی بات نہیں' چارجر کہیں سے خرید لے گا۔

انسانی عقل مہینوں' سالوں لگی رہتی ہے' کسی ایک سرے کی تلاش میں' جیسے سعدی لگا تھا' اتنے دن سے جج کے کمپیوٹر میں کوئی ایک کام کی چیز تلاش کر رہا تھا مگر جب عقل تھک جاتی ہے تو ایک دم سے سب سے قیمتی چیز انسان کی جھولی میں پکے پھل کی طرح گرا دی جاتی ہے۔ آگ لینے کے لیے جانے والوں کو پیغمبری مل جاتی ہے۔ وہ لمحہ' الہام کا لمحہ ہوتا ہے۔۔۔ کچھ لوگ اسے "اتفاق" کہتے ہیں۔ ایمان والے اسے "غیبی مدد" کہتے ہیں۔۔۔ اور یہ انسان کی اچھی نیت کا پھل ہوتا ہے۔

اور آج احمر شفیع زمر اور فارس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "سعدی ان کی تعزیت کے لیے ان کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک پشیمانی کا احساس لیے ادھر گیا تھا' ان کی فیملی کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔" احمر سانس لینے کو رکا۔ ان کو متوجہ پا کر مسکرایا۔ "ویسے میری کنسلٹنسی فیس۔۔۔"

"کام کی بات پہ آؤ!" فارس ایک دم برہمی سے کہتا آگے ہوا تو وہ ہاتھ اٹھاتے جلدی سے ذرا پیچھے ہوا۔ "بتا رہا ہوں' بتا رہا ہوں۔" گہری سانس لی۔ "ان کی چیزوں میں سعدی کو ایک پین کیمو ملا۔" (زمر نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اف!) "اس پین کے ذریعے اوسی پی صاحب جج کی ویڈیوز بناتے تھے۔ وہ کانفیڈینشل پریس کے آدمی تھے۔ ان کے پاس بہترین Gadgets تھے۔ وہ پین چھوٹا سا تھا' اس میں جیمر لگا تھا' جو اس کو ڈیٹیکٹرز کے باوجود ناقابل گرفت بناتا تھا۔ بہر حال اس پین میں کچھ ویڈیوز تھیں۔ کالے دھندوں کے اعتراف کی ویڈیوز۔ سعدی نے تمہارے رہا ہونے کے بعد وہ تمام ویڈیوز مٹا دیں سوائے ایک کے۔ اس ویڈیو میں جج اور اوسی پی کی آخری ملاقات تھی اور وہ ایک terrible (خطرناک) ویڈیو تھی۔ اوسی پی نے صرف یہ سوچ کر کیمو آن رکھا تھا کہ جج کی دھمکیوں کو ریکارڈ کرے گا' اس لیے اس نے استعفیٰ بھی آرام سے لکھ دیا۔ مگر۔۔۔" اس نے جھرجھری لی۔ "اس ویڈیو کی وجہ سے جج نے غازی کو رہا کیا۔"

"اب وہ پین کہاں ہے؟" فارس کے سوال پہ احمر نے شانے اچکائے۔

زمر جلدی سے بولی۔ "میں سعدی کی چیزیں دوبارہ دیکھوں گی' مل جائے گا!" ذرا رکی۔ "لیکن اگر جج کے طاقتور مجرم دوست ہیں' تو اس نے فارس کو رہا کرنے کی بجائے ان دوستوں سے مدد کیوں نہیں مانگی۔"

"مسز زمر' آپ وہ ویڈیو دیکھیں گی تو جان لیں گی کہ کوئی بھی اپنے ساتھی مجرموں کو ایسی چیز کی ہوا نہیں لگنے دے سکتا۔ وہ اس کی مدد کرتے' لیکن پھر اس کی کمزوری کے ذریعے اس کو غلام بنا لیتے۔ غازی کو رہا کرنا زیادہ آسان تھا۔"

"تو اوسی پی صاحب نے خودکشی کیوں کی تھی؟" حنین ان ہی گیلی شاکی نظروں سے احمر کو دیکھ کر بولی تو احمر نے اسے دیکھا' پھر فارس کو۔ پھر شانے اچکائے۔

"اس ویڈیو اور سعدی کے مطابق' اوسی پی صاحب کو قتل کیا گیا تھا۔ ان دونوں کا آپس میں لین دین کا کوئی تنازعہ تھا۔"

"سعدی نے آپ کو خود یہ بتایا؟" حنین کی آواز غصے سے بلند ہوئی۔ احمر نے سنبھل کر "جی۔" میں سر ہلایا۔

حنین نے گلے بھری نظر زمر پہ ڈالی۔ احمر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہیں؟ ان کو کیوں بتایا؟ میں بہن تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟" ایک دم سے صورت حال گمبھیر ہو گئی تھی۔ فارس احمر کو اشارہ کرتا اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلے گئے تو حنین نے آنسو ہاتھ کی پشت سے رگڑے۔

"بھائی کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں سمجھتی رہی میں نے ان کی جان لی ہے۔ میں نے ان کی جان نہیں لی تھی۔"

"حنین! یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ ہمیں سعدی نے کچھ نہیں بتایا۔ رہی او سی پی کی بات تو میں نے تمہیں کہا تھا نا' ان کے لیے پیپرز دینا آسان تھا کیونکہ وہ یہ کام پہلی دفعہ نہیں کر رہے تھے۔"

"مگر جب میں نے ان سے کہا تو ان کے تاثرات.... وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔"

"کیونکہ حنہ! جس چیز کو وہ اتنے سال پیسوں کے بدلے بیچتے آئے تھے' پہلی دفعہ وہ انہیں اپنے خاندان کی عزت کے بدلے بیچنی پڑی۔ یہ جھٹکا کسی کو بھی ہلا سکتا ہے۔"

حنین نے اثبات میں سر ہلایا' اور آنسو گرے۔

"میں نے ان کی جان نہیں لی۔ لیکن میں پھر بھی قصوروار ہوں۔ بلیک میل اور چیٹنگ کی۔"

"حنین! دنیا میں تمہارے آس پاس کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس سے کبھی کوئی گناہ نہ ہوا ہو۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ گناہ کے بعد تم کیا کرتی ہو۔"

"میں نے توبہ کی تھی' سچے دل سے۔"

"توبہ یہ نہیں ہوتی کہ اس گناہ کا ڈپریشن لے کر ہر شے تیاگ کر بیٹھ جاؤ۔ توبہ مایوسی اور خود اذیتی کا نام نہیں ہے۔"

"تو پھر کیسے کی جاتی ہے توبہ؟" وہ ہلکا سا بولی۔

"توبہ النصوح کا مطلب ہے۔ انسان کو احساس گناہ ہو' پھر ندامت گناہ ہو' پھر معافی مانگے اور اگر کوئی کفارہ ہے تو وہ ادا کرے۔ پھر دوبارہ وہ کام نہ کرنے کا عہد کرے' اور پھر اچھے کام کرے۔ توبہ مثبت سوچ کا نام ہے۔ فریش اسٹارٹ لینے کا۔ نئی زندگی کے آغاز کا۔"

"اور پھر سب معاف ہو جاتا ہے؟"

"ہاں سب معاف ہو جاتا ہے۔ مگر ہر گناہ سے بڑا گناہ' پتا ہے کیا ہے؟ اپنے گناہوں کو جسٹی فائی (صحیح ثابت کرنے کی کوشش) کرنا۔" حنین نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے بے اختیار اپنی کتاب اور شیخ یاد آرہے تھے۔

"ہاشم سے یوں بات کرنا' ایگزام سے بڑی چیٹنگ ہے۔ یہ سعدی اور فارس کے ساتھ چیٹنگ ہے۔"

اس کا فون بجنے لگا تو گفتگو ختم ہو گئی۔ حنین اٹھ کھڑی ہوئی۔ زمر نے موبائل اٹھاتے ہوئے اسے پکارا۔

"مجھے وہ چپ مل گیا ہے حنین۔" حنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "مگر اس کی بیٹری ختم ہے۔ اس کا چارجر ڈھونڈ دو مجھے' اور ہم اس کو کھول لیں گے۔ ابھی فارس یا احمر کو نہیں بتانا۔ مجھے کسی پہ اعتبار نہیں ہے۔"

اس کو وہیں چھوڑ کر زمر گل خان کی تلاش میں نکل آئی۔



جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں!
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

چند منٹ بعد وہ اس زیر تعمیر مکان میں کھڑی تھی۔ وہ اب تعمیر کے آخری مرحلے میں تھا۔ دروازے لگ چکے تھے۔ پلستر ہو چکا تھا۔ ایسے میں اس کی چھت پہ بنے ایک کمرے (جو تین ماہ پہلے کھلا میدان تھا' اور جہاں سارہ چھپی تھی۔) میں گل خان ساتھ کھڑا۔ مایوسی سے ادھر ادھر زمین پہ ہاتھ مار رہا تھا۔ پھر ہاتھ جھاڑ کے اٹھا۔

"وہ موتی ادھر ہی چھپے تھے باجی۔ بعد میں فرش برابر ہوا تو گم ہو گئے۔"

"کس کے موتی؟ اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ سعدی کی چین تمہیں کہاں سے ملی؟" وہ دونوں اب گھر کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

"باجی' ہمارا تایا ادھر مزدوری کرتا ہے' اسے سعدی بھائی نے یہاں نوکری دلوایا تھا۔ بھائی کو گولی لگنے کے تیسرے یا چوتھے دن اس گھر کا ٹھیکیدار ہمارے گھر آیا' تایا کو بولا کہ کسی عورت کا پرس ادھر گرا ہے' اس گھر میں کس نے اٹھایا ہے؟ تایا نے بولا ہم ڈھونڈ دے

گا۔ وہ ٹھیکیدار چلا گیا۔ مگر باجی یہ جو گل خان ہے نا اس کا کھوپڑی بہت چلتا ہے۔" وہ اب مرچ مسالہ لگا کر پورے ایکشن کے ساتھ کہانی بیان کر رہا تھا۔ "ام کو تائے پہ شک ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ام نے تائے کا جاسوسی کیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ الماری سے ایک گلابی رنگ کا بٹوہ نکال کر دیکھ رہا ہے۔ اس کو یہ ادھر چھت پہ پڑا ملا تھا۔ اس کا دو موتی ٹوٹا ہوا تھا اور سیمنٹ میں چپکا تھا۔ تائے نے پرس اٹھا کر اس جگہ بجری ڈال دی۔ یہ سارا بات اس نے اگلے دن ٹھیکیدار کو بتایا۔ ٹھیکیدار بہت دیندار آدمی ہے، پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے اور صرف دو ٹائم ہیروئن بیچتا ہے، مگر اس نے کہا کہ بٹوہ عورت کو واپس کرنا ہے۔ تو تائے نے اس میں سے تھوڑے سے پیسے نکال کر الگ کیے اور بٹوہ الگ رکھا۔ بس ادھر تایا سویا، ادھر گل خان نے الماری پہ چھاپا مارا۔" وہ تحمل سے سنتی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔

"مگر اندر کیا دیکھتا ہے کہ ایک ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ یہ جگر جگر چمکتی۔ اور بھی پیسے ہیں۔ ایک دو انگریزی کے کارڈ بھی تھے اور باجی۔۔۔ اس میں سعدی بھائی کا چابی بھی تھا۔" زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"پھر؟"

"پھر ہم نے چابی اٹھا لیا۔ دیکھو باجی ہم بھائی کا بہت وفادار ہے۔ ہم نے اسے حفاظت سے رکھا۔ پھر ہم پشور چلا گیا۔ واپس آیا تو۔۔۔"

"تو اتنے دن ہو گئے مجھے کیوں نہیں دیا؟"

گل خان کی اس بات پہ سٹی گم ہو گئی۔ "وہ۔۔۔ باجی تمہارا بندہ ہر وقت آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ ام کو اس سے ڈر لگتا ہے۔" سر کھجایا۔ مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ واپس مڑی۔

"مجھے اس ٹھیکے دار سے ملواؤ۔ فکر نہ کرو، میں کی چین کا نہیں بتاؤں گی۔" ٹھیکے دار کا منہ کھلوانے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے تھے، وہ فر فر بتانے لگا۔

"ایک عورت تھی۔ اس نے چادر کر رکھی تھی۔ چہرہ بھی ڈھک رکھا تھا۔ وہ میرے پاس آئی اور اپنے پرس کا پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک وکیل ہے اور یہاں اس قتل کیس کے سلسلے میں آتی جاتی رہتی ہے، اس لیے پرس کھو بیٹھی۔ میں نے ایک دو روز میں پرس ڈھونڈ کر دے دیا۔ وہ دوبارہ اسی گھر میں ملنے آئی تھی۔ اس نے پیسے بھی دیے مجھے، مگر وہ خوش نہیں تھی۔ بار بار چابیوں کے گچھے کا پوچھتی تھی۔"

"کوئی اور بات جو اس کے بارے میں یاد ہو؟"

وہ سوچنے لگا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میڈم جی۔ دبلی پتلی تھی، لڑکی سی لگتی تھی۔ ہاں رنگ گورا تھا اور آنکھیں ہلکے رنگ کی تھیں۔ نیلی سبز سرمئی۔"

"اگر وہ کبھی دوبارہ آئے تو آپ اس نمبر پر مجھے بتائیں گے۔" ایک کارڈ اسے پکڑاتے ہوئے اس نے تاکید کی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو سوچ میں گم تھی۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی اور سیدھی اوپر چڑھتی گئی۔ نیچے ریسٹورنٹ میں اکا دکا لوگ تھے۔ حنین کونے والی میز پہ آ بیٹھی اور ہتھیلی پہ چہرہ گرا لیا۔

(میں توبہ کر چکی ہوں، معافی مانگ چکی ہوں، مگر ہاشم کو کیسے چھوڑوں؟ نہیں انہوں نے بھائی کو کچھ نہیں بتایا، مگر مجھے پھر اتنا شک کیوں ہے؟)

سر جھٹک کر حنین نے سیل فون نکالا، اور پھر دوپٹہ سر پہ لیتے ہوئے آن لائن قرآن ڈاؤن لوڈ کیا۔ کتنے عرصے سے اس نے قرآن نہیں پڑھا تھا۔ اس کو وہ ایسے سمجھ میں نہیں آتا تھا، جیسے سعدی بھائی کو آتا تھا۔ حالانکہ سعدی اور سیم نارمل ذہانت کے لوگ تھے، جینئس تو وہی تھی، تو ساری مات جینئس لوگ کیوں کھاتے ہیں؟

قرآن کھلا تو وہ بے دلی سے انگوٹھے سے اسکرین اوپر کرتی گئی۔ صفحات اوپر نکلتے گئے۔ بالآخر ایک جگہ وہ رکی۔ آنکھیں بند کیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب جو بھی وہ آیت پڑھے گی اس پہ عمل کرے گی، چاہے وہ یہ کیوں نہ کہے کہ عورتوں کو چھپے دوست نہیں بنانے چاہییں یا پردہ کرنا چاہیے یا نگاہوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ آنکھیں کھولیں اور اسکرین کو دیکھا۔

"اور اللہ ہی ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تاکہ زمین کو اس کی موت کے بعد اس سے زندہ

کرے۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں۔"

(ہوں۔ بارش کا ذکر ہو رہا ہے یہاں۔ گڈ۔ آگے چلو) اس نے اگلی آیت پہ نظریں مرکوز کیں۔

"اور تمہارے لیے بے شک چوپائے مویشیوں میں ایک نشانی ہے۔ ہم تمہیں پلاتے ہیں ان کے پیٹوں میں سے 'خون اور گوشت کے درمیان سے خالص دودھ' جو خوشگوار ہے پینے والوں کے لیے۔"

(مطلب کہ۔۔۔ ؟ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ خون اور گندگی کو دودھ سے ملنے نہیں دیتا' یوں ہم خالص دودھ پی لیتے ہیں؟ ٹھیک ٹھیک!)

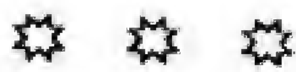
"اور کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی۔ تم ان سے بناتے ہو نشہ آور چیزیں اور پاک رزق بھی۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لیے جو عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔

(مطلب کہ۔۔۔ اونہوں۔ شراب کا میں نے کیا کرنا ہے؟ آگے چلو۔)

اور تمہارے رب نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف کہ بنالے اپنا گھر پہاڑوں میں اور درختوں کے اوپر' اور اونچی چھتوں پہ۔ پھر کھا تمام پھولوں میں سے اور چل اپنے رب کے آسان راستوں پہ۔ ان (شہد کی مکھیوں) کے پیٹوں میں نکلتا ہے ایک مشروب' مختلف سے ہیں جس کے رنگ' شفا ہے جس میں لوگوں کے لیے' بے شک اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

حنین نے ایک دم موبائل الٹا کر کے رکھ دیا۔ یہ تو وہی آیت تھی جو وہ آج تیسری بار۔۔۔؟ کوئی سنسنی خیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی گردن پہ ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ ایسا لگا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

(بس' مجھے نہیں پڑھنا قرآن' نہ شیخ کی کتاب۔ یہ سب چیزیں ڈراتی ہیں۔) جھرجھری لے کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ بہت دن بعد اس کا دل تھا کہ وہ کچھ کھائے' کچھ اچھا اتنا اچھا کہ سب بھول جائے۔



آگے لے جاؤ' تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

حنین نے اگلے تین چار روز خود کو کھانے' ٹی وی' کمپیوٹر گیمز اور ہاشم میں مصروف کر لیا' مگر بے سکونی بڑھ گئی تھی۔ نہ ان چیزوں میں دلچسپی رہی تھی' نہ ہاشم پہ اعتبار رہا تھا۔ زمر کے پاس بھی نہیں گئی' نہ دل لگا کر پین کیمرے کا چارجر ڈھونڈا۔ زمر نے بھی اس سے دوبارہ بات نہیں کی۔ چھ ستمبر والے روز حنین نے ہتھیار ڈال دیے' اور امی کا قرآن کا نسخہ اٹھائے' کاپی پین لیے' فوڈلی اوور آنٹر ریسٹورنٹ کے اوپری کمرے میں آبیٹھی جہاں آج زمر نہیں تھی۔

اب حنین نے وہ آیت نقل ایک بڑے کاغذ پہ لکھی اور سر پہ دوپٹہ لیے' ہاتھ میں قلم پکڑے۔۔۔ اس پہ غور کرنے لگی۔ آن لائن تفسیر بھی پڑھی۔ شہد کی افادیت شہد سے شفا۔ ایک دم وہ چونکی۔ شیخ کے بیمار سے اس کو اپنا خیال آیا تھا۔ تو کیا اس کے مرض عشق کی شفا بھی شہد میں تھی؟ کیا اس بات کی کوئی تک بنتی تھی؟

کچھ سوچ کر جنید کو پکارا جو کسی مہمان کو اٹینڈ کر رہا تھا۔

"سنو جنید بھائی۔" وہ آیا تو وہیں کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔ "یہاں آگے پیچھے کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے خالص' بالکل خالص شہد مل سکے؟"

جنید نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ "مجھے نہیں پتا۔" جانے لگا' پھر دوبارہ عجیب انداز میں اسے دیکھا۔ "ایک دفعہ سعدی بھائی نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"پتا نہیں۔" وہ خود عجیب سے اچنبھے کا شکار' واپس لوٹ آئی۔



ہر آئے دن یہ خداوند گان مہر و جمال

لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں

ان سب سے دور' سمندر پار۔۔۔ سعدی یوسف اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اب کے وہاں کونے میں ایک اسٹڈی ٹیبل نظر آتی تھی جس پہ صاف جرنل رکھا تھا اور وہ پین سے اس پہ بے خیالی میں تکونیں بنا رہا تھا۔ آج نئی میرون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔

دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی' اس نے سر اٹھایا۔ دو گارڈز اندر داخل ہوئے اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ اٹھا اور ان کے ہمراہ پہلی دفعہ اس کمرے سے باہر آیا۔

باہر کوئی لاؤنج' ڈرائنگ روم ٹائپ کچھ نہ تھا' جیسا کہ اس کا گمان تھا۔ بلکہ ایک قدرے کھلا کمرہ تھا جس میں ٹی وی لگا تھا۔ کونے میں چند کرسیاں رکھی تھیں۔ وسط میں چھوٹی میز اور اس کے گرد دو کرسیاں۔ ایک کرسی پہ وہ شخص زینگنا کے گرے سوٹ میں ملبوس' قیمتی پرفیوم کی مہک میں بسا' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر سعدی کا سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں آگیا' مگر نہ وہ کچھ بولا' نہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی' بس شرربار نگاہوں سے اسے دیکھتا' میز کی دوسری طرف بچھی کرسی پہ آبیٹھا۔

کمرے میں' سعدی کے پیچھے دو گارڈز تھے' تین گارڈز دروازوں پہ تھے۔ کچن کی چوکھٹ پہ مؤدب سی میری کھڑی تھی۔

"ہیلو اکین سعدی!"

وہ چپ رہا۔ صرف اسے چبھتی نظروں سے گھورتا رہا۔ ہاشم کاردار نے گہری سانس لی۔

"یو آر ویلکم!" طنز کیا۔

سعدی کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ آٹھہری۔

"تمہیں لگتا ہے کہ اپنی جان بچانے پہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا؟ لونسوں!" مسکراہٹ سمٹ کر صرف تپش رہ گئی تھی۔ "پچھلے تین ماہ سے میں اگر کسی کے جسم میں تین گولیاں اتارنا چاہتا ہوں' کندھے' پیٹ اور ٹانگ میں' تو وہ نوشیرواں ہے' نفرت ہو گئی ہے مجھے تمہارے بھائی سے۔ لیکن اس کے باوجود۔۔۔ سچ یہ ہے کہ نوشیرواں مجھے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہترین نشانہ باز ہے' ذرا سی کوکین کے باوجود اس کا نشانہ خطا نہیں ہونا چاہیے تھا' وہ مجھے سر میں گولی مار سکتا تھا' سینے میں بھی مار سکتا تھا مگر اس کو خود بھی علم نہیں کہ وہ مجھے گولیاں صرف اس لیے مار رہا تھا تاکہ مجھے نیچے گرا کر اپنے بوٹ سے مار سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی گولیوں سے میں مر سکتا تھا اور میں اس کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔" ذرا ٹھہرا۔ "لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے بچایا ہے' تو خود کو آئینے میں دیکھو۔" نفرت سے اسے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "کیونکہ تم اپنے بھائی سے کہیں زیادہ sick(بیمار) ہو۔ جو الفاظ تم نے میری بہن کے بارے میں کہے' سچ کہوں تو تم سے امید نہیں تھی اس گھٹیاپن کی' لیکن پھر سوچا جو قتل کر سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ایک دفعہ پھر کہوں گا' میری غیرت کو للکارنے سے پہلے آئینے میں دیکھنا' کیونکہ یہ الفاظ اس شخص کے منہ سے مضحکہ خیز لگتے ہیں' جو نہ اپنی بہن کی حفاظت کر سکا' یہاں تک کہ وہ جیل چلی گئی' نہ اپنی سابقہ بیوی۔۔۔ خیر" سر جھٹکا۔ "میں تمہارے لیول پہ آکر تمہارے والی زبان استعمال نہیں کر سکتا۔" حالانکہ اس نے یہ فقرے تیار کر رکھے تھے۔ ہر مرد کی طرح اس کو بھی غصہ تھا لیکن بولنے کا وقت آیا تو اسے پتا تھا وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔

ہاشم کاردار' انگلی اور انگوٹھے کے درمیان رخسار رکھے' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھا سنتا رہا۔

"تمہاری تقریریں مجھے پسند ہیں مگر ان کو مجھ پہ ضائع مت کیا کرو۔ اگر تم کہہ چکے تو اب سنو!" سعدی پہ جمی اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ "تم میرے آفس آئے' تم نے میرے خاندان کو دھمکایا' تم نے میرے بھائی کو گالی دی۔"

"مجھے ان دو الفاظ پہ افسوس تھا' مگر کیا وہ اتنے بڑے تھے کہ تمہارا آدھے موحتا بھائی مجھے گولیاں مار دے؟

عزت' غیرت صرف تم لوگوں کی ہے؟ ہمارے سامنے ہماری عورتوں کی بات کرو اور ہم چپ چاپ سن لیں؟"

"میری بات دوبارہ مت کاٹنا!" ہاشم نے انگلی اٹھا کر اس کو تنبیہہ کی۔ "تم نے میرے بھائی کو گالی دی' اس نے اپنا انتقام لیا۔ اس کے بعد بھی میں نے تم پہ رحم کھایا' اور تمہیں بچالیا۔ میں تمہیں یہاں لے آیا۔ تمہارے اوپر اتنا خرچا کیا' اس کے بعد تم مجھے کال کر کے ایک لسٹ تھماتے ہو کہ تمہیں یہ' یہ چیز چاہیے۔" استہزائیہ انداز سے مسکرا کر سر جھٹکا۔ "جیسے تم یہاں پکنک پہ ہو!"

"کیا تم اتنی دور مجھے انکار کرنے آئے ہو؟"

"اونہوں۔۔۔ میں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہیں تھوڑی بہت سہولتیں مل سکتی ہیں اور تمہاری فیملی کو تحفظ' مخصوصاً" تمہاری بہن کو' اگر تم۔۔۔"

"میری بہن کا دوبارہ نام مت لینا!" اس کی آنکھیں سرخ ہوئیں' بلند آواز سے غرایا۔ مگر وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر تم مجھے وہ دو' جو میں چاہتا ہوں۔" کہتے ساتھ ایک فولڈر اس کے سامنے رکھا۔ سعدی نے شرربار نظروں سے اسے گھورتے' فولڈر پہ آنکھیں جھکائیں۔ پہلے صفحے کے چند الفاظ پڑھے۔

ایک نظر میں اس کی سمجھ میں آگیا ہاشم اس سے تھر کول کے کوئلہ کی porosity Density اور موئسچر ز Content پوچھ رہا تھا اور اس کے تمام لیب ورک کا ڈیٹا مانگ رہا تھا جو ان کے پراجیکٹ کو Scale up کرنے کے لیے ضروری تھا۔

"میرا جواب ناں میں ہے' تم جا سکتے ہو۔" فولڈر بے زاری سے واپس ڈالا۔ ہاشم چند لمحے چبھتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم وہ گفتگو بھول گئے ہو غالباً" جو پچھلی دفعہ یہاں آکر میں نے کی تھی؟" گود میں رکھی سعدی کی مٹھیاں بھینچ گئیں' مگر اس نے خود کو ٹھنڈا رکھنا چاہا۔ (نہیں سعدی' وہ تمہیں توڑنا چاہتے ہیں۔ تم کو نہیں ٹوٹنا۔)

"وہ گفتگو جس میں تم نے میرے خوف سے مجھے مفلوج کر دیا تھا؟"

"میں وہ ایک۔۔۔ ایک لفظ دوبارہ دہرا سکتا ہوں' مگر تمہیں تکلیف ہوگی بچے! اور میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔"

"تمہارا محبت کا فلسفہ تمہارے ہی طرح کرپٹ ہے۔ تم اپنے محبوب لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ تم نے کبھی نوشیرواں کو بڑا نہیں ہونے دیا' وہ ایک ایک چیز کے لیے تمہارا محتاج ہے۔ تم نے شہرین کے ساتھ بھی یہی کیا۔ اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ تم مجھے پسند کرتے ہو میں جانتا ہوں کیونکہ مجھے تو سب پسند کرتے ہیں۔" کندھے اچکا کر بظاہر لاپروائی سے بولا۔ دل میں ابلتے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔ "تم نے مجھے اس لیے نہیں بچایا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو۔ تم اپنے بھائی کو گلٹ سے بچانا چاہتے تھے اور مجھے اس کی کمپنی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر۔۔۔ میں۔۔۔" رک رک کر بولا۔ "میں نوشیرواں۔۔۔ نہیں ہوں۔"

ہاشم کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا۔

"تمہارے پاس تین گھنٹے ہیں۔ سوچ لو۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ مجھے واپسی پہ یہ کاغذ بھرے ہوئے ملنے چاہئیں' ورنہ تمہاری ہٹ دھرمی کی قیمت تمہاری بہن ادا کرے گی۔"

سعدی نے سختی سے میز پہ ہاتھ جمائے۔ پھر خود کو یاد کرایا۔ اس نے ایک مہینہ اس دن کے لیے مشق کی تھی۔ وہ اتنی جلدی نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جاؤ اپنے کام بھگتاؤ۔"

"تین گھنٹے!" ہاشم نے کلائی کی گھڑی دکھاتے ہوئے تنبیہہ کی اور گارڈز کو اشارہ کرتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹ بعد وہ واپس کمرے میں موجود تھا مگر اب کی بار انہوں نے کمرے کا صرف شیشے کا دروازہ بند کیا' دوسرا لکڑی کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔ یہ اسی دن سعدی کو

معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کمرے کے دو دروازے تھے۔ لکڑی کا اندر کی طرف کھلتا۔ شیشے کا باہر کی طرف۔ لکڑی کے دروازے پہ دو لاکس لگے تھے' اور شیشے والے پہ نمبر زپیڈ۔ یعنی وہ کوڈ سے کھلتا تھا۔

اب وہ بیڈ پہ بیٹھا لاؤنج نما کمرے میں مستعد گارڈز دیکھ سکتا تھا۔ فولڈرز اور پین بیڈ پہ ساتھ رکھے۔ اور

میری قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔

"وہ جو کہہ رہا ہے کرے گا بھی ضرور۔"

"جب مشورہ مانگوں تب دینا۔ ابھی مجھ سے بات مت کرو۔" منہ پھیر لیا۔ میری سر جھٹک کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

ہارون عبید کے گھر کے آرام دہ اور کوزی لونگ روم میں ٹی وی چل رہا تھا اور وہ صوفے پہ بیٹھے چند کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ساتھ آبدار بیٹھی گاہے بگاہے ان کو دیکھتی تھی' جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ تبھی ایرانی بلی دوڑتی ہوئی آئی اور جست لگا کر آبدار کی گود میں بیٹھ گئی۔ ہارون نے (اونہوں) خفگی سے بلی کو دیکھا' پھر اسے۔

"آبی! اپنی بلیوں' گھوڑوں اور پرندوں کو گھر کے اندر مت لایا کرو۔" ٹوکا مگر نرمی سے اور کاغذ دیکھنے لگے۔ آبدار نے تو جیسے سنا ہی نہیں' آلتی پالتی کر کے اوپر ہو بیٹھی' اور بلی کی نرم کھال پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔

"بابا! آج آپ اتنے دن بعد دوپہر میں گھر پہ ہیں۔ ایسا کرتے ہیں میں چائنیز بنا لیتی ہوں' پھر ہم ساتھ لنچ کریں گے۔ ٹھیک؟"

"نہیں مجھے ایک لنچ پہ پہنچنا ہے ابھی۔ یاد آیا' مسز کاردار نے ویک اینڈ پہ ہمیں کھانے پہ بلایا ہے۔ تم چلو گی؟"

اور انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ چائنیز کا پلان کینسل ہونے پہ آبی کی آنکھوں کی جوت کیسے بجھ گئی ہے۔ ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔ "میرا دل نہیں ہے جانے کا۔ اس دن بھی تو گئی تھی نا ہاشم کی عیادت کے لیے۔ اب اگر وہ لوگ آئے تو پھر جاؤں گی۔ روز روز جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ کاغذات دیکھتے رہے۔

آبدار سر جھکائے بلی کو ست روی سے سہلاتی رہی۔

"مسز کاردار کو آپ کا تحفہ کیسا لگا؟ آپ نے بتایا نہیں۔" دل کو پھر سے جوڑ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"اتنا قیمتی بریسلیٹ کسے اچھا نہیں لگے گا؟"

"میں اس شعر کی بات کر رہی ہوں بابا جو آپ نے مجھ سے لکھوایا تھا' من خشت بہ ملکہ داد۔"

"میں نے تمہیں انگریزی میں لکھنے کے لیے کہا تھا' تم نے فارسی میں لکھ دیا۔"

"کوئین کی سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ خیر' کیسی ہیں وہ؟ آپ لوگ ابھی بھی اپنے کارٹیل میں ساتھ کام کر رہے ہیں نا۔"

تب ہی ہارون کا فون بجا۔ آبدار نے اچک کر اسکرین دیکھی۔ ہاشم کاردار کالنگ۔

"اوہ۔ پہلے میں بات کر لوں۔ میں نے اسے اس دن سے کال بیک ہی نہیں کی۔" اس نے موبائل لینا چاہا مگر ہارون نے سختی سے فون پیچھے کر لیا۔ "یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔" ایک دم سارے کاغذ چھوڑ کر وہ فون کان سے لگائے اٹھ گئے۔ آبدار متعجب سی بیٹھی رہی۔ پھر کاغذوں کو دیکھا۔ وہ محض بلز تھے۔ تو بابا اتنی دیر سے ہاشم کی کال کا انتظار کر رہے تھے؟

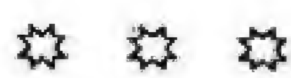
"دشش" بلی کو تھپک کر بھگایا اور پھر ننگے پاؤں سبج سبج کر چلتی ان کے پیچھے آئی۔ وہ گیلری سے گزر کر اسٹڈی روم میں چلے گئے تھے اور اب دروازہ بند تھا۔ وہ دبے قدموں دروازے تک آئی اور اسے ہلکا سا دھکیلا۔ بنا آواز کے وہ ذرا سا کھلا۔ ہارون دوسری طرف رخ کیے بات کر رہے تھے۔ آبدار آنکھوں میں معصوم سی

شرارت لیے سُنتی رہی۔ اس کی برتھ ڈے اگلے ماہ تھی۔ ہاشم اس کی سالگرہ پہ انوکھے تحفے بھیجا کرتا تھا۔ بابا بھول جاتے تھے تو کیا ہوا؟ ہو سکتا ہے اس سال وہ

"تمہارا تھرکول والا Scientist (سائنس داں) کہاں تک پہنچا ہاشم؟" وہ کہہ رہے تھے۔
"تمہیں یقین ہے وہ تمام معلومات فراہم کردے گا؟" ذرا ٹھہرے۔ "میں جلدی اس لیے مچا رہا ہوں کیونکہ

ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں چائنیز رجسٹرڈ کمپنی جلد از جلد شروع کرنی ہے۔" وہ ناخوشی سے کہہ رہے تھے۔ آبدار کی آنکھوں کی شوخی الجھن میں بدلی۔
"میں نے لڑکے کو ملک سے باہر بھیجنے اور اس کو اپنے سیف ہاؤس میں رکھنے میں تمہاری جتنی مدد کی تھی' اب تم بھی اتنی ہی جلدی مجھے کوئی رزلٹ دو ہاشم!"

وہ مڑنے لگے تھے۔ آبدار فوراً" الٹے قدموں واپس بھاگی البتہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
یقیناً" بابا کوئی غلط کام نہیں کر رہے' وہ کسی سائنسدان کی حفاظت کر رہے تھے۔ مجھے کیا؟ مگر سر جھٹک دینے سے وہ سوچیں جھٹکی نہیں جا رہی تھیں' وہ جس چہرے کے ساتھ گئی تھی' اس کے ساتھ واپس نہیں لوٹی تھی۔



اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو' وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے' جب تاج اچھالے جائیں گے

ہاشم واپس آیا تو گارڈز ہتھکڑی لگے سعدی کو لیے اس کے سامنے آئے اور کرسی پہ بٹھایا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کروفر سے بیٹھے ہاشم کاردار نے سر کو خم دیا۔ وہ ان ہی خاموش چبھتی نظروں سے ہاشم کو دیکھتا رہا۔ ایک گارڈ نے کاغذات لا کر میز پہ رکھے اور ساتھ قلم بھی۔
"چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔ تم نے ابھی تک لکھنا شروع نہیں کیا۔" نارمل انداز میں سوال کیا۔
"میں جواب دے چکا ہوں۔" لڑکے کی چبھتی نظریں اس پہ جمی تھیں۔
"کیا چاہتے ہو؟ تمہاری بہن کو تمہارے سامنے فون کروں؟ اوہ سعدی!" افسوس سے سر جھٹکا۔ "کیوں مجھ سے ایسے کام کروانا چاہتے ہو جنہیں کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے۔"
سعدی کی آنکھیں سُرخ ہوئیں۔ "بار بار میری بہن کا نام مت لو۔" وہ غرایا تھا۔ "تم یہ سب اس لیے کر رہے ہو تاکہ میں اپنی فیملی سے بدظن ہو جاؤں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہو گا ہاشم!"
"حالانکہ ایسا ہو جانا چاہیے' کیونکہ تمہاری فیملی تمہیں بھول کر اپنی زندگی میں مگن ہو چکی ہے۔ اگر میرا بھائی کھویا ہوتا تو میرے پاس افینو چلانے کا وقت نہ ہوتا' مگر تمہاری بہن....."
وہ ایک دم بھوکے شیر کی طرح ہاشم پہ جھپٹا تھا۔ ہتھکڑی میں بندھے ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ کر اس کی گردن دبوچنی چاہی' مگر ہاشم نے سختی سے اسے پیچھے دھکیلا۔ گارڈز نے بروقت اسے قابو کیا۔ وہ سُرخ' پسینے سے تر چہرے سے چلا رہا تھا۔
"اللہ غارت کرے تمہیں' اللہ برباد کرے تمہیں۔" اس کی سُرخ آنکھیں گیلی تھیں اور چلانے کے باعث آواز بیٹھ گئی تھی۔ ہاشم نے ناگواری سے کالر جھٹکے' میری نے جلدی سے رومال لا دیا' جس سے اس نے گردن تھپتھپائی جہاں ذرا سی خراش پڑ گئی تھی۔
گارڈز سعدی کو زبردستی بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ تیز تیز سانس لیتا ہانپتے ہوئے مسلسل چلا رہا تھا۔ ہاشم رومال رکھ کر چند لمحے سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔
"اپنی جذباتیت کو پرے رکھ کر میری بات سنو..... کان کھول کر۔" آنکھوں میں سختی لیے وہ بولا تھا۔ "تم یہاں اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہو' تمہیں اپنے سے

بڑے دشمن نہیں بنانے چاہیے تھے مگر تم نے بنائے۔ اب اپنے خاندان کو اپنی غلطیوں کی سزامت دو۔ پندرہ منٹ پہلے میں نے تمہاری بہن کو میسج کیا تھا کہ مجھے اس سے ملنا ہے۔ گھر میں نہیں' ایک ہوٹل میں۔" وہ موبائل نکالتے ہوئے بتا رہا تھا۔ سعدی گہرے گہرے سانس لیتا' نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کہا کہ میرا ڈرائیور اسے پک کرلے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ میں ملک سے باہر ہوں۔" اسکرین اس نے سامنے کی۔ "اس کا آڈیو میسج آیا ہے۔

یہ اصلی ہے۔ خود سن لو۔" سعدی کی نظریں اسکرین پہ ٹھہریں۔ اس پہ واٹس ایپ کی گفتگو کھلی تھی۔ اوپر "حنین یوسف" لکھا تھا۔ ہاشم نے نگاہیں سعدی پہ جمائے پلے کا بٹن دبایا۔

"اوکے' میں آجاؤں گی' آپ ڈرائیور بھیج دیں۔ میں ریسٹورنٹ میں ہوں۔ مجھے واپس بھی ادھر ڈراپ کروائیے گا۔ مجھے بھی آپ سے بات کرنی ہے۔ بائے!"

حنین کی مصروف سی آواز ختم ہوئی۔ سعدی کا دل کانپ کر رہ گیا۔ ہاتھوں میں لگی ہتھکڑیاں کیا ہوتی ہیں' کوئی اس سے پوچھتا۔

"سو سعدی یوسف۔۔۔! میرا ڈرائیور ٹھیک بیس منٹ بعد اس کو پک کرنے جائے گا اور ایک ہوٹل میں چھوڑ دے گا۔" سرد سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتانے لگا۔ "ڈونٹ وری' تمہاری بے وقوف بہن کو کچھ نہیں ہوگا مگر میرے گارڈز اسے وہیں بند کردیں گے اور صبح سے پہلے اس کو لوٹنے نہیں دیں گے۔ اور تمہاری جیسی فیملیز میں ایسا ایک واقعہ اس بچی کی ساری زندگی برباد کرسکتا ہے۔ سو اب سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" خود بھی پیچھے ہو کر بیٹھا اور تسلی سے جیسے اسے مژدہ سنایا۔

"اللہ برباد کرے تمہیں۔"

"اگر تمہیں یقین نہیں ہے۔ تو یہ نمبر دیکھ لو۔ یہ تمہاری بہن کا ہی نمبر ہے۔ مگر شاید اس نے تمہارے جانے کے بعد لیا تھا۔" اس کو دیکھتے ہوئے ہاشم نے حنین کے نام پہ کلک کیا تو اس کی پروفائل کھل گئی۔

سعدی کی بے بسی بھری غصیلی نظریں ہاشم سے ہوتی اسکرین پہ ٹھہریں۔

اسکرین پہ حنہ کی پروفائل پکچر تھی۔ اس کی اور سیم کی سیلفی۔ نیچے ایک موبائل نمبر لکھا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کا واٹس ایپ اسٹیٹس۔

"واوحی ربک الی النحل!" (اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف) ساتھ میں ایک ویڈیو کیمرے کا نشان اور لکھا تھا۔

Updated 6 mins Ago۔ سعدی ایک دم چونکا۔ ہاشم کو دیکھا۔

"آڈیو دوبارہ سناؤ۔" ہاشم نے حکم کی تعمیل کی۔ آڈیو پلے کی مگر سعدی صرف آڈیو کا وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ بیس منٹ پہلے کی تھی۔ حنین کی آواز اس کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ صرف اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

بیس منٹ پہلے؟ چھ منٹ پہلے؟ کیمیکل انجینئر نے ذہن میں جمع تفریق کی۔ جواب گھاٹے کا نہیں تھا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھائیں، مگر اب ان میں نہ غصہ تھا، نہ نفرت، نہ بے بسی۔ بھرا دکھ۔

ان میں کوئی عجیب سا تاثر تھا۔ ٹھنڈے گوشت جیسا۔

پھر سعدی نے گہری سانس لی اور ذرا پیچھے کو ہوا۔

"سو؟" کندھے اچکائے۔

"سو جتنی جلدی تم یہ کاغذ پُر کرو گے، اتنی جلدی میرے بندے تمہاری بہن کو عزت اور حفاظت سے واپس چھوڑ دیں گے۔"

سعدی ان ہی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم چاہو تو میری بہن کو اغوا بھی کر سکتے ہو مگر تم ایسا نہیں کرو گے، تم کوئی لور جرم افورڈ نہیں کر سکتے اور چاہتے ہو کہ میری نظروں میں میری بہن کو گراؤ۔ ہے نا؟" ابرو اٹھا کر پوچھا۔ اس کی آواز میں کاٹ تھی۔

ہاشم دونوں ہاتھ میز پہ رکھے آگے ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم زندگی میں پہلی دفعہ خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو۔" ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔ "اب جب اپنی بہن کو بچانے کے لیے تم یہ کاغذ پُر کر کے ایک جرم کرو گے، تو تمہیں احساس ہو گا کہ انسان کو اپنے خاندان کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ پھر تم جانو گے کہ تم ہیرو نہیں ہو میں ولن نہیں ہوں۔ بلکہ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔" زخمی سا مسکرایا۔ "آج ہم برابر ہو جائیں گے سعدی! کیونکہ جو کرنا ہوتا ہے، وہ کرنا پڑتا ہے۔"

سعدی بھی آگے کو ہوا۔ (گارڈز فوراً چوکس ہوئے) مگر اب وہ ہاشم پہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا تھا۔

"میں اور تم... برابر نہیں ہیں کیونکہ میں۔" کاغذ پرے دھکیلے۔ "ان کو پُر نہیں کروں گا۔"

"اور بے غیرت بننا پسند کرو گے؟ اپنی بہن کا کوئی خیال نہیں ہے؟" اس نے گویا ملامت کی۔ سعدی پیچھے ہوا۔ مسکرایا۔

"میری بہن تم سے ملنے نہیں آئے گی۔"

"یہ آڈیو جعلی نہیں تھی۔ یہ اصلی تھی۔ میرا ڈرائیور اب تک نکل چکا ہو گا۔ تمہاری بہن واقعی آ رہی ہے۔"

"مجھے پتا ہے، یہ آڈیو اصلی ہے مگر... میری بہن نہیں آئے گی۔" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ ہاشم نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"مجھے اس لڑکی پہ ترس آرہا ہے۔ تم اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔ خیر، تم سوچ لو۔ ہمارے پاس پوری رات ہے۔" گردن کی خراش کو مسلتے ہوئے وہ سکون سے بولا اور دور کھڑی میری کو لگا، سعدی پھر سے اس پہ جھپٹے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

"وہ ابھی تمہیں کال کرے گی، اور کہے گی کہ تم گاڑی نہ بھیجو۔ تمہارے ڈرائیور کو خالی ہاتھ آنا پڑے گا کیونکہ فارس غازی کی بہن کے ریسٹورنٹ سے تم ایک لڑکی کو زبردستی تو لے جا نہیں سکتے۔" اس کا اعتماد واپس آرہا تھا۔ ہاشم کو پہلی دفعہ اچنبھا ہوا۔ وہ کیا مس کر رہا تھا؟

"تم نے شاید غور سے سنا نہیں، تمہاری بہن میری بات رد نہیں کر سکتی، وہ..." جیب میں اس کا موبائل بجا۔ وہ ایک دم رکا۔ سعدی کی زخمی مسکراہٹ پھر سے نمودار ہوئی۔

"اٹھاؤ ہاشم کاردار، اور اسپیکر آن رکھو، کیونکہ میری بہن ابھی تم پہ غرائے گی اور میں وہ سننا چاہوں گا۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے مگر اپنا شوق پورا کر لو۔" وہ اسی کروفر سے اٹھا اور گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا ہر اشارہ پہچانتے تھے، اس سے سعدی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس قید خانے میں لایا جانے والا پہلا قیدی نہیں تھا۔ یہ کوئی ویئر ہاؤس تھا، جو سیف ہاؤس کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔

گارڈز اسے واپس اس کے کمرے میں لے آئے۔

لکڑی کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور شیشے کا دروازہ مقفل کر دیا۔ سعدی بیٹھا نہیں، دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ دیوار میں لگا انٹر کام کی طرح کا اسپیکر ایک گارڈ نے چلا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ ہاشم نے اپنے سیل کو کس طرح اس سے جوڑ رکھا تھا، مگر اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس اسپیکر سے اس کو ان کی گفتگو سنائی دے سکتی تھی مگر سعدی کی آواز نہیں جا سکتی تھی۔

ہاشم کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ جب دروازہ بند ہو چکا اور اس نے اپنے قیدی کو شیشے کے دروازے پہ ہاتھ جمائے، خود کو دیکھتے پایا تو کال اٹھالی۔

"ہیلو حنین!" خوشگوار لہجے میں بولا۔ نظریں شیشے کے پار سعدی پہ جمی تھیں۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ گہرے سانس۔

"حنین؟" ہاشم نے پھر پکارا۔

"آپ نے ڈرائیور بھیج دیا؟" سپاٹ سا انداز تھا۔

"ہاں! بھیجنے والا ہوں۔ تم تیار ہو؟" طنزیہ نظروں سے سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر خاموشی۔

"نہیں، میں نہیں آ رہی۔ ڈرائیور کو مت بھیجیں۔"

سعدی کی اٹھی گردن مزید اٹھ گئی۔ ہاشم پہ جمی چبھتی نظروں میں ملامت در آئی۔

ہاشم کاردار کو ایک دم گردن کی خراش میں شدید درد ہوا۔ اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

"کیا مطلب؟ تم نے ابھی کہا ہم..."

"مجھے پتا ہے میں نے کیا کہا اور اب میں کہہ رہی ہوں کہ میں نہیں آ رہی، سو نہیں آ رہی، بات ختم۔"

شیشے پہ دونوں ہاتھ رکھے سعدی نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس اندر اتاری۔

"کیا مطلب؟ مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی حنین۔" ہاشم کا گلا بند ہو رہا تھا۔ میز پہ رکھے کاغذ دیکھتے اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ ہارون کو کیا جواب دے گا؟

"رات کو گھر آئیے گا، ماموں کے سامنے کر لیجیے گا جو بات بھی ہو۔ آخر آپ ماموں کے کزن ہیں، اتنا تو حق ہے نا آپ کا۔" وہ سرد مہری مگر گیلی سی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اور پلیز مجھے ہر وقت کال مت کریں۔ میں آپ سے رشتے دار سمجھ کر کبھی بات کر لیتی ہوں تو آپ اس کا غلط فائدہ مت اٹھایا کریں۔"

ہاشم نے متعجب ہو کر دروازے کو دیکھا۔ سعدی اسی طرح وہاں کھڑا تھا۔ ہاشم کے ماتھے پہ ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ ایک دم سب غلط ہو رہا تھا۔

"تمہیں دس منٹ میں کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔ کسی نے منع کیا ہے مجھ سے ملنے کے لیے آنے کو؟" وہ ذرا غصے ہوا۔

شیشے کے پار کھڑے سعدی کی نظریں... ہاشم کا چہرہ احساس توہین سے سرخ پڑنے لگا۔

"ہاں۔ کیا ہے منع! میرے بھائی نے منع کیا ہے۔"

ہاشم کا سانس رک گیا۔ وہ بالکل پلک جھپکے بنا سعدی کو دیکھے گیا۔

"سعدی... تمہاری سعدی سے بات ہوئی ہے؟"

وہ اگلی دس زندگیوں میں بھی اس بات پہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ سعدی تو سارا وقت اس کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔ تو پھر...؟

"ہاں ہوئی ہے میری سعدی بھائی سے بات۔ اب پلیز... مجھے ڈسٹرب مت کریں۔" اور ٹھک سے فون بند ہو گیا۔

ہاشم نے بمشکل "ہیلو" کہا۔ پریشانی سے، تعجب سے۔ چند لمحوں کے لیے اسے بھول گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے، صرف یہی یاد تھا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا ہے، اور اس کا دل حیرت اور صدمے سے دھڑکنا بھول چکا ہے۔ فون کان سے ہٹا کر چہرہ اٹھایا۔

شیشے کے دروازے کے پار کھڑا سعدی آنکھوں میں چبھن بھرے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاشم تیزی سے آگے آیا، کوڈ دبا کر دروازہ کھولا، اور اسے گریبان سے پکڑ کر سامنے کیا۔

"کیا کیا ہے تم نے؟ ہاں؟" تعجب اور غصے سے وہ چلایا تھا۔ "دس منٹ میں کیا بدل دیا ہے تم نے؟ اس (کالی) نے میرے منہ پہ فون بند کر دیا۔"

"فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ من الشیطن الرجیم" (پھر جب تم قرآن پڑھو تو پناہ مانگا کرو دھتکارے ہوئے شیطان سے) سعدی تیز تیز سانسوں کے درمیان بولا تھا۔

ہاشم نے اس کو گریبان سے جھٹکا دے کر چھوڑا اور ان ہی بے یقین نظروں سے دیکھتا پیچھے ہوا۔

سعدی واپس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے، تھکے سانس لے کر خود کو پرسکون کر رہا تھا۔ "بے شک اس (شیطان) کا کوئی زور نہیں چلتا ان لوگوں پہ جو ایمان لائے..." اپنی پیشانی ہتھیلیوں پہ گرائے، وہ چہرہ جھکائے، آنکھیں بند کیے پڑھ رہا تھا۔ "اور جو اپنے رب پہ توکل کرتے ہیں۔"

ہاشم ان ہی بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھتا قدم قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"بے شک (اس) شیطان کا زور ان ہی لوگوں پہ چلتا ہے جو اس سے دوستی کرلیتے ہیں..." (سورۃ نحل) اس کی آواز دھیمی ہو رہی تھی۔ ہاشم تر پیشانی اور حیرت زدہ آنکھیں لیے دروازے تک پیچھے ہٹ گیا۔

"آج کے بعد تم میری بہن کو میرے خلاف استعمال نہیں کرسکتے' اس لیے اگلی دفعہ مجھے دھمکانے آنا تو کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا۔" وہ بلند آواز سے کہہ کر گویا اسے چیلنج کر رہا تھا۔

"تم... تمہاری بہن... فارس... سب اس کی سزا بھگتو گے۔ تم انتظار کرو۔" چوکھٹ تک رکا اور زور سے غرایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن کی خراش دہک رہی تھی۔ آستین سے تر پیشانی رگڑی اور مڑ کر باہر نکلتا گیا۔

سعدی ابھی تک زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا مگر اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ سنائی نہ دیتی۔ پورے زنداں خانے میں سناٹا چھایا تھا۔ پھر میری اس کے پاس آئی۔ اسے پانی لا کر دیا۔

"تم نے کیا کیا سعدی؟"

سعدی نے جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تم نہیں سمجھوگی۔"

میری کی آنکھوں میں تاسف در آیا۔ "جب تم سات سال پہلے قصر کاردار آئے تھے تو تمہارے آگے دروازہ میں نے کھولا تھا۔ اگر نہ کھولتی تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔" سعدی کچھ کہے بنا پانی کے گھونٹ بھرنے لگا۔



اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں 'اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

سعدی اور اس کے زنداں خانے کو وہیں چھوڑ کر ہم چند منٹ پیچھے واپس اسلام آباد کے اس ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں جہاں اوپری کمرے میں حنین بیٹھی رجسٹر پہ پھول بوٹے بنا رہی تھی۔ وہ آیت ہنوز لکھی موجود تھی، مگر حنین کو جب کچھ خاص سمجھ نہ آیا تو غور و فکر کرنا ترک کر دیا۔ تبھی زمر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"موبائل کمپنی نے بالآخر سگنل رپورٹ بھیج ہی دی۔" وہ اندر سے کاغذ نکالتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ حنین نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مگر بھائی کا موبائل سگنل آخری دفعہ ہماری کالونی میں آن ہوا تھا' یہ بتایا تو تھا پولیس نے۔"

"ہاں مگر اس کا واٹس ایپ اگلے دن بھی آن ہوا تھا' بائیس مئی کو' پولیس نے یہ نہیں بتایا۔ اس لیے میں نے کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔ سست روی سے سہی' کام انہوں نے کر دیا۔ تم تو کر کے دینے پہ تیار نہیں تھیں۔" وہ طنز نہیں تھا' بس سادگی سے کہا اور صفحے کھول کر چہرے کے سامنے کیے۔

حنین نے خفگی سے کچھ کہنا چاہا پھر سر جھٹک کر اس کے قریب آئی اور کاغذ پہ دیکھا۔ پھر دونوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"یہ علاقہ۔ یہ تو وہی ہے پھپھو جہاں ہم اب رہتے ہیں۔"

اور جہاں کاردار رہتے ہیں۔ زمر سوچتے ہوئے پڑھتی جارہی تھی۔ حنین الجھ کر رہ گئی۔

"سعدی کو آخری کال ہاشم کی طرف سے کی گئی ہے۔ دیکھو۔ یہ پولیس کی رپورٹ میں نہیں تھا۔" وہ دکھارہی تھی۔

"اس رات ہم سب ہی بھائی کو کال کر رہے تھے۔"

"مگر ہاشم کی کال کے وقت فون قصر کاردار یا ہماری انیکسی کے آس پاس تین کلومیٹر کے علاقے میں تھا۔ دوبارہ وہ بارہ بجے کے بعد آن ہوا' تقریباً" رات کے تین بجے۔ تب بھی وہ اسی علاقے میں تھا۔ اس کا واٹس ایپ بھی تب ہی آن ہوا ہوگا۔" کاغذ رکھ کر وہ سنجیدگی سے حنین کو دیکھنے لگی۔

"سعدی کی دو چیزیں کھوئی تھیں۔ کی چین اور موبائل۔ کی چین ممکنہ طور پر اس گواہ لڑکی کے پاس تھا مگر سیل فون کس کے پاس تھا؟ اور وہ اسے اس علاقے میں کیوں لے کر گیا؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ صرف ایک گواہ نہ ہو بلکہ قصرِ کاردار میں سے بھی کوئی گواہ ہو۔" چند لمحے سوچا۔ "نوشیرواں اس دن سے متضاد باتیں کہہ رہا ہے' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وہاں موجود ہو۔ ظاہر ہے وہ سعدی کا دوست ہے' وہ۔"

"نہیں' وہ بھائی کا دوست نہیں ہے۔" وہ ایک دم بولی۔ زمر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ "مگر.... سب جانتے ہیں کہ وہ دونوں دوست ہیں۔"

"میں باقی سب سے زیادہ جانتی ہوں بھائی کے بارے میں۔ میں نے سگنل ڈھونڈنے میں مدد نہیں دی مگر پچھلے چار سال سے جب نہ فارس غازی ادھر تھا' نہ زمر یوسف' تب حنین ہی تھی جو سعدی کے ساتھ تھی اس لیے وہ دوست نہیں تھے۔" قطعیت سے بتایا اور یہ بھی طنز نہ تھا۔ زمر نے گہری سانس لی۔

"وجہ؟"

"کسی لڑکی کو شیرو تنگ کرتا تھا' اس لڑکی نے اپنے منگیتر سے شیرو کو پٹوایا۔ بھائی نے سامنے موجود ہونے کے باوجود شیرو کی کوئی مدد نہیں کی۔ آرام سے بیٹھا رہا۔ اس پہ وہ بھائی سے خفا ہو گیا۔"

"مگر سعدی نے کوئی مدد کیوں نہیں کی؟"

"پتا نہیں۔ پھر بعد میں وہ ڈرگز لیتا تھا تو بھائی نے اس کی شکایت اس کی ممی کو لگائی' پھر میں نے اس کے اغوا کا پول کھولا۔ شیرو بھائی تو تب سے ہمارے جانی دشمن ہیں۔"

"تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"آپ نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ چند لمحے خاموشی چھا گئی۔

"تمہارا خیال ہے کہ.... شیرو سعدی کو گولی مار سکتا ہے؟"

"ارے نہیں.... اس سے تو اغوا بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا' گولی کہاں مار سکتا ہے کسی کو۔ میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ وہ دوسرا گواہ ہو سکتا ہے مگر بھائی سے بغض کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ خاموش ہو۔"

"جو بھی ہے' تم مجھے شام میں وہ چپ چارج کر کے دو گی' ہو سکتا ہے اس میں کچھ اہم ہو۔" پھر واپس گھوم کر دوبارہ سے کاغذ دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں ستائش تھی۔

"یہ موبائل سگنل بھی کیا چیز ہے حنین! نظر بھی نہیں آتا مگر اتنا مضبوط ہے کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنا نشان نہیں کھوتا۔"

حنین نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ الجھی نگاہوں سے اس آیت کو دیکھنے لگی۔

تبھی موبائل بجا۔ اس نے بے زاری سے دیکھا۔ ہاشم کا پیغام تھا۔ اسے ملنے کے لیے بلا رہا تھا۔ وہ ٹائپ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ گردن موڑ کر دیکھا' زمر فون پہ کسی وکیل سے بات کرتی اٹھ کر جا رہی تھی۔ وہ چلی گئی تو حنہ نے پیغام ریکارڈ کر کے اسے بھیجا۔ ملنا ہی تھا تو آدھے گھنٹے کے لیے وہ مل لے گی اور

حلیمہ والی بات بھی کلیئر کرلے گی۔ اور پھر سے رجسٹر کے کنارے پھول بوٹے بنانے لگی۔ وہ آیت ابھی تک صفحے پہ جگمگا رہی تھی۔ واوحی ربک الی النحل۔

شہد میں شفا ہے' مگر.... دل کی بیماری کی شفا شہد میں کیسے ہے؟ اس آیت میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ مگر کون سی نشانی؟ وہ سوچتی جا رہی تھی۔ ذہن میں زمر کے کہے الفاظ گونج رہے تھے۔

"یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے حنین...."

شہد کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟ عسل؟ اس نے ذہن سے اس آواز کو جھٹکتے ہوئے آیت پہ توجہ دی۔ ہو سکتا ہے "عسل" کا کوئی اور مطلب بھی ہو۔ کہتے ساتھ اس نے عسل کا لفظ آیت میں ڈھونڈنا چاہا۔

"یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے...."

مگر ایک منٹ۔ وہ الجھی۔ عسل کا لفظ تو آیت میں تھا ہی نہیں۔ آیت میں شہد کا لفظ تو تھا ہی نہیں۔ وہاں تو صرف "مشروب" (شراب) لکھا تھا۔ پھر.... وہ شہد کیوں ڈھونڈ رہی تھی؟"

"یہ موبائل سگنل بھی...."

وہ صفحہ اپنے قریب لائی۔ آنکھوں کے بالکل قریب۔ پلکیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ وہ غلط شے کو تلاش رہی تھی۔ وہ "آیت عسل" نہیں تھی۔ وہ "آیت نحل" تھی۔ موضوع شہد نہیں تھا' موضوع شہد کی مکھی تھا۔ ہنی بی۔

زمر ساتھ آکر بیٹھی اور اپنا کام کرنے لگی۔ حنین اسی طرح صفحے کو دیکھ رہی تھی۔

(سعدی بھائی بھی مجھ سے ایک دفعہ پوچھ رہے تھے۔)

(یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے حنین۔)

وہ متحیر سی بڑبڑائی۔ "موبائل سگنل۔"

"سوری؟" زمر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا' اسے لگا حنہ نے اسے پکارا ہے' مگر حنین اس وقت کسی اور دنیا میں تھی۔ اس نے نہیں سنا۔ بس تیزی سے اٹھی اور زمر کے آگے رکھا سعدی کا لیپ ٹاپ اٹھایا' اور اسے اپنی میز پہ لے آئی۔ بے قراری سے وہ جلدی جلدی کیز دباتی فیس بک کھول رہی تھی۔

سعدی کا فیس بک پہ دوستوں کا ایک گروپ تھا' چھوٹا سا' جہاں وہ ہر ہفتے اپنی ایک سیلف ویڈیو پوسٹ کرتا تھا' اس میں وہ کسی منتخب آیت کی اپنی سمجھ اور علم کے لحاظ سے تفسیر بیان کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس نے سال بھر پہلے چھوڑ دیا تھا' جاب کی مصروفیت کی وجہ سے مگر وہ ویڈیوز اب بھی اس گروپ میں تھیں۔ حنہ اس گروپ میں تھی مگر چونکہ وہاں سعدی کے دوست تھے سو اس کو کمنٹ کرنے کی اجازت بھائی کی طرف سے نہیں تھی لیکن ویڈیوز وہ دیکھا کرتی تھی' نیٹ چھوڑنے کے بعد بھی وہ ان ویڈیوز کو تب دیکھ لیتی جب بھائی امی کو دکھاتا.... اسے لگتا تھا وہ ان کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہے' لیکن آج دونوں کانوں کے درمیان کچھ اٹک گیا تھا....

مطلوبہ صفحہ کھل گیا.... وہ ویڈیو آج بھی وہاں موجود تھی۔ اس کا نام "آیت نحل" تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ویڈیو کھولی۔ کانوں میں ایئر فونز لگائے۔

اسکرین پہ ریسٹورنٹ کی کونے والی میز نظر آنے لگی۔ ایک یا سوا سال پہلے کا سعدی ادھر بیٹھا تھا' اور اسکرین پہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چند ابتدائی فقرے۔ حنہ نے اسکرین کو انگلیوں سے چھوا۔ کتنے دن بعد اس نے سعدی کو بولتے دیکھا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ موضوع پہ آگیا تھا۔

"کل صبح فجر میں سورۃ نحل پڑھ رہا تھا' تو آیات نحل نظروں سے گزریں تو میں نے ان پہ غور و فکر کیا۔ ہم اکثر قرآن میں اللہ تعالیٰ کو فرماتے سنتے ہیں کہ "اس میں نشانی ہے اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتی ہے۔" غور و فکر کرنا کیا ہوتا ہے؟ اس آیت کی تفاسیر پڑھ لینا؟ کیا یہ کافی ہوتا ہے؟ میرے خیال میں نہیں۔" ذرا رک کر سانس لی۔

"غور و فکر کہتے ہیں تفتیش کو' جیسے انگریزی فلموں میں سراغ رساں حضرات چھوٹے چھوٹے کلیوز کا

تعاقب کرتے ہوئے مجرم تک پہنچتے ہیں۔ میرے نزدیک قرآن میں غور و فکر کرنا بھی میٹریل evidence کو فالو کرنے جیسا ہے۔۔۔ یعنی ٹھوس شواہد کا پیچھا کرنا۔ ٹھوس شواہد میں ہر وہ چیز آتی ہے جو ٹھوس ہو' جسے آپ چھو سکیں۔ جیسے 'ایمان' کفر' شرک' روزہ' نماز' یہ ٹھوس چیزیں نہیں ہیں۔ مگر سمندر' پانی' جانور' شہد' یہ ٹھوس چیزیں ہیں۔ سو' آیت نحل کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس میں موجود ٹھوس شواہد کا تعاقب کرتا ہوں۔ شاید تب کچھ سمجھ آئے۔"

وہ سانس لینے کو ٹھہرا اور حنہ بالکل سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

"اس میں مشہور چیز شہد تھی' میں چند جگہوں پہ گیا' خالص شہد کے لیے۔ مگر پھر ایک دن مجھے اندازہ ہوا کہ لفظ شہد تو آیت میں لکھا ہی نہیں ہے' یہ آیت عسل نہیں تھی' یہ آیت نحل تھی۔ موضوع نحل ہے' سارا مسئلہ نحل کا ہے۔ تب مجھے ایک بہت دلچسپ بات معلوم ہوئی' مگر اس کے لیے ہمیں پچھلی تین آیات کو ملا کر پڑھنا ہو گا۔" اب اس نے میز پہ رکھا قرآن کھولا اور اس میں سے دیکھ کر بتانے لگا۔

"ان چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کی ڈرنکس کا ذکر کیا ہے۔ ایک ایک کر کے سب کو دیکھتے ہیں۔"

وہ "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھ کر آیت پڑھنے لگا۔ "اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی' پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔ بے شک اس میں البتہ ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں۔" چہرہ اٹھایا اور اپنی اسی معصوم مگر پیاری مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

"اب بظاہر یہ زمینداروں اور کسانوں سے متعلقہ آیت لگتی ہے کہ کیسے بارش کے بعد بنجر زمین زرخیز ہو جاتی ہے' مگر جو لوگ سنتے ہیں' یعنی جو لوگ قرآن کو غور سے سنا کرتے ہیں' ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں عموماً "جب" آسمان سے نازل شدہ پانی' کا ذکر کرتے ہیں' تو اس سے مراد وحی ہوتی ہے۔ وحی الٰہی۔" قدرے توقف سے کہنے لگا۔

"وحی تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو قرآن' اور الہامی کتابوں کی صورت میں۔ اللہ بندے سے مخاطب ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ پردے کے پیچھے سے خود بندے سے مخاطب ہو' جیسے موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پہ ہوتا تھا' یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج کے موقعے پہ ہوا تھا۔ تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ اپنے فرشتے کو انسان کے پاس کوئی پیغام دے کر بھیجے۔ اس تیسری وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو جو انبیاء کے پاس جبریل علیہ السلام کے ذریعے اترا کرتی تھی۔ اور دوسری "الہام" یعنی دل میں خیال کا ڈالے جانا۔ یہ ہر انسان کو ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھیے' الہام شیطانی بھی ہو سکتا ہے' اور فرشتے کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے' اس کو جج آپ شریعت کے اصولوں پہ ہی کریں گے۔ یہی الہام موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہوا تھا جس کی بنا پہ انہوں نے اپنا بچہ نیل میں اتارا تھا' اور یہی شہد کی مکھی کو ہوا تھا' یعنی اس کے دل میں خیال ڈالا گیا تھا۔" چند لمحے کے لیے رک کر قرآن کو دیکھا۔

"تو ان پانچ آیات میں پہلی قسم کا ڈرنک "پانی" ہے۔ وحی الٰہی جو آسمان سے اترتی ہے اور مردہ دلوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کوئی بھی چیز دل کو ایسے زندہ نہیں کرتی جیسے قرآن کرتا ہے اور کوئی بھی چیز ایسے دل مردہ نہیں کرتی جیسے اونچے قہقہے کرتے ہیں۔"

پھر صفحہ پلٹا۔ "اگلی آیت دیکھتے ہیں۔" پہلے عربی پڑھی' پھر اردو میں بتانے لگا۔

"اور بے شک تمہارے لیے مویشی جانوروں میں ایک سبق ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں میں گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں' خوشگوار ہے وہ پینے والوں کے لیے۔" سعدی نے چہرہ اٹھایا۔

"بارش وہ چیز ہے' جو فصل پہ ہو یا دل پہ' اس کا فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بارش کو اللہ نے ہمیشہ رحمت کہا ہے' ہم ڈیم نہیں

بناتے اور پلاننگ نہیں کرتے' اس لیے بارش زحمت بن جاتی ہے' ورنہ بارش تو سراسر فائدہ ہوتی ہے۔ اب دوسری قسم کی چیز دیکھیے۔ دودھ۔" وہ کہہ رہا تھا اور حنین ہر شے بھلائے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سب اس طرح کیوں نہیں سمجھ آیا تھا جیسے سعدی کو آیا تھا؟

"دودھ ان اچھی چیزوں کی مثال بیان کرتا ہے جو بُری چیزوں سے نکلتی ہیں۔ خون اور گوبر کے درمیان سے خالص اور پاک دودھ کا نکلنا' ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی ہم اپنے خلوص اور پاکیزہ نیت سے راستے نکال سکتے ہیں' اگر ہم چاہیں تو۔ آپ کو معلوم ہوگا وہ واقعہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین پیالوں میں سے دودھ کا انتخاب فرمایا تھا۔ کیونکہ دودھ عین فطرت ہے۔ تو فطرت میں کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی' آپ گندگی میں سے بھی اچھی چیز نکال سکتے ہیں۔ اب تیسری ڈرنک دیکھیے۔"

قرآن سے پڑھ کر سنانے لگا۔

"اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بنا لیتے ہو نشہ آور چیزیں (شراب) اور اچھا رزق (بھی بناتے ہو)۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لیے جو عقل رکھتی ہے۔"

"تو میرے عقل والے دوستو' تیسرا مشروب' یعنی شراب بنایا جاتا ہے پاکیزہ پھلوں سے۔ کھجور جیسے شجر طیبہ سے بھی بری چیزیں بن سکتی ہے۔ یہ سب آپ کے اوپر ہے۔ آپ اچھی چیز سے بھی بری بنا سکتے ہیں' اور بری سے بھی اچھی نکال سکتے ہیں۔ اس لیے چیزوں کا درست استعمال کریں۔ کمپیوٹر سے اچھے کام کیا کریں۔ جو نہیں دیکھنا چاہیے' وہ نہ دیکھا کریں اور جس کی اجازت نہیں ہے' وہ بھی نہ کیا کریں۔ آپ کوئی ناول پڑھ رہے ہیں مگر پیرنٹس نے اجازت نہیں دی ناول پڑھنے کی' تو اسے پڑھ کر آپ پیرنٹس کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں۔ ان کو کنوینس کریں' لیکن چھپ کر مت پڑھیں۔ یہ غلط ہے۔"

پھر اگلی آیت کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور وحی کی تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف۔

کہ بنائے اپنا گھر پہاڑوں پہ

اور درختوں میں' اور اس میں جو وہ پڑھاتے ہیں (اونچی چھتیں)

پھر کھا ہر قسم کے پھلوں میں سے۔

پھر چلتی رہ اپنے رب کے آسان راستوں پہ۔

نکلتا ہے ان (شہد کی مکھیوں) کے پیٹوں سے شربت۔

مختلف ہیں رنگ اس کے۔

شفا ہے اس میں لوگوں کے لیے۔

البتہ یقیناً" اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

سعدی چہرہ اٹھا کر واپس کیمرے میں دیکھنے لگا۔

بظاہر یہ ایک بہت سادہ سی آیت ہے۔ اس میں چوتھے مشروب کا ذکر ہے۔ شہد۔ جس کے پینے میں شفا ہے۔ میری ٹیچر کہتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کے "پینے" میں شفا کا ذکر کیا ہے۔ ویسے شہد پینے اور شہد کھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کبھی آزما کر دیکھیے گا۔

ذرا رک کر گہری سانس لی۔ حنین بے قراری سے اس کو دیکھتی اس کے اگلے الفاظ کی منتظر تھی۔

"اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے دل میں خیال ڈالا کہ وہ آبادیوں سے دور اونچی محفوظ جگہوں پہ اپنے گھر بنائے' پھلوں میں سے کھائے اور آسان راستوں پہ چلے۔ پھر جو اس کے پیٹ سے نکلے گا' شہد' اور ایک دوسری رطوبت بھی وہ شفا بخش ہوتی ہے۔ یہ تو ہوگیا آسان ترجمہ۔

مگر غور و فکر کرنے والے لوگ سادہ ترجمے پہ بس نہیں کرتے۔ ان کو کوئی نہ کوئی مزید مطلب ڈھونڈنا ہوتا ہے اور وقت اور حالات کے ساتھ یہ مطلب بدل جایا کرتے ہیں' قرآن میں وسعت ہے' مگر افسوس کہ قرآن پڑھنے والوں میں وسعت نہیں ہے۔ خیر۔"

صفحے پہ ایک نظر دوڑاتے گردن جھکائی۔

"میں کافی دیر شہد ڈھونڈتا رہا۔ خالص شہد' پھر مجھے اندازہ ہوا کہ خالص شہد ناپید ہوتا جا رہا ہے' تو میں شہد کی مکھی کی طرف آیا۔ اس آیت میں ٹھوس شے وہی تھی۔ مجھے اس دوران ایک دلچسپ ریسرچ ملی۔ گو کہ کچھ لوگ اس تحقیق کو نہیں مانتے' اور وہ کہتے ہیں کہ شہد کی کمی کی وجہ biopestides کا بے دریغ استعمال ہے' لیکن میں اس تحقیق کو مان سکتا ہوں' کیونکہ مجھے اس میں اور اس آیت میں ایک لنک نظر آتا ہے۔"

کہنے کے ساتھ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور اس کی تاریک اسکرین کمرے میں دکھائی دی۔

"شہد کیوں ناپید ہوتا جا رہا ہے' اس کی وجہ ہے یہ چیز۔ نہیں' بلکہ اس کے گرد چکراتا' ان دیکھا موبائل سگنل۔"

فون رکھا اور پھر سے سامنے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ موبائل سگنل بہت عجیب چیز ہے' آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں' کوئی آپ کو فون کرے تو یہ آپ کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ عین آپ کے کان کے قریب آبجتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ جگہ جگہ اونچے ٹاورز لگے ہوتے ہیں جن سے جڑا ان نادیدہ دلہروں کا جال پوری دنیا میں بچھا ہے' یہاں تک کہ دنیا ان ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ مگر یہ بری بات نہیں ہے' سیل فون ایک ضرورت ہے' ٹیکنالوجی ہے۔ سب کے پاس ہوتا ہی ہے۔ لیکن....."

حنین کی آنکھیں یکدم بھیگنے لگیں۔ اس کو یاد تھا کہ وہ آگے کیا کہے گا' مگر وہ اسے ایسے سنے گی' اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"لیکن ہوا یوں کہ شہد کی مکھی اللہ کے حکم پہ دور پہاڑوں' درختوں میں اپنا گھر بناتی ہے۔ وہ سارا دن باہر پھرتی ہے۔ ہر پھول' پھل پہ بیٹھتی ہے' اس کا رس لیتی ہے' اور پھر وہ واپس اپنے گھر جاتی ہے اور..... نہیں۔ یہیں رک جائیں۔ کیونکہ جب بچپن میں آپ نے یہ عمل پڑھا تھا' تب شہد کی مکھیاں گھروں کو لوٹتی تھیں' مگر آج 2014ء میں ایسا نہیں ہوتا۔ وجہ ہے.....

موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

"جب مکھی گھر سے نکلتی ہے تو اس کو اپنے گھر کا راستہ مقناطیسی لہروں کی مدد سے یاد رہتا ہے۔ وہ پھول' پھل پہ بیٹھتی ہے' اور رس لے کر واپس گھر کی طرف اڑتی ہے' لیکن درمیان میں..... موبائل سگنلز کی لہروں کا جال بچھا ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جب کسی سگنل کی لہر سے ٹکراتی ہے' تو مقناطیسی فیلڈ متاثر ہوتا ہے' یوں سمجھیں' وہ چکرا کر رہ جاتی ہے' اور "کنفیوژڈ" ہو جاتی ہے۔ اس ٹکر سے وہ سمت کا تعین کھو دیتی ہے۔ وہ اپنے گھر کا راستہ بھول جاتی ہے۔ وہ پھر باری باری ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑتی ہے' اور یونہی بھٹک بھٹک کر کہیں گر کر مر جاتی ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ گھر لوٹنے والی مکھیوں کی تعداد کم سے کم ہو رہی ہے۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے سوچا..... کہ یہ آیت نحل ہے' اتنی اہم آیت جس میں سورۃ کا نام لکھا ہے' تو شہد کی مکھی کی مثال بیان کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

حنین نے آنکھیں بند کر لیں' ان سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ایک سال پہلے کا سعدی بے خبر سا اسے کہہ رہا تھا۔

"تب مجھے احساس ہوا کہ..... یہ موبائلز ہماری دنیا سے مٹھاس کیسے غائب کر رہے ہیں۔ کتنی ہی پیاری اور اچھی لڑکیاں' جنہوں نے شہد سے میٹھے گھر بنانے تھے' وہ روز گھر سے نکلتی ہیں' پھولوں' رنگوں اور خوشبوؤں کی آس لے کر' آسان راستوں پہ چلتی ہیں' مگر پھر..... درمیان میں یہ موبائل سگنلز آجاتے ہیں۔ اور ان کے راستے مشکل ہو جاتے ہیں۔ وہ کنفیوز ہو جاتی ہیں۔

کسی نامحرم سے فون پہ بات کرنے کے لیے ڈھیروں دلیلیں گھڑتی ہیں' فتوے لیتی ہیں' کزن بھی تو بھائی ہوتا ہے' اسلام اتنا بھی سخت نہیں' میں کوئی غلط بات تو نہیں کر رہی' وغیرہ وغیرہ۔ اور اسی کرب اور تکلیف میں وہ گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ وہ دربدر بھٹکتی رہتی ہیں۔ انہوں نے تو آسان راستوں پہ چلنا تھا' اپنے

دلوں میں موجود قرآن سے اور نور سے 'لوگوں کو شفا دیتی تھی' اپنے ٹیلنٹ اور پوٹینشل کو میٹھے کاموں کے لیے استعمال کرتا تھا' مگر یہ موبائل سگنلز ان کو بیمار کر دیتے ہیں۔

مرض عشق بہت موذی مرض ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی اس میں مبتلا ہے تو یاد رکھیے' اس مرض کی شفا ہے' لیکن اس شفا کے لیے پہلے آپ کو اپنے راستے ٹھیک کرنے ہوں گے۔ وہ مشکل راہیں جن میں کرب ہے پکڑے جانے کا خوف ہے' ان کو ترک کرنا ہو گا۔"

کہنے کے ساتھ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"وقت کم ہے' میں اپنی باتوں سے کسی کو بور نہیں کرنا چاہتا' اس لیے قصہ مختصر' یہ آیات نحل ہمیں سکھاتی ہیں کہ جیسے گوبر اور خون کے درمیان سے پاکیزہ چیز نکل سکتی ہے' اور جیسے انگور اور کھجور سے ناپاک شے بن سکتی ہے' ویسے ہی شہد کی مکھی کے راستوں کو مشکل بنانے والی چیزوں کا صحیح یا غلط استعمال آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مگر اتنا یاد رکھیے گا۔

کہ جو آپ کے نصیب میں ہے' وہ آپ کو ضرور ملے گا۔ چاہے حرام سے چاہے حلال سے۔ لیکن اگر آپ اس کو حرام سے لینے کی کوشش کریں گے' تو اللہ آپ کے حلال کی لذت لے لے گا۔ کچھ میاں بیوی پسند کی شادی کے باوجود بڑی ناخوش زندگی گزار رہے ہوتے ہیں' کبھی سوچا ہے کیوں؟ کیونکہ وہ شادی سے پہلے سب حرام سے لے چکے ہوتے ہیں' جو بعد میں ان کو مل ہی جانا تھا اس لیے ان کے حلال کی مٹھاس ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کسی کے ساتھ' بھلے اپنے منگیتر کے ساتھ ہی سیل فون پہ انوالوڈ ہیں تو اتنا یاد رکھیں کہ محرم اور نا محرم کے قوانین آپ کی دلیلوں اور حیلوں بہانوں سے بدل نہیں جائیں گے۔ جو غلط ہے' وہ غلط ہے۔ آپ جتنا حرام لیں گے' اتنا اپنے حلال کو کھوتے جائیں گے۔"

ایک ثانیے کو رک کر اس نے طویل سانس بھری۔

"لیکن' اس کے برعکس اگر آپ حرام چھوڑ دیں' جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے' اس کو اللہ کے لیے ترک کر دیں' تو اللہ وہی چیز کچھ ہی عرصے میں آپ کو حلال بنا کر دے دے گا۔ یہ میں نہیں کہہ رہا' یہ امام ابن القیم نے سات سو برس پہلے کہا تھا۔ آپ جانتے ہیں' اللہ کسی کا کچھ نہیں رکھتا' وہ بہت غیرت والا ہے' آپ جو بھی اس کی راہ میں صدقہ کریں' یا قربانی' تو وہ اس کو کئی گنا برکت دے کر آپ کو لوٹا دیتا ہے۔ اس لیے...."

دوبارہ گھڑی دیکھی۔

"حرام کو چھوڑ دیں' اس یقین کے ساتھ کہ اللہ اس کو حلال بنا کر آپ کو لوٹا دے گا۔ میرا وقت ختم ہوا۔ اپنے واٹس ایپ اسٹیٹس کو صرف چوبیس گھنٹوں کے لیے ان آیات میں تبدیل کر دیجیے گا تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ کس کس گروپ ممبر نے آج کی آیات سن لی ہیں اور مجھے پتا ہے کہ آپ میں سے آدھے لوگوں نے نہیں سننی مگر خیر۔ السلام و علیکم ورحمتہ اللہ۔"

اور ہاتھ بڑھا کر اس نے کیمرہ آف کر دیا۔ وڈیو بھی رک گئی اور حنین کی تو جیسے زندگی ہی ٹھہر گئی۔

وہ وہاں بیٹھی تھی' ہونٹوں پہ مٹھی رکھے' بھیگے چہرے کے ساتھ۔ آنسو ٹپ ٹپ ٹھوڑی تلے گر رہے تھے۔ اس نے تین ماہ اتنی دلیلیں' اتنے حیلے' اتنی صفائیاں سوچی تھیں۔ سعدی نے ان کو دس منٹ کی ایک وڈیو میں ختم کر دیا تھا۔

محرم اور نا محرم کے اصول؟ ساری بات ہی ختم ہو گئی۔ اس کا پورا دماغ سن تھا۔

زمر کام کرتے کرتے مڑی تو اس پہ نظر پڑی۔ وہ ہیڈ فونز لگائے اسکرین کو آنسو بہاتے دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" فکرمندی سے پوچھا۔

"آئینہ!" وہ بس اتنا بولی۔ پھر فون اٹھایا' اور واٹس ایپ اسٹیٹس بدل دیا۔ ساتھ میں وڈیو کلپ کا نشان بھی بنایا۔ بھائی نہیں دیکھ سکتا' وہ جانتی تھی' مگر یہ ایک عادت تھی' جو گئے برسوں میں کچھ عرصے کے لیے اس نے اپنائی تھی' سو اب بھی کر لی۔

"حنین؟" زمر نے نرمی سے پکارا۔ حنین جواب دیے بنا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ زمر نے سخ

موڑ لیا اور اسے رونے دیا۔ وہ روتی گئی، روتی گئی۔ یہاں تک کہ آنسو ختم ہو گئے۔ پھر اس نے چہرہ اٹھایا، آنکھیں رگڑیں اور ہاشم کو کال کی۔

(وہ واٹس ایپ پہ ہی کال کرتی تھی، اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ملک سے باہر ہے)

زمر نے رخ موڑے ایک ایک بات سنی جو اس نے ہاشم سے کہی اور پھر اس نے جب فون رکھنے کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا۔ وہ اب سختی سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ دونوں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سب کہہ رہی تھی۔

اور اگر تم سے کبھی کوئی کہے کہ انسان کی کی گئی نیکی گھوم پھر کر اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتی ہے تو یقین کر لینا! کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔



قصہ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوہ یار طرحدار کروں یا نہ کروں؟

کلب کے لاؤنج میں روشنی مدھم تھی۔ بار کاؤنٹر کے ساتھ نوشیرواں اونچے اسٹول پہ بیٹھا تھا، اور مسلسل دونوں ہاتھوں سے موبائل کے بٹن دبا رہا تھا۔

شہرین باریک ہیل سے چلتی قریب آئی اور ساتھ والے اسٹول پہ بیٹھی، رخ اس کی طرف موڑا، اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلایا۔ شیرو نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کر ان میں خفگی آئی۔

"آپ ادھر؟ خیریت؟" خشک روی سے کہتا، دوبارہ بٹن دبانے لگا۔ شہری نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر کاؤنٹر پہ رکھا۔

"تین دن سے تمہیں کال کر رہی ہوں، اٹھاتے کیوں نہیں ہو؟" روٹھے پن سے گویا ہوئی۔ شیرو نے بے زاری سے شانے اچکائے۔ "مجھ سے کیا کام آپڑا آپ کو؟"

"ہر وقت مجھ سے خفا کیوں رہتے ہو؟ دیکھو! ہم اچھے دوست بھی تو ہیں، آؤ اب موڈ ٹھیک کرو، کارڈز کھیلتے ہیں۔" اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ زیادہ دیر بے زار رویہ برقرار نہ رکھ سکا اور ساتھ کھنچتا آیا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے، پتے کھیل رہے تھے۔

"تم ہار رہے ہو شیرو!"

"نہیں.... ابھی دیکھیے گا۔" اس کی مکمل توجہ کارڈز پہ تھی۔ اپنے پتے دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اب کون سا پھینکے کہ.....

"مجھے کچھ دن کے لیے تمہاری جی فورٹی ون مل سکتی ہے؟" ایک دم چونک کر شہری کو دیکھا۔ وہ بھی پتوں کو دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا؟" بظاہر نا سمجھی دکھائی۔ شہری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اتنے ڈمب مت بنو۔ تمہاری جی فورٹی ون، گلاک گن جو پچھلی برتھ ڈے پہ تمہیں ہاشم نے گفٹ کی تھی، میرے سامنے تو تم نے تحفہ کھولا تھا۔ مجھے دے سکتے ہو چند دن کے لیے۔ کچھ دوستوں میں شو آف کرنا ہے۔"

شیرو نے پتے میز پہ ڈال دیے، تندہی سے اسے دیکھا۔ "تو یہ سارا میٹھا انداز اس لیے تھا؟ اور میں سمجھا آپ کو واقعی میرا خیال ہے۔"

"خیال ہے تو دوست سمجھ کر ایک گن مانگ رہی ہوں، نہیں دینی تو نہ دو۔ غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

نوشیرواں کے حلق میں کانٹے اگ آئے۔

"میرے پاس جی فورٹی ون نہیں تھی، فورٹی فائیو تھی۔ ماڈل تو ٹھیک سے یاد رکھا کریں۔" سر جھٹک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہتھیلیاں نم تھیں، اور رنگت بدل رہی تھی۔

شہرین کارڈز رکھ کر آگے ہوئی اور بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "رئیلی؟ مجھے تو جی فورٹی ون یاد پڑتی ہے۔"

"تو پھر آپ اپنی یادداشت کا علاج کروائیں، کیونکہ میرے پاس ایسی کوئی گن نہیں ہے، سنا آپ نے؟" بھڑک کر کہتے وہ اٹھا۔ پیشانی بھی تر ہو رہی تھی اور آنکھوں میں بے چینی سی تھی۔ شہری نے گردن اٹھا کر

دلچسپی سے اسے دیکھا۔
"ٹھیک ہے، مجھے غلط یاد ہوگا' ایک گن ہی تو ہے' اس میں اتنا غصہ کیوں دکھا رہے ہو؟"
وہ میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا اور سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔ "آئندہ میرے راستے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے' جائیں' فارس کے آگے پیچھے پھریں۔ جیسے میں تو جانتا ہی نہیں۔"
شہرین کی ذرا رنگت بدلی' بے اختیار ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ اب سیدھا ہو کر مڑ گیا تھا اور باہر کی طرف جا رہا تھا۔
مگر شہری کو اپنا جواب مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

وہ رات جب قصر کاردار اور ملحقہ انیکسی پہ اُتری تو ستمبر کی گرم اور حبس زدہ فضا سے پُر تھی۔ نوشیرواں اپنے بیڈ پہ بے چینی سے کروٹ بدل رہا تھا' ذہن میں ہاشم کی باتیں گونج رہی تھیں۔
("میرے پاس شہرین سے بڑے مسائل ہیں اس وقت۔ تم نے جو کہا' وہ بہت ہے' مزید اس پر بات مت کرو۔ کچھ نہیں معلوم ہوگا اسے۔")
البتہ ایک عجیب سی پریشانی اس کے وجود سے لپٹی تھی۔ کیا یہ مسئلہ کبھی نہیں ختم ہوگا؟ سعدی یوسف کا آسیب اس کا پیچھا کب چھوڑے گا؟
اس کمرے سے دور انیکسی کی تقریباً" تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ فارس سو رہا تھا' جب زمر احتیاط سے کمرے سے نکل آئی۔ تہہ خانے میں آکر دروازہ مقفل کیا' (دروازے ساؤنڈ پروف تھے) اور پھر جلدی سے فرش پہ بیٹھی حنہ تک آئی۔
"کیسے چارج کیا پین؟"
"لیپ ٹاپ سے۔ اس میں دو ویڈیوز ہیں۔ ایک جج صاحب کی ہے' میں نے ابھی وہی شروع کی تھی۔ دیکھیں۔" وہ ویڈیو دیکھنے کے بعد دونوں نے جھرجھری لی۔ پھر حنہ نے دوسری ویڈیو کھولی۔ اب وہ دونوں فرش پہ بیٹھی تھیں' اور سامنے اسکرین پر چہرہ جھکائے غور سے دیکھ رہی تھیں۔
منظر کھلا اور ایک راہداری سی نظر آئی۔ آفس کے باہر کا منظر۔ ٹیبل کے پیچھے موجود سیکرٹری۔ ڈیسک کیلنڈر پہ واضح لکھی تاریخ۔ اکیس مئی۔ خاور اور ساتھ ایک گارڈ۔ کیمرے کے آگے پیچھے تھپتھپا کر تلاشی لے رہے تھے۔ ایک موبائل' چابیاں نکال کر سیکرٹری کی ٹوکری میں رکھا۔ سعدی کی آواز پس منظر سے آئی۔ حنین کے ابرو اٹھے۔
"بھائی نے کوٹ کی فرنٹ پاکٹ میں ڈالا ہوا ہے پین۔"
"اور یہ ہاشم کا آفس ہے۔ وہ اس کی تلاشی لے رہے ہیں۔"
پھر "اوکے" کے سگنل کے بعد کیمرہ آگے بڑھتا گیا۔ زمر کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔ "وہ ڈیٹیکٹر سے چیک کر رہے تھے تو پین کیوں نہیں پکڑا؟"
"ماموں کے اس آرٹسٹ دوست نے بتایا تو تھا یہ پین نہیں پکڑا جاتا۔ خاور اسلحہ یا وائرڈھونڈ رہا تھا' اسے لگا ہوگا کہ یہ عام پین ہے۔ وہ ہاشم کا مہمان تھا' خاور اس کا کوٹ تو نہیں اتروا سکتا تھا۔" دونوں کی نظریں اب اسکرین پہ ٹھہر گئی تھیں۔ اندر آفس میں تینوں کاردارز تھے۔ خاور تھا۔ سعدی نیکلس میز پہ رکھ رہا تھا......
تہہ خانے میں لگی گھڑی کی ٹک ٹک واضح سنائی دے رہی تھی۔ سعدی قتل عمد کے بارے میں اسلام کے دونوں نقطہ نظر بتا رہا تھا......
گھڑی کا پنڈولم مسلسل جھول رہا تھا...... دائیں بائیں۔
وہ سعدی کو تیس کروڑ دے رہا تھا' جواب میں سعدی نے اس کے بھائی کی قیمت ساٹھ کروڑ لگائی تھی
کونے میں چھوٹے سے باتھ روم کی ٹونٹی سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ٹپ ٹپ۔

ہاشم اب سعدی کو جج کو بلیک میل کرنے والا قصہ سنا رہا تھا۔ فائل دکھا رہا تھا۔

تہہ خانے میں پنکھے کی ہوا سے دیوار پہ لگے کاغذ ہلکے ہلکے پھڑپھڑا رہے تھے۔

ہاشم اب حنین کے امتحانی مرکز والے وکیل صاحب کو کال کر کے کہہ رہا تھا کہ وہ حنین کا کیس دوبارہ کھلوا سکتا ہے۔

پنکھے کی گرڑ گرڑ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔۔۔

اب سعدی باہر سیکرٹری کے ڈیسک کے ساتھ نوشیرواں کو کہہ رہا تھا کہ مرو بنے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ لفٹ کے دروازے بند ہوتے دکھائی دیے۔۔۔ اور اسکرین تاریک ہو گئی۔

اس وقت۔۔۔ اس دنیا میں۔۔۔ اس شہر میں۔۔۔ اس گھر میں۔۔۔ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ سانس لینے کی بھی نہیں، دل دھڑکنے کی بھی نہیں۔ کہتے ہیں جب فرشتے روح نکالتے ہیں تو آواز تک نہیں آتی۔ مگر کیا کبھی تم نے شیطان کو روح نکالتے دیکھا ہے؟

اس کی بھی آواز نہیں آتی۔



مری سرکشی بھی تھی منفرد، مری عاجزی بھی کمال تھی
میں انا پرست بلا کا تھا سو گرا تو اپنے ہی پاؤں میں

"کاردار زنے کیا ہے یہ سب۔" حنین کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ "بھائی کو بھی انہوں نے ہی شوٹ کروایا تھا۔ بھائی انہی کے پاس ہے۔"

زمر فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے حنین کو نہیں دیکھا۔ بس ننگے پیروں سے زینہ چڑھنے لگی۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ لاؤنج خاموش پڑا تھا۔ وہ قدم قدم اٹھاتی سیڑھیوں تک آئی۔ اوپر چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ سب دھندلا تھا۔ اندھیرے اور روشنی کے جھماکے سے چمک رہے تھے۔ کبھی منظر صاف ہوتا، کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ گرم گرم آنسو اپنے گالوں پہ گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، اس نے اوپر چڑھنا چاہا۔ قدم وزنی تھے، دل بھاری تھا، اور سانس۔۔۔ سانس اکھڑ رہی تھی۔

چوتھے زینے پہ وہ رکی، دہرے ہو کر چند گہرے سانس لیے۔۔۔ پانی سے بھری آنکھیں جھپکیں، پھر قدم اٹھائے۔ سر چکرا رہا تھا۔ اندھیرا، روشنی، پھر اندھیرا۔ دھواں ہی دھواں تھا۔

وہ اوپری سیڑھی پہ گھٹنوں کے بل گر سی گئی۔ ہاتھ ریلنگ سے پھسلتا نیچے آ گرا۔ چہرہ جھکائے، تیز تیز سانس لیتے، وہ دوہری ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے گرم گرم پانی میں روانی آ گئی تھی، مگر ایسا لگتا تھا، وہ سب کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کسی سلو موشن فلم کی طرح۔

دونوں ہاتھ فرش پہ رکھے، وہ دوہری ہوئی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگی، مگر ان کی آواز نہیں آتی تھی۔ سانس بے ترتیب تھا، اس کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ دل لگتا تھا کسی نے کند چھری سے چار ٹکڑوں میں کاٹ دیا ہو۔ اندر سے خون بھل بھل نکلنے لگا ہو، اور اوپر سے آنسو گر رہے ہوں۔ اس کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔

اس نے گیلے چہرے اور اکھڑتے سانس کے ساتھ کھڑے ہونے کی کوشش کی، پیروں میں جان نہیں تھی۔ بدقت وہ کھڑی ہوئی۔ دیوار کا سہارا لیا۔ اسے لگا اس کو واقعی سانس نہیں آ رہا تھا۔

دیوار پہ ہاتھ رکھے، اس نے دروازہ دھکیلا۔ اندر مدھم نائٹ بلب جل رہا تھا۔ وہ کاؤچ پہ سو رہا تھا۔ وہ آج آفس سے تھکا ہوا آیا تھا، اس لیے بے خبر سو رہا تھا۔ بے خبری بھی نعمت تھی۔ وہ نعمت زمر یوسف خان سے چھن چکی تھی۔

وہ دروازے سے سر ٹکائے، وہیں چوکھٹ میں بیٹھتی گئی۔ اندر اے سی کی ٹھنڈ تھی۔ اسے یکدم سخت سردی لگنے لگی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ سانس ڈوبتا جا رہا تھا۔

پہلی دفعہ ہاشم کے ذہن میں گونجتے فقروں، فارس کی بے گناہی، سعدی، ان سب سے ہٹ کر پہلی دفعہ زمر کو احساس ہوا کہ اسے واقعتاً سانس نہیں آ رہا۔ وہ

کیفیت صرف جذباتی نہیں تھی۔ وہ جسمانی تھی۔ اس پردے کا حملہ ہو رہا تھا۔ اس نے کھانسنے کی کوشش کی نہ ہوا اندر جاتی تھی' نہ سانس باہر آتی تھی۔ اس کے ناخن سفید پڑ رہے تھے۔ منظر اندھیرے میں ڈوبتا' کبھی واپس روشن ہوتا۔۔۔

نیم جان آنکھوں میں بے بسی لیے اس نے صوفے پہ لیٹے فارس کو دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ویڈیو دیکھنے سے پہلے' یا ان تین ماہ میں اگر کسی کو وہ اس تکلیف میں آواز دے سکتی تھی' تو وہ یہی تھا۔ مگر اب؟ کھویا ہوا حق کوئی کیسے واپس لائے؟

"فارس!" اس نے مدھم سرگوشی میں پکارا۔ آنکھوں سے آنسو برابر گر رہے تھے۔ دل پہ مٹھی رکھے' وہ شدید تکلیف میں کھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تھکا ہوا تھا' اور واقعی نیند میں تھا' اس تک آواز نہیں گئی۔ زمر بمشکل اٹھی۔ چند قدم خود کو گھسیٹا۔ صوفے کے آگے رکھی میز کا کونا پکڑے پکڑے شدید تکلیف میں بیٹھی۔ وہیں فرش پہ۔۔۔

"فارس!" آواز نہیں نکلی۔ صرف ہونٹ ہلے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس نے بے جان ہوتے ہاتھ سے فارس کی آنکھوں پہ رکھا بازو ہلایا۔

"فارس۔۔۔ اٹھو!" آواز اب بھی نہ نکل پائی' مگر فارس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو ہٹایا اور ایک دم اٹھتے ہی دوسرا ہاتھ تکیے تلے رکھی پستول تک گیا' مگر پھر' وہ رک گیا۔

"زمر؟" خوابیدہ آنکھوں میں تعجب بھرے وہ اٹھا۔ اور پھر۔۔۔ کوئی احساس طمانیت تھا جو زمر کا منظر پھر سے دھندلانے لگا۔ نڈھال' تھکن زدہ۔

اگلے مناظر اس کو ٹوٹ ٹوٹ کر نظر آئے تھے۔ اندھیرے کے درمیان چند روشن لمحے۔۔۔ وہ پریشانی سے اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا وہ روشن باتھ روم کے سنک پہ کھڑی تھی اور آئینے میں اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ ٹونٹی سے اس کا منہ دھلا رہا ہے۔ اب بھی وہ اسے پکار رہا تھا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ پھر روشنی۔۔۔ اس نے دیکھا کہ وہ بیڈ پہ لیٹی تھی' تکیوں کے سہارے سر کی جگہ اونچی تھی' سردی کے باعث اس نے لحاف گردن تک تان رکھا تھا۔ پنکھا' اے سی سب بند تھا۔ اور وہ اس کو ان ہیلر دے رہا تھا۔۔۔

زمر نے نڈھال ہو کر سر بیڈ کراؤن سے ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر کے چند گہرے سانس لیے۔ آکسیجن بحال ہو چکی تھی۔ اس کی رنگت بہتر ہو رہی تھی۔ اس نے پانی سے بھری آنکھیں کھولیں۔ وہ ساتھ ایک گھٹنا موڑے بیڈ پہ بیٹھا' فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے آواز آنے لگی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"آپ اپنے استھما کے لیے ان ہیلر کیوں نہیں ساتھ رکھتیں؟ آپ کو اندازہ ہے اگر آپا کے میڈیسن کیبنٹ میں ان ہیلر نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟"

اس نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے لگا وہ اسے پہلی دفعہ دیکھ رہی ہے۔ پوری آستین کی ٹی شرٹ ٹراؤزر' چھوٹے کٹے بال اور ہلکی بڑھی شیو۔ آنکھوں میں چھپا تفکر۔ زمر بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے' اسے دیکھتی رہی۔

"وہ بیج زہریلے تھے!"

فارس ناسمجھی سے ذرا آگے ہوا۔ "کیا چیز؟"

"کئی سال پہلے۔۔۔ جب یہ شہر۔۔۔ اسلام آباد۔۔۔ غیر آباد تھا۔۔۔ اور ہم' ہم سادہ' غریب لوگ تھے۔" اس کے چہرے کو تکتی وہ کہہ رہی تھی۔ "تو ہم نے۔۔۔ ہم نے غلط دوست بنائے فارس۔۔۔ ہم نے آسٹریلیا سے دوستی کی۔۔۔ اس وقت وہ۔۔۔ ہمیں بے ضرر لگتے تھے' امیر تھے' مگر اچھے تھے۔ خوش اخلاق تھے' ہمیں لگا وہ ہمارے جیسے ہی ہیں' ہمارا بھلا چاہتے ہیں۔" آنکھوں سے گرتے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔ وہ غور سے اسے دیکھتا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہماری حکومت۔۔۔ ہم اپنا شہر آباد کرنا چاہتے تھے ہمارے امیر دوست نے کہا وہ ہماری مدد کرے گا۔۔۔ ہم نے اس پہ بھروسا کیا۔۔۔ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ فارس ہم نے کیوں اس پہ بھروسا کیا؟" بے چارگی سے پوچھتے وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"آپ بے کار باتیں مت سوچیں، آرام سے سو جائیں اب آپ کا سانس ٹھیک ہے۔" وہ نرمی سے اس کی توجہ ہٹا رہا تھا، مگر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی طرح روتے کہتی رہی۔

"تمہیں پتا ہے... آسٹریلین حکومت نے ہمیں بیج دیے، پھر اوپر..." اشارہ کیا۔ "اوپر ہیلی کاپٹر سے وہ بیج پورے شہر میں گرائے گئے... ان سے درخت نکلے... اونچے مضبوط تناور درخت... وہ فارس ہماری دوستی کی علامت تھی... مگر وہ بیج زہریلے تھے... انہوں نے اس شہر کو تباہ کر دیا۔ ان درختوں کی جڑیں میلوں دور تک پھیلی ہیں، اور وہ اس شہر کا میٹھا پانی پی گئے... اور ان کے پتے ان کے پتے استھما الاحق کرتے ہیں... اس دوستی نے ہم سے ہمارا سانس تک چھین لیا فارس ہم نے کیوں ان پہ اعتبار کیا؟" وہ پھر سے بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

"زمر حکومتی پالیسی آپ کی غلطی نہیں ہے۔ وہ درخت آسٹریلیا میں بھی ہیں، بس ہمارے ماحول کو سوٹ نہیں کیے، جیسے ان کو خرگوش سوٹ نہیں کیے تھے۔ آپ کا استھما ٹھیک ہو جائے گا۔"

زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تکلیف اب کبھی نہیں جائے گی۔ جب... جب وہ درخت لگائے جا رہے ہوں گے... تو کسی نے تو روکا ہو گا... کہا ہو گا کہ اس کی بات سنی جائے... ہم نے اس کی بات کیوں نہیں سنی؟ ہم اتنے ضدی، اتنے ہٹ دھرم، اتنے اندھے بہرے کیوں ہو گئے تھے؟ ہم نے اس کو کیوں نہیں سنا؟ اس کو ایک دفعہ وضاحت کا موقع کیوں نہیں دیا؟"

"زمر..." اس نے غور سے زمر کی روتی آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا کچھ ہوا ہے؟ کوئی اور بھی بات ہے؟ یا یہ صرف اس دمے کی تکلیف کی وجہ سے ہے؟"

زمر نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "یہ تکلیف چھوٹی نہیں ہے۔ یہ تکلیف بہت زیادہ ہے فارس۔" مٹھی سے دل پہ دستک دی۔ "مجھے اندر تک جلن ہو رہی ہے۔" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"پہلے کبھی ہوا ہے اتنا درد؟"

"کبھی نہیں ہوا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی تکلیف ہو گی فارس! میں کدھر جاؤں فارس؟"

"اٹھیں، میں آپ کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔" وہ واقعی اٹھ رہا تھا۔ زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"ضد مت کریں۔"

"ضد؟" اس کے دل کو آری نے چیر کر رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، وہ نیم دراز تھی، پھر سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

"مجھے سونا ہے اور کبھی نہیں اٹھنا۔" اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کھڑا چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"کچھ کھانے کے لیے لا دوں آپ کو؟"

"زہر دے سکتے ہو؟" وہ بند آنکھوں سے بڑبڑائی تھی۔

"استغفراللہ... کیوں مجھے دوبارہ جیل بھیجنا چاہتی ہیں؟" اور فارس غازی تو ایسی باتیں کرتا رہتا تھا، اب بھی کہہ کر جھکا، اور اس کا تکیہ ٹھیک کرنے لگا۔ زمر نے آنکھیں کھولیں، ان میں ایسا دل کٹنے والا احساس تھا کہ... الفاظ کو روک نہ پائی۔

"تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہوتی؟"

وہ جھک کر تکیہ درست کرتے رکا۔ قدرے تعجب سے اس کو دیکھا۔ "مجھے آپ سے نفرت کیوں ہو گی؟"

"میں نے چار سال پہلے تمہیں قید میں ڈالا تھا!"

"آپ نے سات سال پہلے مجھے قید میں ڈالا تھا!" وہ آہستہ سے بولا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وقت چند لمحوں کے لیے بالکل تھم سا گیا۔ اس کا سانس پھر سے تھم گیا۔ مگر اب یہ دمہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔

زمر کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر بہنے لگے۔ وہ سیدھا ہو گیا، نظریں چرا کر اس کو سونے کی تاکید کرنے لگا۔ زمر نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب وہ واپس صوفے کی طرف جا رہا تھا...

☼ ☼ ☼

نیچے تہہ خانے میں بتی اور پنکھا ہنوز چل رہا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ٹونٹی کی ٹپ ٹپ۔۔۔ سب سنائی دے رہی تھی۔ حنین اسی طرح بے سدھ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں روئی تھی۔ بس بھنویں بھینچے بیٹھی رہی' بیٹھی رہی' بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم اٹھی۔ تیزی سے اوپر آئی۔ گھر خاموش اور ساکن تھا۔ وہ کچن میں آئی۔ اسٹینڈ سے پھل کاٹنے والا چاقو اٹھایا اور بیرونی دروازے سے باہر نکل آئی۔

باہر سبزہ زار رات کے اس پہر خاموش تھا۔ زیادہ وقت نہیں ہوا تھا' شاید بارہ یا ایک بجا تھا۔ وہ تیز قدموں سے گھاس پہ چلتی آگے جارہی تھی' اس کا چہرہ پتھریلا تھا اور آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔

وہ کھڑی کتنی ہی دیر اس قصر کو دیکھتی رہی' پھر کنارے پہ لگے درختوں تک آئی۔ ایک درخت کے قدموں میں بیٹھی اور زور زور سے اس کے تنے پہ چاقو مارنے لگی۔ ضرب در ضرب۔ نفرت سے' غصے سے' شاک سے۔

"حنین!" آواز پہ چونک کر گردن گھمائی۔ خاور موبائل پہ بات کرتا اس طرف آرہا تھا۔ پھر فون رکھا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تم اس وقت ادھر کیا کررہی ہو؟"

"میں اس درخت کو کاٹنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"فارس صاحب کو پتا ہے کہ تم ادھر ہو؟ وہ خفا ہوں گے۔"

وہ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے یہ درخت زہر لگنے لگا ہے۔ دل چاہتا ہے اسے ایک ہی ضرب لگا کر گرادوں؟ میں یہی سوچ کر چھری لیے گھر سے نکلی تھی۔ مگر میں غلط تھی۔ ایک ٹکڑے میں ذبح کردینے سے تو سارا مزا ختم ہوجائے گا۔ کیوں نہ بار بار کاٹا جائے؟ ہزار ٹکڑوں میں؟"

(اف ٹین ایجرز) خاور کا فون پھر سے بجنے لگا۔ اس نے مسکرا کر اسے سائلنٹ کیا۔ "انگریزی فلمیں کم دیکھا کرو' اب اندر جاؤ۔ فارس صاحب نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ جاؤ۔"

"تھینک یو' خاور۔۔۔" رکی۔ الجھن سے شانے اچکائے۔ "میں آپ کو کیا کہہ کر پکارا کروں؟ صرف نام سے پکارنا برا لگتا ہے اور ریلیشن شپ ٹائٹلز سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے۔"

"کرنل خاور! تم مجھے کرنل خاور کہہ سکتی ہو۔"

"اوہ یس۔ آپ ایکس ملٹری مین ہیں نا' یاد آیا۔" حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا لگا آپ سے بات کرکے کرنل خاور۔۔۔ ہمیں اکثریات کرنی چاہیے۔"

وہ سر کو خم دیتا مڑ کر جانے لگا تو حنہ نے پکارا۔ "کرنل خاور۔۔۔ آپ کی فیملی ہے؟"

خاور نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "ظاہر ہے!"

"اچھا۔ کون کون ہے آپ کی فیملی میں؟"

"میری والدہ' میری بیوی اور۔۔۔" ذرا رکا' چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ آئی۔ "میرا بیٹا۔"

"گڈ!" اذیت سے مسکرائی۔ خاور کا فون پھر سے بجنے لگا۔ وہ مڑ گیا تو حنین بھی گھر کی طرف واپس چلی آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ مگر خشک تھیں۔

☼ ☼ ☼

انا پرست تو ہم بھی غضب کے ہیں لیکن
تیرے غرور کا بس احترام کرتے ہیں

رات جانے کس پہر بارش ہوئی تھی کہ جب صبح طلوع ہوئی تو موسم خوشگوار اور ابر آلود تھا۔ زمر نے کروٹ بدلی' نیند ٹوٹی تو آنکھیں کھولیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا گھڑی پہن رہا تھا۔ کھڑکی سے روشنی اندر چھن چھن کر آرہی تھی۔

زمر کی آنکھیں بدستور جل رہی تھیں۔ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹے' لحاف گردن تک تانے' آہستہ سے پکارا۔

"فارس!" وہ چونک کر مڑا۔ گول گلے کی شرٹ میں ملبوس' وہ گھڑی کی اسٹریپ بند کرتے آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر...." وہ رکی' آواز خراب گلے جیسی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا تھا' مجھے استھما ہے؟"

"مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ پتا ہے۔ اسی لیے...." اسٹریپ کا بکل بند کرتے ہوئے وہ اس کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ "کیا کل کچھ ہوا تھا؟ آپ صرف استھما کی وجہ سے ایسے نہیں رویا کرتیں۔"

زمر نے تھوک نگلا۔ ذرا سا بدقت مسکرائی۔ "مجھے سعدی یاد آرہا تھا اور میں اس سے چار سال تک تعلق نہ رکھنے پہ گلٹی تھی۔ اب بھی میں بہت بہت گلٹی ہوں فارس!" گلا پھر سے رندھا۔

"وہ مل جائے گا' میں اسے ڈھونڈ لوں گا' یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" پھر گھڑی دیکھی۔ "میں چلتا ہوں' آپ آرام کیجیے گا۔"

"تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو؟" اسے عجیب وقت پہ عجیب سوال یاد آرہے تھے۔

فارس نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔"

اور فارس غازی تو اکثر ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن آج سے پہلے اتنا درد نہیں ہوا تھا۔ زمر نے اثبات میں سرہلایا۔ "کل رات کے لیے شکریہ!"

اس نے محض سر کو خم دیا اور مڑ گیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے ایک دفعہ پھر زمر کو دیکھا تھا۔ (کچھ ہوا ہے اس کے ساتھ۔ کچھ بدل گیا ہے۔) لیکن کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیدار اہل قافلہ ' سونے کے دن گئے
ہشیار' آگ سے ہے جنگل گھرا ہوا

چند گھنٹے مزید گزرے تو وہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی۔ بڑے ابا کے کمرے سے ملحقہ اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا۔ نیچے کشن رکھ کر نیم دراز حنین نظر آرہی تھی۔ وہ ادھر آئی' دروازہ بند کیا اور کاؤچ پہ آبیٹھی۔ دونوں نے خالی ویران نظروں کا تبادلہ کیا۔

"میں نے پین سے وہ فلم مٹا دی ہے' اور اس کو سات مختلف جگہوں اور سی ڈیز میں ڈال کر محفوظ کر دیا ہے۔ آپ کیسی ہیں؟"

"تم کیسی ہو؟"

حنہ نے شانے اچکائے۔ "میں شاکڈ ہوں۔"

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ زمر اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اور حنہ چھت کو۔

"میں شروع میں فارس کو اچھا سمجھتی تھی' مگر پھر میری فیلنگز بدل گئیں۔"

"میں شروع میں ہاشم کو برا سمجھتی تھی' مگر پھر میری فیلنگز بدل گئیں۔"

زمر نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

"میں نے اس پہ بالکل اعتبار نہیں کیا۔"

"میں نے اسی پہ اعتبار کیا۔" حنین چھت کو دیکھتے میکانکی انداز میں بولی تھی۔

"میں نے اس کی کوئی بات نہیں سنی حنہ!"

"میں صرف اسی کو سنتی رہی۔"

"مجھے نہیں پتا تھا وہ ایسا نکلے گا۔"

نہیں پتا تھا وہ ایسا نکلے گا!"

"میں نے اس کا یقین کیوں نہیں کیا حنہ؟"

"میں نے اس کا یقین کیوں کیا' پھپھو؟"

پھر حنین نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف پھیرا اور یاسیت سے اس کو دیکھا جو رات والے ملگجے لباس میں اداس سی کاؤچ پہ ننگے پاؤں بیٹھی تھی۔ ناک کی لونگ کی چمک ماند تھی۔ حنین کو احساس ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا عکس تھیں۔ مرر امیج۔ جو ہو بہو ایک سا ہونے کے باوجود دائیں بائیں سے الٹا ہوتا ہے۔

"فارس ماموں نے کیا کہا' جب آپ نے ان کو بتایا؟"

زمر نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ حنین ایک دم اٹھی۔ سوگ جیسے ٹوٹا۔ "اوہ گاڈ آپ نے ان کو نہیں بتایا؟"

"میں اس کو نہیں بتاؤں گی! کیا مجھے بتانا چاہیے؟"

حنین بالکل چپ ہو گئی۔ "ماموں ہاشم کو گولی مار دیں گے۔ وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرنا جانتے ہیں، لیکن اس ویڈیو سے وہ سمجھ جائیں گے کہ سعدی بھائی کاردارز کے ہی پاس ہے۔ اور۔۔۔"

"اور وہ اس دفعہ صرف ان کو ایکسپوز کرنے یا مالی نقصان پہ بس نہیں کرے گا۔ وہ ان کی جان لے لے گا۔ میں ساری رات سوچتی رہی ہوں حنین۔ یہ ڈاکٹر ایمن یا نیاز بیگ یا جسٹس سکندر نہیں ہے، یہ ہاشم کاردار ہے، فارس کا اس سے تعلق ہے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اور سب خراب ہو جائے گا۔ اس کا دل اسے کنٹرول کرنے لگے گا۔ اور ایسے میں وہ غلطی کر بیٹھے گا۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "سعدی نے مجھ سے کہا تھا، اسے ہاشم پہ شک ہے، میں نے کیوں اس کی بات نہیں سنی؟ میں نے فارس کی زندگی برباد کردی حنہ!"

حنین اس کے قریب آئی۔ اس کے قدموں میں بیٹھے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے۔

"اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے ہر چیز بہترین طریقے سے پلان کی تھی۔ آپ نے اپنی صحت کھوئی تھی، آپ کے ابا کو فالج ہو گیا تھا، آپ اور کیا کرتیں؟"

زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کی بات سننی چاہیے تھی۔"

"آپ نے سنی تھی، پھر اپنی گواہی بھی واپس لے لی تھی۔ آپ نے ان کو جیل نہیں بھیجا۔ یہ سب کرنل خاور اور ہاشم کاردار نے کیا ہے۔ میری طرح خود کو الزام دے کر مایوسی کا شکار مت ہوں۔ مجھے دیکھیں۔"

بے چارگی سے شانے اچکائے۔

"مجھے لگتا تھا میں بہت روؤں گی، مگر میں نہیں روئی۔ میرے اندر کی آگ میرے آنسوؤں کو سکھا چکی ہے۔ مجھے ان سے انتقام لینا ہے۔ کل میں خنجر لے کر ان کے گھر گئی، سوچا جو سامنے آئے اس کو قتل کر دوں گی۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ ہم، یوسف خاندان، ہم ان سے ہر دفعہ کیوں ہار جاتے ہیں؟ کیونکہ ہم یوسف بن کر سوچتے ہیں، ہم کاردار بن کر نہیں سوچتے۔"

"اور سعدی کو واپس لانے کے لیے ہمیں کاردار بن کر سوچنا ہو گا۔" زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ نم آنکھیں رگڑیں۔ "ہم فارس کو ابھی کچھ نہیں بتائیں گے۔ کاردار نے ہمارے ساتھ ناٹک کھیلا اتنے برس۔ اب اداکاری کرنے کی باری ہماری ہے۔"

"اور ہم سے اچھی اداکاری وہ کر نہیں سکتے۔" حنین انگارے ہوتی آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ زمر بھی ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ فارس ماموں کو اتنا تو بتا سکتی ہیں نا کہ آپ کو ان کی بے گناہی پہ یقین ہے؟"

زمر نے گہری سانس لی۔ "حنین میں بہت گلٹی ہوں، مجھے نہیں لگتا میں کبھی دوبارہ لاء پریکٹس کر سکوں گی، میں نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے، لیکن اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں فارس کے قدموں میں گر کر معافی مانگوں گی تو ایسا نہیں ہو گا۔ اگر میں زمر یوسف ہوں تو میں سرنڈر نہیں کر سکتی۔"

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے۔

"پھپھو! ہم کیوں بے وقوف بن گئے؟ ہم تو اتنے جینئس لوگ تھے، اتنے اسمارٹ۔ کاردارز کو پہلے ہی دن سے کیوں نہ پکڑ سکے؟"

"یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا، ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے۔ حنین! آپ جتنے اسمارٹ ہو جائیں، کوئی آپ سے زیادہ اسمارٹ ہوتا ہے، اور کبھی آپ ان سے زیادہ اسمارٹ ہوتے ہیں۔ ہم بے وقوف نہیں تھے۔ ہم صرف انسان تھے۔ ہم خدا نہیں تھے۔ ہم دلوں کے حال نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے اتنے اچھے، اتنے مہذب اور ملنسار سے رشتے دار تھے، رشتے

داروں پہ کون شک کرتا ہے حنہ؟"

"فی الحال ہمیں ان سے زیادہ اسمارٹ ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری کمزوریاں ہیں' تو ان کی بھی ہوں گی۔"

"ہم ان کمزوریوں کو ڈھونڈیں گے اور ہاشم کو ایسی سزا دیں گے کہ دوبارہ وہ کسی کے ساتھ وہ نہ کرسکے جو ہمارے ساتھ کیا۔"

حنین ایک دم اٹھی۔ "چاکلیٹ کھائیں گی؟"

کچھ دیر بعد اس کمرے میں جھانکیں تو حنہ پاؤں لمبے کیے نیچے کشن پہ لیٹی تھی' اور زمر اوپر صوفے پہ لیٹی تھی۔ دونوں اپنی اپنی چاکلیٹ کا ریپر کھول رہی تھیں۔ فرش پہ سنہری گول چاکلیٹس کا یہ بڑا سا ڈبا کھلا تھا۔ اور ارد گرد دس بیس سنہرے ریپر بکھرے تھے۔ آدھا ڈبا ختم ہو چکا تھا۔

زمر نے ایک ریپر توڑ مروڑ کر نیچے اچھالا' اور چاکلیٹ چباتے ہوئے ایک دم ہنسنے لگی۔ "میں واقعی چار سال پہلے ایک ریکارڈڈ کال سے بات کر رہی تھی' اور مجھے لگا' میں فارس کی روح کو قتل جیسے جرم سے بچا رہی ہوں۔"

حنین نے ہنستے ہنستے گردن پیچھے کی ۔۔۔ "اور ہاشم اور اس کی بوٹوکس کی ماری ماں۔۔۔ بائیس مئی کی صبح ہمارے گھر آکر بولے۔۔۔ ہمیں کیوں اطلاع نہیں دی؟ ہاہاہا۔" زمر ہنستی جا رہی تھی۔

"اور ہم نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔"

حنین کے ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اور میں ہاشم کو میسج کرتی رہی' وہ تو سارے میسج بھائی کو پڑھاتا ہو گا' کہ دیکھو' میں تمہاری بہن کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہوں۔"

زمر بھی ہنستی جا رہی تھی۔ "اور ہاشم میرے ہاسپٹل بلز پے کرتا ہے۔ جیسے مجھ پہ احسان کر رہا ہو۔"

حنین کے ہنستے ہنستے بہتے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔

باہر لاؤنج میں سیم منہ بسورے بیٹھا تھا۔ اندر جو چاکلیٹ کا ڈبا کھایا جا رہا تھا وہ وہی تھا جو حنہ نے بہت پیار سے سیم کو برتھ ڈے پہ تحفے میں دیا تھا' اور آج اتنے ہی پیار سے اس کی الماری سے نکال لیا تھا۔ تب ہی فارس اندر داخل ہوا۔ ابا کو سلام کر کے سیم کو پکارا۔

"تمہاری پھپھو اٹھی تھیں؟"

"ہاں' وہ اسٹڈی میں ہے۔ حنین کے ساتھ۔" "تم جلدی آگئے بیٹا۔" ابا کو حیرت ہوئی۔

"زمر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' میں نہیں لے کر جاؤں گا تو وہ چیک اپ کے لیے نہیں جائیں گی۔"

سیم نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ "بالکل ٹھیک ہیں وہ۔ اور وہ کٹو بھی بالکل ٹھیک ہے۔"

فارس نے غور سے اسے دیکھا اور ساتھ آبیٹھا۔

"کیا ہوا؟"

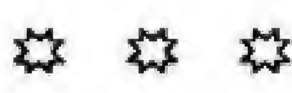
"پھوپھو کے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے۔"

(تمہیں آج پتا چلا ہے؟) مگر صرف سوالیہ ابرو اٹھایا۔

"میری ساری چاکلیٹس لے لیں' اب اندر بیٹھی ہیں' اور ہنستی جا رہی ہیں' میں ایک دفعہ اندر گیا تو وہ کٹو بولی' باہر جاؤ' ہم اس وقت بہت دکھی ہیں۔ یار ماموں' دکھ دکھ میں دونوں میری ساری چاکلیٹس کھا گئی ہیں۔" فارس نے اچنبھے سے بند دروازے کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر دستک دی۔ حنہ نے دروازہ کھولا۔

"جج والی ویڈیو مل گئی ہے ہمیں۔ دیکھیں اور آپ بھی انجوائے کریں۔" مسکراتے ہوئے پین اس کی طرف بڑھایا۔ فارس کی نظریں پیچھے صوفے پہ دراز زمر تک گئیں۔ وہ چاکلیٹ کھولتے ہوئے مسلسل ہنستی جا رہی تھی۔

(استغفراللہ) وہ خفگی سے بڑبڑا کر پین لیے اوپر چلا گیا۔



ہر اک قدم اجل تھا' ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کر کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

یہ چند دن بعد کا قصہ ہے۔ رات ہارون عباد کے گھر بھی ویسی ہی سیاہ اتری تھی۔ ڈائننگ ہال میں لمبی سی

میز کے گرد شاہانہ طرز کی اونچی کرسیاں رکھی تھیں۔ سربراہی کرسی پہ ہارون براجمان تھے، اور دائیں ہاتھ کی طرف بیٹھی جواہرات سے گفتگو کر رہے تھے۔ وہ رات کی مناسبت سے سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ گردن میں سیاہ نگوں اور ہیروں سے جگمگاتے نیکلس پہ انگلی پھیرتی مسکرا کر ہارون کی بات کا جواب دے رہی تھی۔ جواہرات کے دائیں ہاتھ آبدار بیٹھی، سر جھکائے چاولوں میں سست روی سے چمچ چلا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر جواہرات کو بھی دیکھ لیتی۔ ان نگاہوں میں ناراضی تھی، پوزیسو قسم کی ناراضی۔ تبھی آبی کے موبائل پہ پیغام آیا۔ ڈاکٹر نوید کا۔

"آبدار، دو کمپنز مزید آئے ہیں، آپ کی ریکوائرمنٹ کے مطابق ہیں، انٹرویو ارینج کروا دوں؟"

وہ ایک دم خوشی سے "جی شیور" لکھنے لگی۔

"آبی!" دفعتاً "جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "تم اس روز ڈنر پہ نہیں آئیں، ہاشم تمہارا پوچھ رہا تھا۔" آبی فوراً "سنبھل گئی۔ ذرا سا مسکرائی۔

"آپ کو پتا ہے میں پارٹیز، اور ڈنر پہ نہیں آیا کرتی۔ میں ہاشم سے معذرت کرلوں گی۔"

"اتنے سال بعد دوبارہ سے شہر موو کرنا، تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی؟"

آبدار نے شانے اچکائے۔ "مجھے سارے شہر اچھے لگتے ہیں۔ کراچی میں چند سال رہنے سے وہ بھی اچھا لگنے لگ گیا تھا۔"

"ہاشم میری کالز کا جواب نہیں دے رہا جواہرات۔" ہارون نے گلہ کیا۔

"وہ جب سے واپس آیا ہے اپ سیٹ ہے، تم کچھ دن کے لیے میرے بیٹے کو تنگ نہ کرو تو اچھا ہے ہارون۔" اور اس بات پہ فارمل سا قہقہہ بلند ہوا۔ آبی جبراً "مسکرائی اور سر جھکائے منہ میں کچھ بڑبڑائی۔ دفعتاً" نظر سرکے کی بوتل پہ پڑی۔ سرمئی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ احتیاط سے ان کو دیکھا۔ جواہرات ہارون کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اور یہ چانسز کمپنی کا کیا مقصد ہے؟ ہاشم اور تم کن کاموں میں لگے ہو؟"

آبدار نے سرکے کی بوتل اٹھائی۔ بوتل چھوٹی تھی مگر اس پہ کوئی ٹیگ نہیں تھا۔ اس نے اپنے گلاس میں تھوڑا سا ڈالا، پھر۔۔۔ مصروف سے انداز میں جواہرات کے۔۔۔ گلاس میں انڈیلا۔ اسے پورا بھرا۔ وہ دونوں ہنوز ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ قدرے فاصلے پہ کھڑے ملازم نے بے بسی سے آبدار کو دیکھا، مگر آبی کی ایک گھوری اور وہ چپ رہ گیا۔

آبدار نے معصومیت سے بوتل بند کر کے پرے رکھ دی اور بہت سنجیدگی سے کھانا کھانے لگی۔ مگر لبوں پہ مسکراہٹ مسلسل تھی۔

دفعتاً "اجازت طلب کر کے احمر اندر داخل ہوا۔ آبدار نے چونک کر سر اٹھایا، پھر خفگی سے اسے اور پھر ہارون کو دیکھا۔

"بابا، کیا ڈنر ٹیبل پہ بھی کمپنی منیجر کا ہونا ضروری ہے؟"

"احمر کو میں نے ہی بلایا تھا۔ لاؤ پیپرز دو۔" احمر نے مودب سے انداز میں پیپر بڑھایا تو انہوں نے عینک ناک پہ جماتے دستخط کیے۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر احمر کو دیکھا۔

"احمر شفیع۔۔۔ تمہیں ہارون کے لیے میں نے ریکمنڈ کیا تھا۔ امید ہے تم نے ان کو مایوس نہیں کیا ہو گا۔"

احمر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیا، گویا شکریہ ادا کیا۔ پھر ڈیوٹی پہ کھڑی فلپینو میڈ کو مخاطب کیا۔

"سوزین پلیز مسز کاردار کا واٹر گلاس اٹھالو، اس پہ ڈسٹ ہے۔ گلاس بدل کر لاؤ۔"

آبدار نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ وہ سوزین کا انتظار کیے بغیر خود ہی گلاس اٹھا کر اسے پکڑانے لگا۔ آبی کی آنکھوں میں تلملاہٹ ابھری۔ احمر اسے دیکھے بغیر، کاغذ لیے واپس پلٹ گیا۔ وہ معذرت کر کے پیچھے آئی۔

"سنو احمر شفیع!" لان میں تیزی سی چلتی آئی اور ناراضی سے اسے پکارا۔ احمر تسلی سے مڑا۔ "جی؟"

"میرے ملازموں کی ہمت بھی نہیں ہے کہ میری ڈائیننگ ٹیبل پہ مداخلت کریں' تو آپ کو کس نے اجازت دی کراکری ہٹانے کی؟"

"مس عبید' ہم دونوں کو پتا ہے آپ نے کیا کیا ہے۔ ایک کڑوا گھونٹ پی کر' ذرا سا کھانس کر' مسز کاردار یہاں آنا ترک نہیں کریں گی۔ اگر کچھ خراب ہوگا تو آپ کا اور آپ کے والد کا رشتہ۔"

وہ منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"مجھے فارسی میں گالیاں ذرا اونچی دیا کریں تاکہ میری سمجھ میں آئیں۔"

"تمہارے دوست کی جگہ تمہارا مرڈر ہونا چاہیے تھا۔" آبدار نے اس کی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ آج پھر وہ کسی "سیو سعدی" واک سے واپس آیا تھا۔

"نوازش لیکن وہ صرف مسنگ ہے۔ امید ہے کہ زندہ ہوگا۔"

وہ جو خفگی سے اندر جانے لگی تھی رکی۔

"تو تاوان نہیں مانگا کسی نے؟"

"نہیں۔ مگر وہ نیسکام کا سائنس دان تھا' تھرکول میں کام کرتا تھا' ایسا بندہ بذات خود بہت قیمتی ہوتا ہے' تو یقیناً" اس کو مقید رکھ کر اس سے قیمتی معلومات نکلوائی جارہی ہوں گی۔ خیر' یہ صرف ایک تھیوری ہے۔" اور آبدار عبید' جو احمر شفیع پر فاتحہ پڑھ کر جانے لگی تھی' اور محض انسانی ہمدردی کے لیے چند سوال پوچھ لیے تھے' ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم کہہ رہے ہو کہ وہ تھرکول کا سائنس دان تھا' اور... اسے کسی نے کہیں چھپا رکھا ہے؟" دل زور سے دھڑکا۔

"ہوں۔ اوکے۔ میں آفس جارہا ہوں۔ آپ ڈنر مکمل کریں۔"

اور آبدار عبید وہیں گم صم کھڑی رہی۔ ایک لمحے نے اسے قید کرلیا تھا۔

وہ الہام کا لمحہ تھا۔

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے

یہ غم سحر کا یقین بنا ہے

اس رات انیکسی کے تہہ خانے کی ساری بتیاں جلی تھیں' اور اس چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ فارس اور حنہ کرسی پہ بیٹھے تھے' جبکہ زمر میز سے ٹیک لگائے کھڑی حنین کو بتارہی تھی کہ کس طرح انہوں نے پچھلے ساڑھے تین ماہ میں اس گن کے تمام خریداروں کا پتا کیا۔ مگر بے سود۔ جائے وقوعہ کے آگے پیچھے سی سی ٹی وی کیمرے چیک کروائے' مگر ہر جگہ سے ریکارڈنگ صاف ملتی۔ ایمبولینسز' ایئر ایمبولینس' پرائیوٹ ڈاکٹرز' سعدی کے ہر ممکنہ دوست' ایک ایک سے ملے۔ وہ بتائے جارہی تھی اور حنین سن رہی تھی۔

(کیا جنگ میں جانے والے اور پیچھے بیٹھے رہ جانے والے برابر ہوسکتے ہیں؟)

جب وہ خود کو ہاشم میں مصروف رکھ رہی تھی تو یہاں کوئی راتوں کو جاگ جاگ کر ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہاشم' اف!" اس نے سر جھٹکا۔ وہ کوئی ٹین ایج کرش نہ تھا کہ حقیقت معلوم ہونے پہ دل سے نکل جاتا اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگتی۔ وہ تو مرضِ عشق تھا اور آج بھی پہلے کی طرح جان لیوا تھا۔

فارس دیوار پہ لگی جج کی تصویر دیکھ رہا تھا جب حنہ نے پکارا۔

"آپ کو ہسپتال یوں جلانا نہیں چاہیے تھا۔"

فارس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"آپ کو ان دونوں میاں بیوی کو اندر لاک کرکے ہسپتال جلانا چاہیے تھا۔"

وہ ہلکا سا ہنسا۔ بہت دن بعد۔ شاید بہت سالوں بعد اس نے حنہ کو واپس موڈ میں دیکھا تھا۔ پھر آگے ہو کر لیپ ٹاپ کی اسکرین اس کے سامنے کی۔ اسے کام سمجھایا۔

"تم یہ کرلوگی؟ شیور؟"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں!"

زمر کافی بنانے جارہی تھی' آج پوری رات جاگ

کر ہر چیز فائنل کرنی تھی۔ جاتے جاتے رکی۔ "حنہ! تمہارے لیے کریم ڈالوں؟"

"جی۔ بالکل۔" حنہ نے مسکرا کر کہا۔ زمر بھی مسکرا کر سرہلاتی چلی گئی۔ فارس نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی' دوسری حنین پہ۔ پھر ٹائپ کرتے ہوئے سرسری سا تبصرہ کیا۔

"کسی کی بڑی دوستی ہو گئی ہے۔"

حنین نے چونک کر اسے دیکھا' پھر چمک کر بولی۔

"کسی کو بڑی جلن ہو رہی ہے۔"

"واٹ ایور!" اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

حنین مسکرا کر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ صد شکر کہ دل کی حالتیں راز ہی رہتی ہیں' ورنہ بہت سے لوگ مشکل میں پڑ جاتے۔۔۔

اوپر زمر کچن میں کھڑی کافی بناتے ہوئے ندرت سے معمول کی باتیں کر رہی تھی۔ کھڑکی سے قصر کی پشت اور ہاشم کی بالکونی دکھائی دیتی تھی۔ زمر نے رخ بالکل موڑ لیا۔ کم از کم اگلے کچھ دن تک وہ ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی ورنہ خود پہ قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ابھی خود کو تیار کرنا تھا۔ مضبوط کرنا تھا۔ ایک لمبی اداکاری کے لیے۔



ہر اک سیہ شاخ کی کمان سے' جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

وہ ہفتے بعد جب ستمبر دم توڑ رہا تھا' اور حبس اور گرمی کافی حد تک کم ہو چکی تھی' انیکسی پہ شام پھیلی تھی۔ فارس اپنے کمرے کے باتھ روم آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے' وہ ریزر سے آہستہ آہستہ شیونگ کریم صاف کر رہا تھا۔ ایک جگہ ہلکا سا کٹ لگا تو وہ رکا۔ انگلی سے خون کی ننھی بوند کو چھو کر دیکھا۔ آنکھوں میں وہی سرد مہری تپش تھی۔

"میں نے تمہیں اپنے چیمبر میں صرف اس لیے بلایا ہے فارس غازی! تاکہ تم وہاں تماشا نہ کرو۔" وہ میز کے سامنے ہتھکڑی میں کھڑا تھا اور میز کے پیچھے کھڑے جج کپ میں ٹی بیگ گھولتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اب کہو جو تم نے کہنا ہے' اور پھر خاموشی سے غائب ہو جاؤ۔"

فارس نے بلیڈ رکھا اور ٹونٹی کھولی۔ جھک کر ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھرا اور چہرے پہ ڈالا۔ ٹھنڈا پانی چہرے کو دھوتا' کچھ چھینٹے آئینے پہ بھی گراتا گیا۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ بے گناہ ہوں' یہ فیصلہ میرا کیس سننے کے بعد آپ کو کرنا ہے' صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرا کیس سنا جائے۔ ہر چودھویں دن کسی قربانی کے جانور کی طرح مجھے کورٹ لا کر ریمانڈ میں توسیع کر دی جاتی ہے۔ چھ چھ مہینے تک سماعتیں نہیں ہوتیں۔"

ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو میز پہ رکھے' وہ بے بسی بھرے غصے سے کہہ رہا تھا۔ "تاریخ ملے تو پراسیکیوٹر نہیں آتا' کبھی جج غائب ہوتا ہے' کبھی ہڑتال ہو جاتی ہے۔ میں دو سال سے چودہ' چودہ دن کی امید پہ جیل میں معلق ہوں۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے باہر نہیں لانا چاہتا' پھر بھی' میں تم سب کو ایک موقع دیتا ہوں۔۔۔" ان کی آنکھوں میں دیکھ کر توڑ توڑ کر الفاظ ادا کیے۔ "میرا۔۔۔ کیس۔۔۔ سنا جائے۔ ہر ہفتے سنا جائے۔ غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی نہ کیا جائے۔ جج صاحب"

وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے' سوچ میں گم ڈریس شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ تین۔۔۔ دو ایک اوپری بٹن کو کاج میں مقید کرتے' اس کی آنکھوں میں وہی سرد سی آگ تھی۔

جج صاحب نے اپنی کرسی پہ بیٹھے۔ رعونت سے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا' پھر کپ رکھ کر آگے ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اگلی دفعہ اگر مجھے پکارنے کی غلطی کرنا' تو مجھے یور آنر' کہنا۔ سنا تم نے! یور آنر۔ کیونکہ میں۔۔۔ ایک عزت مآب عدالت کا آنریبل جج ہوں۔" سینے پہ انگلی رکھ کر تکبر سے کہا۔ "میں ایک مین آف آنر ہوں۔ اگر تم سے بات کر رہا ہوں تو اس کو اپنی خوش قسمتی

سمجھو۔ یور آنر' سنا تم نے؟ میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔ ایک دن میں عدالت عظمیٰ کا چیف جسٹس ہوں گا۔ اور تم جیسے آنر کلرز تب بھی جیل میں سڑ رہے ہو گے۔ تم مجھ پہ رشوت کا کیا الزام لگاؤ گے' پیسہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں فارس غازی' میں جسٹس سکندر حسین ہوں۔ میں اپنے آنر کے لیے جیتا ہوں۔"

وہ اب کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ گرے کوٹ پہنتے ہوئے اس نے اپنے عکس کو دیکھتے کالر درست کیے۔ پھر پرفیوم کی شیشی اٹھا کر اپنی گردن پہ اسپرے کیا۔ لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں۔ خوشبو سی ہر جگہ پھیل گئی۔

("تو تم پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو کہ میں مجرم ہوں۔ اب میری بات سنو۔" ہتھکڑیوں والے ہاتھ میز پر رکھے' وہ کھڑے کھڑے جج کی طرح جھکا اور ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں پتا ہے کون ہوں؟ میرے پاس دو گنز کیوں ہوتی ہیں؟ کیونکہ میں... ایک... شکاری ہوں۔ اور میں قبر تک اپنے شکار کا پیچھا کرتا ہوں۔ اس لیے یور آنر' تمہیں میں اس کیس سے دست بردار ہونے کے لیے تو کہوں گا ہی' لیکن ایک بات اپنے مالکوں کو بھی بتا دینا۔" بنا پلک جھپکے اس کو دیکھتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔ "انہیں کہنا کہ ایک دن فارس غازی باہر ضرور آئے گا اور اس دن... فارس غازی ہو گا' جج بھی... جیوری بھی... اور جلاد بھی!" پھر سر کو خم دیا۔ "یور آنر!"

"فارس!" وہ مسکرائے۔ "جس دن میں سپریم کورٹ کے جسٹس کا حلف اٹھا رہا ہوں گا' اس دن بھی تم جیل میں سڑ رہے ہو گے۔")

اس نے آنکھیں کھولیں۔ (اس واقعے کے ایک دن بعد اس نے جج کو کیس سے دست بردار ہونے کی درخواست دے دی تھی' جج ہٹ بھی گیا لیکن سعدی کے ہاتھ ویڈیو لگ جانے کے بعد... سعدی نے سارا کھیل ترتیب دیا اور وہی جج دوبارہ اس کیس کی سماعت کرنے لگا۔)

فارس نے آہستہ سے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ عکس میں اپنے پیچھے زمر کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس کی شرٹ کے کالر کو دیکھ رہی تھی۔

"تم ٹائی کیوں نہیں پہنتے؟" فارس نے چہرہ موڑ کر ان ہی سرد پتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ ٹائی مجھے پھانسی کے پھندے کی طرح لگتی ہے۔"

اور فارس غازی تو ایسی باتیں کیا کرتا تھا' لیکن آج سے پہلے اتنا درد... زمر نے نگاہیں چراتے سر جھٹکا۔ وہ سیاہ ڈریس میں بال ہاف باندھے تیار کھڑی تھی۔

"تم تیار ہو؟"

"پوری طرح!" وہ کہتے ہوئے چابیاں اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔



صبح کے تخت نشین شام کے مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا!

ہال میں وسیع پیمانے پہ ڈنر ٹیبلز لگی تھیں۔ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے ممبرز' ججز' سینئر وکلا پراسیکیوٹرز' سب شامل تھے۔ ایک بھورے سوٹ والا شخص جو وکیل نہیں تھا' مگر جس طرح آگے پیچھے ہدایات دے رہا تھا' اس سے صاف ظاہر تھا کہ جو ڈنر بظاہر جسٹس سکندر کی طرف سے "ہائیکورٹ کا جج مقرر ہونے کی خوشی" میں دیا گیا ہے' اس کی فنڈنگ کرنے والا یہی امیر آدمی ہے۔

ایک میز پہ زمر یوسف کھڑی تھی۔ سیاہ لباس' اور ہلکی جیولری کے ساتھ' مسکراتے ہوئے وہ جسٹس سکندر کو مبارک باد دے رہی تھی۔

"آپ آج کل نہیں نظر آرہیں۔" سعدی والی تلخی بھلائے (کہ یہ تو کچہری کا روز کا معمول تھا) وہ مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

"جاب ختم ہونے کے بعد کچھ ماہ پرائیوٹ پریکٹس کی تھی۔ کچھ دن سے وہ بھی چھوڑ دی ہے۔ آج کل ہاؤس وائف ہوں۔" مسکرا کر ساتھ' سوٹ میں ملبوس

ہینڈسم سے فارس کی طرف اشارہ کیا تو جسٹس صاحب اس کی طرف مڑے۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

"معلوم پڑتا ہے کہ شکاری نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔ گڈ!" مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فارس کھلے دل سے مسکرایا۔ بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔

"کر تو چکا ہوں، لیکن انسان اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔" جسٹس صاحب کی آنکھوں میں دیکھ کر اضافہ کیا۔ "یور آنر!"

"گڈ گڈ!" انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔ "ہماری دعوت قبول کرنے کا شکریہ۔ خوشی ہوئی تم سے دوبارہ مل کر۔"

"مجھ سے زیادہ نہیں ہوئی ہوگی۔ اور بہت مبارک ہو آپ کو یور آنر۔ آپ کو وہ سب ملنے جا رہا ہے جس کے آپ مستحق ہیں۔"

جج صاحب نے سر کے خم سے شکریہ وصول کیا۔ فخر سے ارد گرد پھیلی تقریب، اس عزت اور وقار کو دیکھا جو ہر ایک کی آنکھوں میں ان کے لیے تھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا، شکاری۔ ایک دن ہم سپریم کورٹ بار میں ملیں گے۔" فارس ہلکا سا ہنس دیا۔

"اور ہاں تمہارے بھانجے کا افسوس ہوا۔ لگتا ہے اس نے اپنے قد سے بڑے دشمن بنا لیے تھے مگر تم اپنا خیال کرنا۔"

کالر جھاڑے اور آگے بڑھ گئے۔ ان سے ہاتھ ملانے کے لیے بہت سے لوگ منتظر تھے۔ طویل میز کے گرد بیٹھے افراد اب اٹھ اٹھ کر بوفے ٹیبل کی جا رہے تھے۔

زمر اپنی جگہ سے اٹھی۔ چند وکلا حد ساعت میں بیٹھے تھے، شائستگی سے فارس کو مخاطب کیا۔

"آپ کو کچھ لا دوں۔"

"میں آ رہا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ اٹھا۔ وکلا برادری کو یاد تھا کہ وہ مرڈر ٹرائل کے تحت چار سال جیل میں رہا ہے، یہ بھی یاد تھا کہ زمر نے اس کے خلاف گواہی دی تھی، اور اکثریت کو اس کے گناہگار ہونے کا یقین بھی تھا، لیکن مقدمے، جیل، پیشیاں یہ اس کمیونٹی میں اتنا عام تھا، خود ہر ایک پہ اتنے کیسز تھے اور اتنے کیسز میں انہوں نے ایک دوسرے کو پھنسا رکھا تھا کہ عام لوگوں کی نسبت ان کو اس بات سے فرق کم پڑتا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بوفے ٹیبل تک گئے۔ فارس نے جھک کر اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

"مجھے آپ نہ کہا کریں، میں صداقت تھوڑی ہوں؟"

زمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ نہیں مسکرائی، چپ چاپ کھانا ڈالنے لگی۔ وہ ڈل لگ رہی تھی۔

دفعتاً "ایک ویٹر وہاں سے گزرا اور ریموٹ اٹھائے" اس نے باری باری ریسٹورنٹ میں لگے ہر ٹی وی اسکرین کا چینل بدلا۔ ایک مخصوص چینل سیٹ کیا۔ اور آواز اونچی کر دی۔ پھر سر جھکائے فارس کے قریب سے گزرنے لگا تھا تو فارس نے اس کی جیب میں لپٹے ہوئے نوٹ رکھے، اور کندھے کو ہلکا سا تھپکا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ فارس نے نظر اٹھا کر سی سی ٹی وی کیمرے کو دیکھا، جس کا رخ اس طرف نہیں تھا اور مسکرایا۔

(آج کی شام یور آنر کے نام!)

وہ دونوں واپس طویل میز پہ آ بیٹھے تو جسٹس سکندر ان کے سامنے، مگر چند کرسیاں چھوڑ کر بیٹھے تھے۔ وقار سے کھڑی گردن اور فخر سے اٹھے کندھوں کے ساتھ وہ کہہ رہے تھے۔

"میں آپ کو بتاؤں جسٹس اسید، ایسے موقعے ہر شخص کے کیریئر میں آتے ہیں، لیکن حلال کا ایک لقمہ جو آپ اپنی اولاد کے حلق سے گزارتے ہیں اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔"

وہ کہہ رہے تھے اور باقی افراد نے ہر شے جاننے کے باوجود بھی سر دھنا۔

"وہ کہتے ہیں نا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہوتا ہے....."

"شیر کا ایک دن!" فارس نے مسکراتے ہوئے

گلاس لبوں سے لگایا۔ جسٹس صاحب اپنا فقرہ پورا نہیں کرسکے کیونکہ زمر نے کانٹا زور سے پلیٹ میں گرایا تھا۔

"اوہ گاڈ!" چہرہ موڑے وہ اتنا اونچا بولی کہ چند لوگ اسے دیکھنے لگے' پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ٹی وی اسکرین کو دیکھا اور.....

ریسٹورنٹ کے اس ہال میں تین ٹی وی اسکرینز نصب تھیں۔ یہ بڑی بڑی صاف اور واضح اسکرینز۔ اور سب لوگ اب مڑمڑ کر ان پہ چلتی نیوز دیکھ رہے تھے۔ نیوز کاسٹر حسب معمول حلق پھاڑ کر اونچا اونچا کہہ رہی تھی۔

"یہ ویڈیو کچھ دیر پہلے انٹرنیٹ پہ پوسٹ ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی وائرل ہو گئی ہے۔ ہم آپ کو ایک دفعہ پھر بتاتے چلیں کہ ویڈیو میں موجود سیاہ کوٹ والے شخص کی شناخت ہائیکورٹ جج جناب جسٹس سکندر حسین شاہ کے نام سے ہوئی اور....."

ریسٹورنٹ میں سناٹا چھا گیا تھا' جسٹس سکندر ہاتھ میں گلاس پکڑے سن سے گردن اٹھائے وہ ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ ایچ ڈی کوالٹی کی صاف اور واضح ویڈیو۔ جس میں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے ایک کرسی پہ اوسی پی صاحب نظر آرہے تھے' اور تیز تیز کاغذ پہ کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے سر پہ جسٹس صاحب کھڑے تھے اور غصے سے کچھ کہہ رہے تھے' آواز ٹھیک سے نہیں آرہی تھی' مگر آواز کی ضرورت بھی نہ تھی' کیونکہ جیسے ہی اوسی پی نے کاغذ اور قلم رکھا' جج نے جواب اس کے سر کے پیچھے کھڑے تھے اور کیمرے میں بہت واضح نظر آرہے تھے' ایک دم اوسی پی کی گردن میں بازو ڈال کر ان کو جکڑا اور اس سے پہلے کہ وہ ان کا ہاتھ ہٹا پاتے' جج نے ایک سرنج اس کے کندھے میں گھیڑی۔ اوسی پی مزاحمت کر رہے تھے' ان کا بازو ہٹاتے' ہاتھ پاؤں مار رہے تھے' لیکن پھر..... ان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ جج نے سرنج جیب میں ڈالی' کالر جھٹکے۔ اوسی پی کا سر کاغذ پہ رکھا' بازو درست کیے۔ جیسے وہ لکھتے لکھتے سو گئے ہوں' اور جانے کے لیے مڑ گئے۔ یہ ایک طویل ویڈیو میں سے کاٹا ہوا ایک ننھا سا کلپ تھا جس کی قیمت سعدی یوسف نے فارس غازی کی بریت لگائی تھی۔ اب وہی کلپ ریسٹورنٹ میں ایک قومی ٹی وی چینل پہ چل رہا تھا اور جسٹس سکندر کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

پھر لوگ مڑمڑ کر ان کو دیکھنے لگے۔ حیرت' شاک' اور ایکسائٹمنٹ سے۔ ان کا الٹا رکھا موبائل مسلسل وائبریٹ ہونے لگا۔ ڈنر کے فنڈر نے جلدی سے ویٹر کو اشارہ کیا' وہ اب اس سے پچھلے دروازے کا پوچھ رہا تھا۔ جسٹس سکندر ایک دم اٹھے۔ کسی سے بھی نگاہ ملائے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ دو گلا ان کے ساتھ لپکے۔

فارس غازی نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ گلاس سے مزید ایک گھونٹ بھرا اور دلچسپی سے اردگرد پھیلی افراتفری دیکھی.....

جسٹس سکندر نے بیرونی دروازے سے باہر قدم رکھا' تو نیچے سڑک پہ رپورٹرز تھے۔ ان کے کیمرے فلیش کی چمکتی لائٹس۔ مائیکس کی قطار۔ پریشان حال منیجر کہہ رہا تھا۔ "سر ہمیں نہیں معلوم ان کو کس نے ادھر بلایا ہے لیکن....."

اندر ٹیک لگائے بیٹھے فارس نے گلاس سے آخری گھونٹ بھرا۔ اس کے لبوں پہ سرد سی مسکراہٹ ہنوز جمی تھی۔

جسٹس سکندر کو کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ سر جھکائے' زینہ اتر رہے تھے۔ (اے ایس پی' آج رات ایک لڑکے کو غائب کرنا ہے۔ ہسپتال کا نام بھیج رہا ہوں' مگر پہلے اس کا آپریشن ہونے دو۔ ڈاکٹر توقیر بخاری کو بھی ادھر بلالو۔ لڑکے کو زندہ سلامت نکالنا ہے۔)

گارڈز میڈیا کے نمائندوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یکے بعد دیگرے مائیک ان کے چہرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"کیا آپ اس ویڈیو کی تصدیق کرتے ہیں؟"

"کیا انٹرمیڈیٹ بورڈ کے آفیسر کا نفیڈینشل پرلیس

کی جان لینے والے آپ ہی تھے۔"

(میرے بس میں ہوتا تو اس لڑکے کو وہیں ختم کروا دیتا۔ لیکن دوستوں کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ ارے نہیں، فکر مت کرو، کسی کو علم نہیں ہو گا۔ ہو بھی جائے تو وہ متوسط طبقے کے معمولی لوگ ہیں، ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ جانے دو ایسے ایس پی بہت دیکھے ہیں فارس غازی جیسے!)

وہ چہرہ جھکائے، اپنے ساتھیوں کی معیت میں ہجوم سے نکل رہے تھے۔ ساتھی وکلا اور گارڈز بمشکل رپورٹرز کے درمیان سے راستہ بنا پا رہے تھے۔

ریسٹورنٹ میں کھانا بھول کر چہ مگوئیاں اور پھر ڈسکشن شروع ہو چکی تھی۔ ٹی وی کی آواز اونچی کر دی گئی تھی۔ ڈنر کے فنڈر کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ اس کے ہائیکورٹ میں تیرہ کیسز پھنسے تھے، اور ان کو چند منٹ پہلے تک پہیے لگ جانے تھے، مگر اب...؟

باہر جسٹس صاحب کی کار روانہ ہوئی اور ذرا طوفان تھما، تو وہ دونوں بھی نکل آئے۔ پارکنگ ایریا تک جاتے ہوئے فارس کہہ رہا تھا۔

"اسٹیفنی کے مطابق، سعدی نے جج کو کہہ رکھا تھا کہ یہ ویڈیو اس کے لائر کے پاس ہے اور اسے کچھ ہونے کی صورت میں، وہ اس کو انٹرنیٹ پہ ڈال دے سن رہی ہوں۔ اس طرح ہم ان سب لوگوں تک پہنچ گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جج کو اس اسکینڈل سے نکالنے کے لیے کون آتا ہے؟" وہ محظوظ سا کہتا کار کا لاک کھول رہا تھا۔ زمر دوسری طرف خاموش کھڑی تھی۔

"جج ایک مہرہ نہیں تھا، وہ ان لوگوں کا دوست ہے، سو اس کے دوست اس کو بچانے ضرور آئیں گے۔ کوئی سیاستدانوں میں سے، کوئی وکلا برادری سے، کوئی بزنس کمیونٹی سے اور کوئی قانون نافذ کرنے والے اداروں سے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ کون کون اس کو بچانے آتا ہے۔ وہ لوگ اب بوکھلا چکے ہوں گے اور وہ غلطیاں کریں گے۔ زمر میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔" لاک میں چابی روک کر اس نے اسے پکارا۔

زمر نے چونک کر سر اٹھایا، پھر گردن ہلائی۔ "ہوں میں جائیں گے۔"

فارس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "ہم سعدی تک پہنچنے کے اتنا قریب ہیں۔" انگلی اور انگوٹھے سے ایک انچ کا فاصلہ دکھایا۔ "مگر آپ اتنی ڈل اور بجھی بجھی کیوں لگ رہی ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"کچھ تو ہوا ہے۔ ورنہ کل رات تک آپ بہت ایکسائٹڈ اور خوش تھیں۔" پھر یاد آیا۔ "صبح آپ اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔ کیا کہا اس نے؟"

زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ (مسز زمر) ذہن میں ڈاکٹر قاسم کے الفاظ گونجے۔ "میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔")

"ہاں میں گئی تھی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(جس عطیہ شدہ گردے پہ آپ سروائیو کر رہی ہیں، وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔)

"مگر فارس... ڈاکٹر صاحب تھے ہی نہیں۔ میں انتظار کر کے واپس آ گئی۔" وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ دل ہنوز زور زور سے دھڑک رہا تھا، مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)




"زیب آپا جیسی عقل و شعور تو سارے جہاں میں نہ ملے۔"

مہو خالہ کی قصیدہ گوئی نے میرے دل میں شگوفے کھلا دیے تھے۔ اگرچہ وہ میری تعریف نہیں کر رہی تھیں مگر جن کا ذکرِ خیر فرما رہی تھیں وہ میری جنت اپنی ایڑی کے نیچے رکھتی تھیں۔

میری اماں۔ ماں نامی خزانہ تو ہر فردِ جہاں کی ملکیت ہے۔ ماں وہ سونا، جس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اندیشہ نہیں۔

"ترانۂ ماں بیان کرے تو زبان رابعہ سے لعل و جواہر جھڑیں۔"

تابعہ آپی نے میرے جذب کو اپنے مخصوص انداز سے ہوا دی تھی۔ میں ماما کے ذکر میں ہمیشہ سے خود کفیل رہی تھی اور خوش قسمتی سے مجھے بیان لائق اوصاف بھی کثیر تعداد میں میسر تھے۔

"کہاں سے شروع کروں؟"

ہم دونوں بہنوں کی اعلا تعلیم و تربیت کی مثال سارا خاندان دیتا تھا، اماں کی کفایت شعاری اور سلیقہ شعاری کا شاہکار ہمارا پیارا سا گھر، شاید ہی کوئی زبان تھی جو ہمارے آشیانے کی تعریف میں رطب اللسان نہ ہو۔ میری فرینڈز آرکیٹیکچر کا پتا پوچھتی تو میں انہیں اپنی اماں کی گلی کا رستہ بتاتی تھی، ظاہر ہے۔ اس آشیاں کی ایک ایک اینٹ میری اماں کی مہارت اور قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس آشیانے میں اماں

فریدہ فرید



نے دنیا کی ہر آسائش مہیا کی تھی۔ اباجی نے کمایا تھا اور اماں نے احتیاط سے لگایا تھا۔ یہی نہیں میری ماں نے اباجی کو مالی معاونت بھی مہیا کی تھی۔ اماں کے اپنے ہاتھ کی مہارت نے ان کے بوتیک کو دلکش و منفرد پیراہن کا نمونہ بنا دیا تھا جو زندگی کی گاڑی کو دوڑانے میں اچھا خاصا ایندھن فراہم کرتی تھی۔

"رابعہ واپس آجاؤ کھانا مزید انتظار نہیں کر سکتا۔"

تابعہ آپی نے ایک بار پھر مجھے حال میں حاضر باش کیا تھا۔ میں جھٹ سے ڈائننگ ٹیبل پر چڑھ دوڑی اور جو آنکھوں نے دیکھا اور معدے نے سمیٹا' کیا کہوں اس کے لیے "طعام لذیذ!"

یہ کلمہ اب میری مجبوری ہی بن گیا تھا۔ ہر چیز ہوتی اتنی مزے کی تھی کہ کہے بنا رہا نہیں جاتا تھا مگر میں ہر بات کا کریڈٹ پورا اپنی ماں کو نہیں دوں گی کیونکہ سکھایا ہوا تو یقیناً" انہی کا تھا مگر پکایا ہوا میری پیاری آپی تابعہ کا تھا' میرا تو کھلا چیلنج تھا تابعہ آپی جیسا کوئی پکا کے دکھائے۔

مہو خالہ' میری اماں کی سب سے بڑی بہن بھی اس بات سے انکار نہیں کر پاتی تھیں اور کرتیں بھی کیسے؟ اگر وہ اپنی آپا کی تعریف میں رطب اللسان رہتی تھیں تو اپنی تابعہ آپی کو سپورٹ کرنا مجھے بھی آتا تھا۔ اور مہو خالہ کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مدمقابل میں تنہا نہیں ہوتی تھی۔ اپنے ذوقی بھیا بھی تھے ناں' مہو خالہ کے سپوت واحد......

☼ ☼ ☼

"رابعہ بیٹا آپ فیس کے پیسے نہیں لائیں؟"

راحت میم نے قدرے جھجک کے دریافت کیا تھا۔

مجھے ندامت نے آن گھیرا' مہینہ شروع ہوئے دس دن گزر گئے تھے۔ راحت جی کو طلب کرنے کی عادت نہیں تھی مگر میرے اتنے دن کی لاپروائی نے آج انہیں کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وصف خودداری بھی عجب ہے' اپنی ہی محنت کا صلہ طلب کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ پورے مہینے مجھے تمام سبجیکٹس کی تیاری کرانے کے بعد دس ہزار کا انعام بھی میں اکثر یاددہانی پر ہی ادا کرتی تھی' وجہ صرف میری کمزور یادداشت تھی ورنہ میری ماں اور کسی کا حق ادا کرنے میں دیر کرے' ممکن ہی نہیں تھا۔

راحت میم ہمارے محلے میں رہائش پذیر تھیں۔ اباجی سے دور پرے کی رشتے داری بھی نکلتی تھی اس لیے اماں نے مجھے ان کے پاس ٹیوشن کے لیے بھیج دیا تھا۔ راحت میم کے شوہر اور اباجی ایک ہی فرم میں جاب کرتے تھے۔ اماں کی طرح راحت جی بھی ٹیچنگ اور کوچنگ کے ذریعے اپنے میاں کی سپورٹر تھیں۔ ہماری طرح راحت میم کی فیملی بھی چار نفوس پر مشتمل تھی۔ دو رحمتیں ان کے گھر دو ہمارے۔ اس کے باوجود دونوں گھروں میں مالی اعتبار سے بہت فرق تھا۔ سب سے بڑے فرق کا گواہ تو ہمارا آشیانہ تھا۔ راحت میم ہنوز کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھیں جس کے ہر ماہ کے کرائے پر ان کی اپنی ذاتی آمدنی صرف ہو جاتی تھی۔ دونوں بیٹیوں کی شادیاں ایک طرف' ان کے تعلیمی اخراجات پورے کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے ان کی بچیاں تابعہ آپی اور میری ہم عمر ہونے کے باوجود تعلیمی قابلیت میں ہم سے بہت پیچھے تھیں۔

اب اس فرق کی وجہ یقیناً" وہ کمال گرہستی تھی جو میری ماں تھی۔ ایک جیسے حالات و روزگار میسر آنے کے باوجود میری اماں نے نہ صرف اپنے ہاتھوں آشیانہ تعمیر کیا تھا بلکہ ہم دونوں بہنوں کی اعلا سے اعلا تعلیمی و انتظامی تربیت کی تھی اور سب سے بڑی بات میری اماں کی وہ خوبی جس کا چرچا ہر جانے انجانے کی زبان پر تھا' میری اماں نے ہم دونوں کے آئندہ مستقبل کے معاملات کے لیے نہ صرف نقد پس انداز کیا تھا بلکہ تقریباً" جہیز کے نام پر وہ مکمل تیاری کر چکی تھیں۔ بس اب تو صرف وقت آنے کی دیر تھی۔

☼ ☼ ☼

"رابعہ بیٹا' کمیٹی کے بارے میں کیا خبر ہے؟ اس ماہ

کس کے نام قرعہ نکلا ہے۔" حسب معمول مجھے مدحت ماں سے واپس لانے کے لیے راحت جی کو بھی آپی والا طریقہ اپنانا پڑا اور مجھے ہلا کے مخاطب کرنا پڑا۔

"اس ماہ کی کمیٹی تو شاید شمع آنٹی اور آپ دونوں میں ٹائی تھا(Tie) تھایا آپ کو ملے گی یا انہیں۔ وہ کل اماں سے ضد کر رہی تھیں کہ انہیں فوری چاہیے۔ شاید کچھ ضرورت ہے۔"

میں نے تفصیلاً" جواب دیا تھا کیونکہ اماں کے پاس ہی کمیٹی کا چارج تھا اور شمع آنٹی تو پچھلے دو ماہ سے کمیٹی کی سب سے زیادہ طلبگار تھیں مگر پچھلے ماہ تو اماں کے نام قرعہ نکلا تھا اور اس ماہ راحت میم کے اور میں جانتی تھی کہ راحت میم کا فریج اور ٹی وی دونوں خراب تھے اور ٹھیک ہونے کے لیے کمیٹی نکلنے کے منتظر تھے۔

"ٹھیک ہے بیٹا ہم زیب آپا سے کہنا وہ اس ماہ کمیٹی شمع کو دے دیں۔ اس کی بیٹی کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہونا ہے کہیں رہ نہ جائے میں اگلے ماہ لے لوں گی۔"

راحت میم کا جواب میری توقع کے خلاف تھا۔ اتنے مسائل کے ہجوم میں اور روپوں کی اشد ضرورت کے باوجود وہ ایسا فیصلہ کیسے کر سکتی تھیں؟ خیر! مجھے کیا، میں پڑھائی مکمل کر کے لوٹ آئی۔



آج گھر میں بڑی رونق تھی اور اس سے بھی زیادہ تابعہ آپی کے چہرے کی چمک دیکھنے لائق تھی۔ ذوقی بھیا جو تشریف فرما تھے۔ مہو خالہ اپنی دو بیٹیوں اور اکلوتے سپوت ذوقی بھیا کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔

مہو خالہ اکثر و بیشتر ہمارے ہی گھر ہوتی تھیں کیونکہ ماں زیب النساء اور خالہ مہر النساء والدین کے انتقال اور بھائی کے بیوی کو پیارے ہو جانے کے بعد بس ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ مہو خالہ تو ہمارے گھر کو اپنا میکہ قرار دیتی تھیں اور خوابوں کا نگر بھی۔

مہو خالہ ایک بھری پری سسرال میں گھری رہتی تھیں۔ دو کمروں کا چھوٹا سا پورشن اگرچہ اپنا تھا مگر پانچ افراد کے لیے دڑبے سے کم نہ تھا۔ ہمارے آشیانے کی خاموشی اور دلکشی جھنجھٹوں سے آزاد تھی۔

"زیب آپا! میرا ذوقی چیف ایگزیکٹو ہو گیا ہے۔ کوئی گر بتا دیں کہ میں اپنے بیٹے کی سیلری کو اچھی طرح کام میں لا سکوں۔" مہو خالہ اماں کے طرزِ حیات کی ہمیشہ سے قدر دان تھیں۔ ان کے میاں مسقط میں مقیم تھے مگر پھر بھی حالات کا رونا رہتا تھا۔ اماں کی اپنے ہی ملک کی محدود آمدنی میں معیارِ زندگی کی عمدگی مہو خالہ کو متاثر کرتی تھی۔

میرا ذاتی مقولہ ہے "پیسے سے سلیقہ نہیں آتا، سلیقے سے پیسہ آتا ہے۔"

"سب سے پہلے ذوقی کی سیلری اپنے ہاتھ میں لے، لڑکے پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا۔ لاابالی پن میں ضائع کرے گا۔ گروسری سے لے کر کراکری تک ہر چیز کی خریداری احتیاط سے کرو۔ بچت ہر نقطے سے ہوتی ہے اور..." اماں کی بہن کو نصیحتیں جاری تھیں جو مجھے بچپن سے سنتے سنتے اتنی ازبر تھیں کہ آخری جملہ میں بنا سنے بتا دیتی ہوں۔

"اختیارات ایک بندے کے ہاتھ میں ہوں تو فیصلے درست ہوتے ہیں ہر ایک کی سنو تو بنتا کچھ نہیں ہے بس بننے کی حسرت ہی رہ جاتی ہے۔"

اماں کی نصیحت کا آخری پیرا یہی ہوتا تھا اور درست اس لیے بھی تھا کہ اماں کی کامیابی آنکھوں کے سامنے تھی۔

ہمارے گھر میں سبھی معاملات اماں کے ہاتھ میں تھے۔ ابا جی تو آفس چلے جاتے۔ یہی غنیمت تھا شام پانچ بجے سے اگلے دن صبح آٹھ بجے تک ابا جی گھر پر ہوتے تھے۔ ان کے نیوز چینلز، سگریٹیں اور چند گھنٹوں کی نیند بس، اس سے زیادہ ابا جی کو کبھی فعال نہیں پایا۔ اماں بوتیک اور آشیانے میں قوس قزح کی طرح کمان بنی رہتی تھیں۔ ایک واحد کام جو ابا جی ٹیلر کے پاس اپنے کپڑے بنوانے چلے جاتے تھے، وہ بھی ایک آدھ سوٹ خراب ہونے کے باعث اب اماں ہی کی ذمہ داری تھی۔

آج کل تو اماں کی مشقت دگنی تھی ہمارے گھر میں

باغیچہ جو تعمیر ہو رہا تھا۔ اماں نے گیٹ سے ملحق بیکار احاطے کو اب پھولوں اور پودوں سے مہکا دیا تھا' جس نے ہمارے آشیانے کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔



"اور رابعہ کی اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟" ہمیشہ کی طرح مجھے حال کی گھڑی میں لانے کے لیے ذوقی بھیا نے سوال داغا تھا۔ میں اماں اور مہو خالہ کے مابین گفتگو سنتے سنتے کب تابعہ آپی اور ذوقی بھیا کے پاس چلی آئی' مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ویسے میں ان کے درمیان ہڈی بننا پسند نہیں کرتی تھی۔ ظاہر ہے کوئی بچی تو ہوں نہیں۔ بی اے پارٹ ٹو کی ہونہار اسٹوڈنٹ ہوں۔ سمجھتی تو سب کچھ ہوں۔ ذوقی بھیا جن جذبے لٹاتی نگاہوں سے تابعہ آپی کو تکتے تھے' ویسی نگاہیں میں بھی تو سنبھالے رکھتی ہوں۔ شمع آنٹی کے بیٹے طلحہ ظہیر کی خیر! اس بات کو فی الحال پردے میں ہی رہنے دیتے ہیں۔

"آپ بتائیں ذوقی بھیا جاب تو ہو گئی' آگے کیا ارادے ہیں؟" میں نے ابرو تان کر چھیڑنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"ارادے تو نیک ہیں ہماری طرف کے' سامنے کا پتا نہیں۔"

ذوقی بھیا کی شوخی بھی عروج پر تھی۔ تابعہ آپی کی جھکی نگاہیں اور دھیمی مسکراہٹ کتنا مکمل منظر تھا۔ جذبات کے رنگوں میں اعتماد بھی موجزن تھا۔ ظاہر ہے مہو خالہ اور زیب آپا کو کہاں کا اعتراض؟

اماں کو مہو خالہ پر جو اعتماد تھا وہ میں نے خود ان کی زبانی سنا تھا جب ابا جی گاؤں سے اپنے والدین سے مل کر آئے تھے تو جانے کس رشتے کی بابت اماں سے بات کر رہے تھے ہم نے تو گزرتے گزرتے سنا تھا۔

"زیب! اپنی تابعہ کے لیے انتہائی موزوں رشتہ ہے۔ دس ایکڑ کا مالک' مناسب تعلیم یافتہ' امیر حسین' ہماری تابعہ کو بہت خوش رکھے گا۔"

ابا جی کسی رشتے دار کے بیٹے کا تذکرہ کر رہے تھے۔

"اپنے ذوقی سے زیادہ قابل ہے کیا؟"

اماں نے تیکھے پن سے جواب دیا۔ فیصلہ سازی کی کنجی تو بہر حال اماں ہی کے پاس تھی۔

"لیکن مہو نے اب تک رشتے کی بات نہیں کی اور یہاں تو وہ بالکل راضی بہ رضا ہیں۔" ابا جی نے موقف کی مزید وضاحت کی تھی۔

"رشتے ڈالنے والی بات یہاں کہاں سے آگئی بھلا' مہو سے کیا انکار کی امید' اس سے تو بس یہ طے کرنا ہو گا کہ شادی کے کارڈ پر تاریخ کون سی ہو؟ آپ اس فکر میں نہ گھلیں۔ تابعہ کی شادی چند ماہ میں ذوقی کے ساتھ انتہائی شان سے کروں گی اور باقی آپ گاؤں کی باتیں وہیں چھوڑ آیا کریں۔"

اماں نے صاف لفظوں میں مستقبل کی پلاننگ بتائی تھی اور ابا جی ہمیشہ کی طرح' فکر سے دامن جھاڑ کے پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور تب سے تابعہ آپی کی رنگت اور بھی نکھر گئی تھی۔ بس اب ابٹن لگانے کی دیر تھی۔ ظاہر ہے اماں اور ذوقی بھیا تو ہمنوا تھے باقی مہو خالہ تو تھیں ہی اماں کی قدر دان۔



"راحت کو کمیٹی دھیان سے دینا اور کہنا گھر میں پینٹ کرا لے' ایسے اجڑے گھر میں تو بیٹیوں کے اچھے بر آنے سے رہے۔" اماں نے کمیٹی کے پیسے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

راحت میم کے گھر کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ اماں تو صرف دیواروں کے اکھڑے پینٹ کو دیکھ پائی تھیں مگر میں جانتی تھی کہ راحت میم کے گھر میں سبھی کچھ بدلنے لائق تھا۔ صوفے کی دھنسی ہوئی گدیاں' واش روم کے نظر نہ آنے والے ٹائلز' فریج' ٹی وی' واشنگ مشین کا کام نہ کرنے کی ضد اور سب سے بڑھ کر راحت میم اور ان کی بچیوں کے چند مخصوص جوڑے' جو دو سال سے انہیں پہنا دیکھ دیکھ کر میں تو اوب گئی تھی۔ کمیٹی راحت میم کو دیتے وقت میں

مسلسل اسی سوچ میں تھی کہ آیا ایک کمیٹی سے وہ کیا کیا کام لیں گی؟ کیونکہ اماں کے بقول راحت کو پیسہ برتنے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے اور وہ بے ڈھنگا پن آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

اتنے ضروری معاملات اور بمشکل ادا کرکے حاصل ہونے والی کمیٹی کے روپے راحت میم نے ذکیہ آنٹی کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ ذکیہ آنٹی' راحت میم کی کوئی رشتہ دار خاتون تھیں۔ انہیں اکثر و بیشتر میں نے راحت میم کے گھر میں دیکھا تھا۔ کچھ نہ کچھ دکھڑے سناتی ہی نظر آتی تھیں۔

"راحت میم! آپ نے اتنے ڈھیر سارے روپے انہیں دے دیے جبکہ آپ کو خود اشد ضرورت تھی۔" مجھ سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا' آخر میم کے سامنے الجھن بیان کر ہی دی۔ ابھی کچھ دیر قبل تو میں نے اماں کی نصیحت ان کے گوش گزار کی تھی۔ اب اگر خود میں عقل نہ ہو تو بندہ کسی کی دی ہوئی استعمال کرلیتا ہے ہمیں خوامخواہ تلملا رہی تھی۔

"بیٹا' اس کی ضرورت مجھ سے زیادہ اسے تھی' بیوہ عورت ہے۔ ایک بیٹا ہے جس کے سہارے اس نے ساری زندگی بیوگی میں گزار دی' اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے سرکاری ہسپتال والے تو ٹانگ کاٹنے پر تلے ہیں ایک ماہر ڈاکٹر نے ٹانگ بچا لینے کی گارنٹی دی ہے مگر بے حساب پیسہ مانگا تھا کچھ اس نے اپنا زیور بیچا ہے اور تھوڑی بہت میں نے مدد کر دی۔ اس کا بیٹا معذور ہونے سے بچ جائے گا میرے گھر کے مسائل بھی حل ہو ہی جائیں گے۔"

راحت میم کی بات میں وزن تھا۔ اگرچہ نیکی دل پر اثر کر رہی تھی مگر میری الجھن اب بھی یہی تھی کہ کمیٹی کا آسرا بھی نہ رہا تھا تو پھر اب مسائل حل کرنے کے لیے آسمان سے دھن برسے گا کیا؟



"تابعہ سے چند ماہ بڑی ہے تمہاری صبا' کچھ رشتے وشتے کی کوشش کرو۔ میری تابعہ تو چند ماہ میں اپنے گھر کی ہو جائے گی۔" اماں راحت میم کو ٹیوشن فیس دیتے ہوئے سہولت سے کہہ رہی تھیں۔

"جو نصیب میں ہو گا اللہ بہتر کرے گا۔"

راحت میم تو ابھی اپنا گھر مکمل نہ بنا سکی تھیں' اپنی بیٹیوں کے گھروں کی کیا فکر کرتیں۔

"رشتے لانے والوں کو بٹھاؤ گی کہاں؟ کوئی ڈھنگ کا فرنیچر ہی لے لو' رشتے بقول تمہارے نصیب سے آہی جائیں گے پر کم سے کم بیٹیوں کے لیے کچھ جوڑ کے تو رکھو۔ راحت' کچھ دور اندیشی کا مظاہرہ کرو۔"

اماں کو ہر ایک کو مشوروں سے نوازنے کی عادت تھی۔ ہمارے گھر سے کسی کو خیرات ملے نہ ملے مشورہ ضرور ملتا تھا اور اماں کی بات کو ہر کوئی مانے' نہ مانے سنتا ضرور تھا۔ وجہ وہی تھی "باس از آلویز رائٹ" ظاہر ہے' جو دیکھنے میں کامیاب ہے اس کی ہر بات میں وزن ہے۔

"زیب آپا! ضروریات بمشکل پوری ہوتی ہیں پس اندازی کہاں سے کروں' خیر سے تین بہنیں بیاہی ہیں صبا کے ابا نے چھوٹے بھائیوں کے تعلیمی اخراجات اور روزگار پر بھی بہتیرا خرچ کیا ہے۔ اپنے بارے میں سوچنے کی تو نوبت ہی دیر سے آئی ہے۔" راحت میم کے لہجے میں تھکن در آئی تھی۔ ساری زندگی فکریں اژدھے کی طرح ذہن و دل سے لپٹی رہی تھیں۔

میرے دل میں یہ تکلیف دہ خیال اکثر آتا تھا کہ راحت میم کو اپنی بیٹیوں کی طرف سے بھی سکون کی گھڑیاں میسر آئیں گی کہ نہیں خصوصاً" اس صورت میں جبکہ صبا آپی سے چھوٹی تابعہ آپی پیا دیس سدھار جائیں گی۔ کیا گزرے گی' ان پر دروازے سے دروازہ لگتا تھا۔ شہنائیوں کی گونج کتنی اذیت ناک ہو گی۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا میں آپی کی شادی کے بعد راحت میم کے گھر نہیں جاؤں گی' ان کی تکلیف دیکھنا کہاں آسان ہو گا؟



"ابا جی کہاں ہیں؟"

آج ناشتے کی میز پر اباجی کو نہ پا کر میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ایک واحد ناشتہ اور ڈنر پر ہی تو اباجی دیکھنے کو ملتے تھے اور گاہے بگاہے ان کی آواز بھی کان میں پڑجاتی تھی۔

"گاؤں گئے ہیں' دادی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔" تابعہ آپی نے میرے توس پر مکھن لگاتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا تھا جیسے دادی ماں کی موت کا نہیں کسی راہ چلتے کے گزر جانے کا ذکر کر رہی ہوں۔ میں مضطرب ہو گئی۔

"اماں! کیا ہوا تھا دادی ماں کو؟ اباجی ہمیں کیوں نہیں لے کر گئے؟"

"تمہارے ایگزام سر پر ہیں ان کی تیاری کرو اور تابعہ کیسے جا سکتی تھی۔ بوتیک پر اتنے آرڈرز آئے ہیں' ہمیں مل کر وہ کام نمٹانا ہے اور تم نے صرف ایک سلائس کیوں لیا' پیٹ بھر کے کھاؤ۔"

اماں نے میری غیر ضروری دخل اندازی کو رد کر دیا تھا اور ہمارے نہ جانے کی وجہ بھی بیان کی تھی جو کسی صورت دل میں اتری نہیں۔ اماں کی ہر بات کو عقیدت سے سننے والی آپی تو روز مرہ معمولات میں مگن ہو گئی تھیں مگر میرے دل کی پھانس نکل نہیں رہی تھی کیونکہ نانی ماں کے انتقال پر نانی ماں کے چالیسویں تک اماں کی بوتیک پر close کا بورڈ میں نے خود لگایا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماموں کے اکیلے آنے پر اماں اور مہو خالہ نے ان کی کئی گھنٹے کی کلاس لی تھی۔

"حد ہو گئی بھیا! زندگی میں بھی ماں کو دکھ دیا' مر کے بھی قبر سلگے گی اس کی' پوتوں کو زندہ ماں سے تو دور رکھا' کم سے کم مری ماں کا چہرہ ہی دکھا دیتے۔"

اور آج اباجی کی بھی ان ہی لفظوں میں دھلائی ہو رہی ہو گی مگر نہیں' اباجی کا کون تھا' نہیں سمجھانے والا۔ دادا ابو کا انتقال تو مجھے یاد ہی نہیں۔ بہن بھائی اباجی کے تھے نہیں' ایک دادی ماں تھیں جو فون کی حد تک ہم سے منسلک تھیں۔ آج آواز کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میرا تمام دن یاسیت میں گزرا تھا' عجب بے کلی تھی۔

"رابعہ' طلحہ کی جاب کا کیا ہوا انٹرویو کے لیے گیا تو تھا۔"

اماں نے اچانک غیر متوقع بات کر کے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ طلحہ اور میں دور کے پڑوسی اور قریب کے کلاس فیلو تھے۔ قریب کی تفصیل بتانا ضروری نہیں' اماں کا ایک اور وصف مجھ پر عیاں ہوا تھا' وہ بنا کہے ہمارے دل کی باتیں جان لیتی تھیں۔

"اماں! وہ کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔"

میں نے **جھجکتے** ہوئے بتایا۔ ظاہر ہے انٹرویو کا نتیجہ نہ آنے کا مطلب تھا کسی بھی بات کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔

"چلو انتظار کر لیتے ہیں ویسے بھی ابھی تابعہ کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

اماں نے لاپروائی سے کہہ کر بات ختم کی تھی گویا وہ آپی کے بعد میرے رشتے کے لیے زیادہ فکر مند نہیں تھیں۔ اماں نے غیر متوقع موضوع چھیڑ کر میرا دھیان دادی ماں کے المیے سے ہٹا دیا تھا۔ اب میں دل گرفتگی کے بجائے مسرت آمیز خیالات میں گم ہو گئی تھی' ماں سچ میں مہان ہے۔



"زیب آپا' روئے زمین پر تو بس دو ہی ہستیاں سراہنے لائق ہیں۔ ایک میری زیب آپا اور دوسری ہماری پیاری تابعہ' زندگی برتنا تو کوئی ان سے سیکھے۔" مہو خالہ' آپی کے ہاتھوں کے ذائقے کی دیوانی تھیں پیٹ بھر کے کھاتی اور جی بھر کے سراہتی تھیں مگر میں نے آج طعام لذیذ کا غم نہیں لگایا۔ غصے میں جو تھی۔

"مہو خالہ میں کسی گنتی میں نہیں۔" مہو خالہ کے اماں اور آپی کی تعریفوں کے قلابے میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا میں نے چھوٹی انگلی دکھا کر "کٹی" کر دی تھی۔

"ارے نہیں میری جان' تیری تعریف کے لیے تو الگ سے رجسٹر چاہیے۔" مہو خالہ نے جھٹ سے مجھے سینے سے لگایا تھا اور پچک پچک کے ماتھا تر کر دیا تھا۔

"کمال کرتی ہے رابعہ! تیری تعریف کس کھاتے میں کرے، مہو کے کونسے دو بیٹے ہیں۔" اماں نے مجھے بہلاتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔

تابعہ آپی نے شرما کر سر جھکایا تھا اور اماں نے ذوقی بھیا کے کندھے کو تھپتھپایا تھا مگر کسی نے مہو خالہ کے چہرے کی طرف دھیان نہیں دیا جس پر تفکر کی لکیریں الگ ہی نقشہ بنا رہی تھیں۔ کوئی چیز ایسی تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی مگر میں نے سر جھٹک کر بریانی کی ڈش اپنے پاس کھسکائی تھی۔

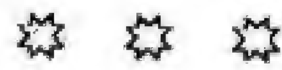
تابعہ آپی ہنر و سگھڑاپے کا امتزاج تھیں۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصے جاب بھی کی تھی مگر پھر اماں کے ساتھ بوتیک سنبھالنے لگ گئی تھیں۔ سچ یہ تھا کہ اماں کی بوتیک کو "چار چاند" لگائے ہی آپی کے تیار کردہ ملبوسات نے تھے۔ کیا اسٹائل، کیا نیا پرانا ڈیزائن، آپی ہر چیز میں مہارت رکھتی تھیں۔

آپی کی کوکنگ کا تو زمانہ شیدائی تھا۔ عام سی سبزی کو بھی بریانی جیسا لذیذ بنا دیتی تھیں اور پھر ان کے میک اپ اور ہیئر اسٹائل کی تو کیا ہی بات ہے کالج فنکشنز میں میرے میک اپ اور ہیئر اسٹائل پر فرینڈز برملا کہتیں۔

"کسی ٹاپ کلاس پارلر سے ہو کر آئی ہو۔"

اور میں تن کے کہتی تھی ہاں "آپی پارلر" کا کمال ہے۔

میری آپی جیسا سارے خاندان میں کوئی نہیں تھا مگر ان کے شخصی اوصاف بے مول ٹھہرے۔ کوئی قدر نہیں کی گئی ان کے ہنر و کمال کی بلکہ انہیں تولا گیا تو ماں کے اعمال کے ترازو پر۔



"تابعہ! اماں اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی۔" کوئی کہتا سورج آج چند منٹ دیر سے طلوع ہوا ہے تو شاید میں یقین کرنے میں اتنی دیر نہ لگاتی جتنی بے یقینی سے میں اس وقت ذوقی بھیا اور تابعہ آپی کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا جوک سنا رہے تھے وہ' مہو خالہ اور آپی کے رشتے سے انکار؟ کیسے ممکن تھا۔ وہ تو آپی پر جان وارتی تھیں۔ کالج سے واپس آتے ہی گھر میں غیر معمولی خاموشی پا کر سیدھی تابعہ آپی کی طرف آئی تھی وہاں ذوقی بھیا بھی تھے اور سر جھکائے ہوئے بھی تھے جو کچھ ان کے لبوں نے کہا وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔

مہو خالہ' ذوقی بھیا کی نسبت کہیں اور طے کر رہی تھیں۔ آپی کو کہیں سے معلوم ہوا تو ذوقی بھیا سے دریافت کیا تھا جس کے جواب نے ہم دونوں بہنوں کو زمین پر لا پٹخا تھا۔ ماں کے ہنر و فن کے گن گانے والی انہیں پل پل سراہنے والی مہو خالہ کو اس رشتے پر اعتراض کیا تھا۔

"زیب آپا کی بیٹی کو بہو بنالوں یعنی اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھوں خود سے جدا کر لوں۔ آپا ایک دن سسرال میں نہ رہیں' ان کی بیٹی سے کیا امید رکھوں' نہ بابا نہ ایسی بہو نہیں چاہیے جو پکانے کمانے میں ماہر ہو۔ مجھے تو وہ بہو چاہیے جو میرے بڑھاپے تک میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ زیب آپا نے تو زندگی میں جو بنایا اپنے لیے' جو جوڑا اپنی اولاد کے لیے' نہ کسی کے اچھے کی نہ کسی کے بھلے کی۔ جس کی ماں اچھی بہو نہ بن سکی اس کی بیٹی کیا خاک بنے گی۔ سارے جہاں کی قیمتی اشیاء خرید لیں' نہ لی تو ساس سسر کی دعا نہ لی۔"

مہو خالہ کے الفاظ من و عن ہمارے کانوں میں ڈال کر ذوقی بھیا سر جھکائے لوٹ گئے تھے گویا ان سے امید رکھنے کی غلطی نہ کی جائے۔ آپی اور میں ایک دوسرے کو تکے جا رہی تھیں۔ زبان کچھ کہنے لائق نہ رہی تھی اور اماں! ان کی امیدیں اور خواہشیں تو مٹی ہو گئی تھیں وہ تو اطمینان و اعتماد کی اس دہلیز پر تھیں کہ آج صبح کارڈز کے نمونے تک لے آئی تھیں اور اس وقت خاموشی سے ایک صوفے پر دھنسی، مضمحل اور ملول تھیں۔

دکھ کس بات کا تھا مہو خالہ کی منافقت کا یا اپنے کار رائیگاں کا؟

تابعہ آپی تو سپنوں کے تاج محل کے ٹکڑے سمیٹتی

کمرہ بند ہوگئی تھیں۔ پیچھے رہ گئی میں تو مجھے آج تک اماں کی قصیدہ خوانی میں یہ خیال نہیں آیا کہ اماں کامیاب گرہستن تھیں، زندگی کے ہر پل سج سج کے گزارنے والی، تنکے تنکے جوڑ کے آشیاں بنانے والی میری اماں، ایک سپر بوتیک کی آنر، بیٹیوں کی اعلا تربیت کرنے والی ماں، ان کے پیدا ہوتے ہی ان کے مستقبل کے لیے پس انداز کرتی ماں، شوہر کی ہر میدان میں بہترین معاونت کرنے والی بیوی، سبھی کچھ تو تھی میری ماں مگر کاش کہ میں کہہ سکتی کہ میری ماں ایک اچھی بہو بھی تھی۔

اماں شادی کے بعد صرف چند دن سسرال میں رہی تھیں اور ابا جی جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد اور بڑھاپے کا سہارا تھے انہیں ساتھ لیے الگ ہو گئی تھیں۔ پہلے پہل ابا جی دادا، دادی کی مالی مدد کرتے تھے، اماں نے اخراجات کے دکھڑے سنا سنا کر وہ بھی ختم کر وادی تھی اور سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر ابا جی کو چوری چھپے کی معاونت کے قابل بھی نہ رہنے دیا تھا۔ ایک ہی محلے میں ہونے سے دادا، دادی ہماری صورت دیکھنے کو گھر آجاتے تھے۔

اماں نے اپنا آشیانے کا لالچ دے کر ان سے کئی کوس کی دوری پر گھر بنالیا۔ ملاقات کئی کئی ماہ پر محیط ہو گئی اور ہمارے تعلیمی مراحل کی پابندیوں نے تو یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ سالوں بعد دادا جی اور ایک دن یونہی چلتے چلتے دادی ماں کے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کو ہم نے چلتی ہوا کی مانند سر سے گزار دیا۔ دادی کہا کرتی تھیں (میں گزر جاؤں گی مگر تیرا کیا، ہمیشہ تیرے ساتھ رہے گا!!)

اماں نے زندگی مربوط اور منظم اصولوں کے تحت گزاری تھی۔ بہترین طرز حیات اور مکمل آسائشوں بھری زندگی ہر انسان کی ازلی خواہش اور تمنا ہے اور عورت تو اس تمنا کی اپنی فطرت میں پرورش کرتی ہے۔ عیب نہیں ہے مگر قابل گرفت بات یہ تھی کہ ماں کے اصولوں میں ایک بہو کے فرائض شامل نہ تھے۔

میری ذہنی پراگندگی حد سے سوا تھی۔ انتہائی بوجھل قدموں سے میں اپنی کتابیں لیے راحت میم کے پاس چلی آئی مگر راحت میم کا فکر و اوہام سے گھرا آنگن آج کچھ الگ ہی بہار دکھا رہا تھا۔ راحت میم اور ان کی بیٹیاں قدرے بہتر ملبوسات میں ڈھلے چہرے کے ساتھ دکھائی دیں۔ مقام حیرت تھا کہ ایک کونے میں میز پہ اچھے خاصے لوازمات موجود تھے جن میں نمایاں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ گھر کی افسردہ فضا سے آکر یہاں کی رونق میرے دل پر گراں گزر رہی تھی مگر تجسس بہر حال تھا۔

"راحت میم آج گھر میں بڑی چہل پہل ہے کوئی خاص بات؟"

مجھے لگا کہ راحت میم کی یا تو کہیں اور سے کمیٹی نکل آئی تھی یا انہیں یا ان کے شوہر کو کوئی بونس وغیرہ مل گیا تھا مگر جو کانوں نے سنا وہ توقع کے انتہائی برعکس تھا۔

"بیٹا تمہاری دونوں بہنوں کی نسبت طے پا گئی ہے۔ صبا کو تو انگوٹھی بھی ڈال دی ہے ذکیہ بہن نے۔"

راحت میم کیا کہہ رہی تھیں میں نے بمشکل متوجہ ہو کے سنا تھا کیونکہ حیرت کی آخری اسٹیج پر جو تھی۔

"ارے اتنی اچانک، کوئی جادو کا چراغ مل گیا تھا" میری سوچ میری زبان سے ادا ہوئی تھی۔

"بس بیٹا اپنی جانے انجانے میں کی گئی نیکیاں کام آگئیں۔ ذکیہ بہن کے بیٹے کے آپریشن میں ذرا سا خیال کیا کر لیا وہ پگلی تو اس وقت سے دل میں احسان اٹھائے ہوئے تھی، کہنے لگی بہو بناؤں گی تو آپ کی بیٹی کو جس ماں کے دل میں اتنی وسعت ہے اس کی بیٹی کتنی کشادہ قلب ہوگی۔"

(جو ماں ایک دن سسرال نہ رہی اس کی بیٹی سے کیا امید رکھوں) میرے ذہن میں ان الفاظ کی گونج تھی۔

"ماں کے عمل کی اینٹ سے بیٹیوں کی آئندہ زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ بات میری ہی اماں کے منہ سے نکلی تھی جب بہت عرصے قبل ہمارے ہی محلے میں عالیہ آنٹی کی بیٹی کی شادی عین وقت پر نہ ہو

سکی تھی۔ لڑکی معصوم تھی کوئی خطا اس کے حصے میں نہ آئی لڑکا ہی کسی اور کی زلف کا اسیر تھا۔ سب حقیقت جاننے کے باوجود اس روز شادی میں موجود ہر فرد کی زبان پر یہی قصہ تھا۔ عالیہ نے اپنی شادی پر یہ کہہ کر رخصت ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ گھر میرے نام لکھیں گے تو رخصت ہوں گی۔ بالآخر اپنی بات منوا کر ہی ماں باپ کے گھر کی دہلیز چھوڑی۔ لو، آج اپنی بیٹی کے سامنے اپنا کیا آ گیا۔ لگتا تو یہی ہے کہ ضرور ماں کی طرح بیٹی نے بھی کوئی اوندھی شرط رکھی ہو گی اور تب ماں نے گھر آ کر برملا کہا تھا۔

"عالیہ نے قدم اٹھاتے وقت سوچا ہوتا کہ کل کو ماں بنوں گی تو کیا ہو گا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مرد کا عمل اس کے ساتھ رہتا ہے مگر عورت کے ہر قدم پر نشان لگتے جاتے ہیں، کل انہی قدموں کے نشان پر اس کی نسل کو چلنا پڑتا ہے۔ عورت کے قدموں کے نشان تو وقت کی دھول اور بھی گہرے کر دیتی ہے، مٹتے نہیں ہیں عورت دنیا سے چلی جاتی ہے مگر اس کے اعمال دنیا والوں کی زبان پر رہ جاتے ہیں۔"

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اماں اپنی زندگی گزارتے وقت اپنے ہی کلمات کو سامنے بھی رکھتیں تو آج اپنے آشیانے کی شاناسا دیواروں تلے ناشناس دھوپ نہ در آتی۔

"راحت میم! ندا کے لیے کس خوش نصیب کا قرعہ نکلا ہے۔" میں اپنے لہجے کو بشاش ظاہر کرنے کے لیے شوخی سے بولی۔ ندا میری ہم عمر تھی مگر سمپل ایف اے کر کے اب صرف گھرداری میں لگی رہتی تھی۔

"بیٹا وہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اچانک ہی شمع بہن چلی آئی اپنے طلحہ کی نوکری لگتے ہی میری ندا کا ہاتھ مانگنے، وہ تو ایسی باؤلی تھی کہ شگن کر کے ہی واپس لوٹی۔ میری تو بچیوں کے اللہ نے یک دم ہی نصیب کھول دیے۔"

راحت میم تو جانے کیا کیا کہتی رہیں مگر میں پتھرائی سماعت کو لیے گھر لوٹ آئی شمع آنٹی کے فیصلے کی بابت راحت میم نے کوئی تاویل نہ دی تھی مگر میرے کانوں میں کچھ دن قبل طلحہ سے کالج میں ہوئی گفتگو گونج رہی تھی۔

"رابعہ تمہاری ماں تمہاری آئیڈیل ہیں مگر میں نے کسی اور کے منہ سے ان کی زیادہ تعریفیں نہیں سنیں۔" میں اپنی فرینڈز سے اپنے نئے باغیچے کی تعریفیں سن کر فخر سے اسے اپنی اماں کی فہم و فراست قرار دے رہی تھی تب طلحہ نے عجیب منطق بیان کر دی تھی جو کہ شمع آنٹی ہی نہیں تمام جاننے والوں کی اماں کے بابت رائے تھی۔

"میری ماں کہتی ہے، زیب آپا نے محلے دار پڑوسی تو ایک طرف، عزیز رشتے داروں کی بھی ایک تنکے کی مدد نہیں کی اپنی ہی ایک جیب سے نکال کر دوسری جیب میں ڈالتی رہیں۔ آپ جیسے آپ زندہ باد کے مصداق جینا کہاں کا کمال ہے۔ ماں نے کتنی مجبوری میں صرف ایک کمیٹی مانگی تھی تمہاری اماں نے باغیچہ بنوا لیا مگر میری بہن کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے ایک ماہ قبل کمیٹی نہیں دی اپنا آشیانہ بنا لیا مگر ساس سسر کو ایک دیوار کا سایہ تک نہ دیا۔ خوبی یہ نہیں کہ کفایت شعاری اور دور اندیشی سے اپنا گھر جنت اور اپنی اولاد کے لیے سکون کی بہتی لہریں بنا لیں وصف تو تب ہوتا کہ وہ پس انداز کر کے چھتنار بناتیں جس کے سائے میں ہر اپنے پرائے ضرورت مند کو فائدہ ہوتا۔"

میں نے طلحہ کو اپنے حساب سے بے نقط سنائی تھیں اور گھر لوٹ گئی تھی مگر آج کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہیں پڑھا تھا کہ۔

"عورت ایک زندگی نہیں جیتی کئی زندگیاں گزارتی ہے۔ عورت ایک زندگی میں (کسان) ہاری ہوتی ہے جس میں اعمال کے بیج بوتی ہے اور باقی زندگیاں اس کی فصل کاٹتی رہتی ہے اور یہ مشقت اس کے جانے کے بعد اس کی نسلوں کے حصے میں آتی ہے۔ کامیاب وہ نہیں جس نے اپنی زندگی جی لی، کامیاب وہ ہے، جس نے ایسی زندگی جی جو باقی زندگیوں کے لیے مشعل راہ بن گئی۔

ماں وہ شمع ہے، جس کی روشنی تلے اولاد کے نصیب لکھے جاتے ہیں۔" ☆☆



امثل عزیز شہزاد



ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر رکنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔

وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیہ اور سائر... وہ سائر کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں' اجیہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائر اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اجیہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے' اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کانچ سے بنی مورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائر سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائر کہیں اور انٹرسٹڈ تو نہیں ہے۔ تب سائر کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائر کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب اس کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح

مکمل ناول

رکھا' سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے' ان کا ایک بیٹا عاشر ہے' جو اجیہ کو پسند کرتا ہے' شادی کی تقریبات میں سائر کا رویہ بہت اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے' وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔

اجیہ کی دوست شینا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد' اجیہ کو پسند کرتا ہے۔

سائر کا رویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید رد عمل ظاہر کرتا ہے۔' وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔

وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا پتا نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتا دے دیتے ہیں۔

تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جو اذیت مجھے پہنچائی تھی' اس کے بدلے کا وقت آپہنچا ہے۔"

دوسری قسط

"یار ہو کہاں تم آخر..." فون ریسیو کرنے پر آغا چھوٹتے ہی بولا۔ اجیہ اس وقت ناشتے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں آکر فیس بک پر مصروف تھی' تب ہی آغا کی کال ریسیو کی۔

"یہیں ہوں میں نے کہاں ہونا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں دیکھ کر اپنے کھلے بال خوامخواہ سنوارنے لگی۔

"کسی بات کی حد ہوتی ہے اجیہ... تمہارے نزدیک میری کوئی اہمیت ہے بھی یا نہیں۔" وہ بے حد خفا لہجے میں گویا ہوا۔

"تم اتنا ہانپ کیوں رہے ہو۔ آخر بات کیا ہے کچھ بتاؤ گے بھی۔" وہ نرمی سے پوچھنے لگی۔

"بات کیا ہے' گزارش ہے جو اتنے دن سے کر رہا ہوں تم سے کہ مجھ سے ملاقات کرلو مگر تم ہو کہ میری بات کو سنجیدگی سے لے ہی نہیں رہی ہو۔" وہ بولا۔

"آغا گھر میں دعوتوں کا چکر تھا' میں کیسے آتی۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"ختم ہو گیا یہ واہیات چکر؟" وہ چبا چبا کر بولا۔

"ہاں بھئی' ختم ہی سمجھو۔" وہ اب اٹھ کر ٹہلنے لگی تھی۔

"تو پھر کب بجھا رہی ہو پیاس؟" وہ بے تابانہ بولا۔

"پیاس؟" وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ "پیاس لگی ہے تمہیں تو جا کر فریج سے پانی پی لو' میں کیسے بجھا سکتی ہوں تمہاری پیاس۔"

"سویٹ" اس نے اس کی شرارت بھانپ کر بڑے پیار سے کہا۔ "یہ دید کی پیاس ہے' تمہیں ہی بجھانی پڑے گی۔"

"تم اتنے مشکل جملے کیسے بول لیتے ہو۔" وہ محظوظ انداز میں بولی۔

"سب تمہارے حسن کے کرشمے ہیں۔" وہ جذبوں سے پر' آواز میں بولا۔ اجیہ کے کان دہکنے لگے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ اس سے خاصی حد تک بے تکلف ہو چکی تھی۔

"پہلے نہیں تھا' تمہیں دیکھا ہے جب سے تب سے سب یہی کہتے ہیں۔" ادھر شوق کا وہی عالم تھا۔

"تم باتیں بہت بناتے ہو۔ کچھ کام..." اس کی بات ادھوری رہ گئی دروازے پر دستک دے کر لالی نے اندر جھانکا اور بولی۔

"مہ پارہ بیگم صاب نے ادھر بلایا ہے جی آپ کو۔"

"اسٹوپڈ... میں نے کہا تھا کیا کمرے میں داخل

ہونے کو' جاؤ' آرہی ہوں میں۔" وہ اسے ڈانٹ کر بولی۔وہ بے چاری سرہلا کر واپس مڑ گئی۔

"کیا ہوا کس پر ناراض ہورہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ اچھا آغا میں ایک دو دن میں بتاتی ہوں تمہیں ملنے سے متعلق' بلکہ ایسا کرتے ہیں کل تم شینا کو مجھے لینے بھیج دینا میں کہہ دوں گی کہ اس کے گھر میں گیٹ ٹوگیدر ہے کیوں ٹھیک ہے؟"

"واہ واہ۔ یہ ہوئی نا بات۔ شینا کو کہہ دیتا ہوں میں' پھر کس وقت آؤ گی بتاؤ۔"

"سات بجے تک ٹھیک رہے گا۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"اوکے' پھر ملتے ہیں کل زندگی۔" وہ دلبرانہ لہجے میں بولا۔

"اوکے۔" اجیہ نے فون کا لال بٹن پش کیا اور لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کرتی ہوئی لاؤنج میں چلی آئی۔ وہاں مہ پارہ' میرب اور وقار صاحب محفل جمائے بیٹھے تھے۔

"جی خالہ جانی آپ نے بلوایا تھا مجھے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں' آؤ بیٹا بیٹھو۔" انہوں نے بڑے پیار سے کہہ کر اپنے نزدیک صوفے پر جگہ بنائی۔ سامنے کے صوفے پر میرب اور دوسرے پر وقار براجمان تھے۔

"کیا ہوا سب خیر ہے؟" وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں بھئی' الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔ یوں ہی ہم ذرا گپ شپ لگا رہے تھے تو سوچا تمہیں بھی شامل کرلیا جائے۔ اکیلی کمرے میں تھی بور ہورہی ہوگی۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"بھئی اب بوریت کا کیا سوال عنبر سے میرب بیٹی جو ہے ہماری اجیہ کو کمپنی دینے کے لیے۔" وقار خوش دلی سے بولے۔

"جی بالکل ابو۔۔۔ مجھے تو خود اجیہ میں اپنی چھوٹی بہن دکھائی دی ہے۔" میرب نے دھیمے سے مسکرا کر ان کے کہے کا مان رکھا۔

اجیہ بھی ہلکے سے مسکرادی مگر اس کے ذہن میں کل کی ملاقات گردش کررہی تھی۔

"بس بیٹا۔" دفعتاً" مہ پارہ بولیں۔ "میں تو چند روز میں واپس چلی جاؤں گی اب یہ گھر اور گھر والوں کو تم ہی نے سنبھالنا ہے۔ ہماری اجیہ تھوڑی لاابالی اور غیر ذمہ دار ضرور ہے مگر ہے بڑی پیاری بچی تم اس سے دوستی کرکے مایوس نہیں ہوگی۔ وقار بھائی تو تمہارے سامنے ہیں اور رہا تمہارے سرتاج کا سوال۔۔۔ مزاج کا سنجیدہ سہی مگر ہے لاکھوں میں ایک میں امید کرتی ہوں کہ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھوگی اور اسے بھی اتنی ہی اہمیت اور توجہ سے سنواروگی جتنا کہ اپنے والد کا گھر سنبھالا ہوا ہوگا۔"

"خالہ جان۔۔۔ آپ بالکل بے فکر رہیے ان شاء اللہ آپ مجھے اپنی امیدوں اور ارمانوں کے عین مطابق پائیں گی مگر بحیثیت انسان مجھ سے بھی کبھی کوئی کوتاہی ہوسکتی ہے اس کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔" وہ اتنے حلیم لہجے میں بولی کہ وقار اور مہ پارہ

دعائے مغفرت

نگہت عبداللہ کی والدہ محترمہ مقصود بیگم طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ نہایت نیک نفس' صابر اور نرم خو طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کی دائمی جدائی نگہت عبداللہ کے لیے بہت بڑا صدمہ اور محرومی ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ نگہت عبداللہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلا مقام سے نوازے' ان کی خطاؤں سے درگزر کرے' نگہت عبداللہ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

نہال ہی ہو گئے۔

"جیتی رہو میری بچی۔ اللہ تمہیں دونوں جہاں میں ان گنت خوشیاں دکھائے۔"

"آمین۔ آمین" مہ پارہ خلوص دل سے بولیں، پھر کہنے لگیں۔

"بھائی صاحب۔ میں چاہ رہی تھی کہ میرب کا ہاتھ کل یا پرسوں کھیر میں ڈلوا دیا جائے، میری تو جمعہ کی فلائٹ ہے اس سے پہلے ہی یہ رسم ادا ہو جائے تو مناسب ہے۔ پھر بھلے میرب چاہے مہینہ دو مہینہ کچھ نہ بھی پکائے مگر یہ کچھ نہ کرنے کی جو قدغن ہے یہ بہرحال ختم ہو جائے گی، کیوں؟" انہوں نے تائید چاہنے والے انداز میں پہلے وقار پھر میرب کو دیکھا۔

"بھائی یہ تو خالص خواتین کا شعبہ ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسا مناسب سمجھو تم۔ تم ان کی ماں جیسی ہو، تمہیں اختیار ہے۔" وقار صاحب ہاتھ اٹھا کر متانت سے بولے۔ اور اجیہ تو اپنا کل کا پروگرام تس نہس ہوتے دیکھ کر تلملا گئی۔

"وہاٹ نان سینس۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "یہ کھیر میں ہاتھ ڈالنا کیا ہوتا ہے؟" اس کی بات پر مہ پارہ بے ساختہ ہنس دیں۔

"بھئی یہ ایک رسم ہے، اس کا مطلب ہے کہ نئی دلہن کچھ میٹھا پکا کر گھر کے کاموں کا آغاز کرے گی۔" انہوں نے اسے بتایا۔ میرب مسکرا رہی تھی۔

"مگر میں نے تو کبھی نہیں سنا اس رسم کے متعلق۔" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"کیسے سنتیں؟ رسموں رواجوں کے متعلق تو ماں یا خاندان کی خواتین ہی بتایا کرتی ہیں۔" وہ بولیں مگر اجیہ کا بجھتا چہرہ دیکھ کر انہیں لگا کہ شاید وہ کچھ غلط کہہ گئی ہیں۔ انہیں اس موقع پر یہ تذکرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"چلو اب تو سن لیا نا، خالہ جانی سے۔" میرب نے جیسے اسے تسلی دی مگر وہ مزید کچھ نہیں بولی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"بڑی حساس بچی ہے۔ اپنی ماں کی کمی کو بہت محسوس کرتی ہے۔" وہ تاسف سے اسے جاتا دیکھے گئیں۔

"خالہ جانی۔ ماں رشتہ ہی ایسا ہے انسان اپنی عمر کے آخر تک اس کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔" میرب دکھی لہجے میں بولی۔ وقار لب بھینچے خاموش بیٹھے تھے۔

"بس بیٹا، قسمت کے گورکھ دھندے بھلا کب کسی کی سمجھ میں آئے ہیں۔" ان کے سینے میں اک ہوک سی اٹھی۔ میرب نے ان کی بات پر کچھ نہیں کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں پھر۔ سائرہ سے بھی بات کر لیتے ہیں رات کو، اس کی سہولت بھی دیکھنی ہو گی۔" مہ پارہ نے ایک بار پھر گفتگو کا رخ اس جانب موڑ دیا تھا مگر وقار ہنوز خاموش تھے۔ بالکل خاموش۔



"یہ نازو کے لیے ہے یہ مانو اور یہ چندا تیرے لیے۔" بی بی نے شاپر میں سے مختلف پرنٹ کے لان کے سوٹ ان تینوں کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ صبح سے نازو کے ساتھ خریداری کے لیے قریبی بازار گئی ہوئی تھیں۔ اب وہی خریداری انہیں دکھاتے ہوئے ان کے لیے لائے گئے کپڑے انہیں تھمانے لگیں۔ شیخ صاحب اپنے کمرے میں اپنے مخصوص تخت پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

"بہت پیارا سوٹ ہے اماں۔" مانو چمکتی آنکھوں سے بولی۔

"سامنے سلوانے دے دیں گے۔" نازو بولی۔

"یہ کیسا واہیات کپڑا ہے اماں۔ جب آپ کو معلوم ہے میں اپنی مرضی کے کپڑے خریدتی ہوں تو کیوں بلاوجہ یہ گھٹیا جوڑا لانے میں پیسے خرچ کیے۔ نہ رنگ اچھا ہے نہ ڈیزائن اور نہ ہی کپڑا۔" وہ ازحد ناگواری سے بولی۔

"لو خوامخواہ اتنا پیارا تو ہے چندا" مانو بولی۔

"تم چپ کرو بینڈو۔ اور تمہیں اتنا ہی اچھا لگ رہا ہے تو تم لے لو میں تو ویسے ہی یہ کپڑا نہیں سلواؤں گی۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"ری ناشکری۔۔۔ کیوں کیا کانٹے اگے ہوئے ہیں اس کپڑے میں اور ڈی زین (ڈیزائن) میں تجھے کون سے کیڑے دکھائی دے گئے کم بخت ماری ڈر اس وقت سے جب تیرے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے ہوں۔ ارے غضب خدا کا مزاج ہی نہیں ملتے شہزادی کے۔" وہ آگ بگولہ ہوگئیں۔

"کیوں چندا۔۔۔ اچھا بھلا تو سوٹ ہے۔ شاباش رانی رکھ لے اسے بھی کل پیسے دوں گا اپنی پسند سے بھی لے لینا اور یہ ماں دل سے لائی ہے۔ رکھ لے چل میرا چندا۔" شیخ صاحب نے حقہ منہ سے نکال کر اسے چمکارا۔

"آپ کہتے ہیں تو رکھ لیتی ہوں مگر کل ضرور مجھے پیسے چاہئیں۔" وہ احسان کرنے والے انداز میں سوٹ اٹھانے لگی مگر اس سے قبل ہی بی بی نے جھپٹ لیا۔

"بس بس۔۔۔ ان کیڑا لگے کپڑوں کو سینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دے گا نہ تیرا باوا پیسے لے آنا اپنے لیے اطلس و کم خواب کے ہیرے موتی جڑے سوٹ۔ اسے ہم فقیرنیوں کے لیے چھوڑ دے۔" وہ بری طرح برانگیختہ ہوئی تھیں۔

"نیک بی بی۔۔۔ یہ کیا بچپنا ہے۔" وہ ناگواری سے بولے۔

"ہاں بچپنا میں کر رہی ہوں مت سمجھانا کبھی اپنی اس لاڈو رانی کو بیٹھے بٹھائے اور شہ دیے جاؤ۔ ارے جوان جہان لڑکی ہے اس کے بچپنے دکھائی نہیں دے رہے الٹا مجھے بچہ کہہ رہے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"چلو بچیوں دوپہر کی روٹی کی تیاری کرو۔ سامان سمیٹو شاباش۔" شیخ صاحب نے انہیں جواب دینے کے بجائے بچیوں کو مخاطب کیا۔ چندا ان کی تکرار شروع ہوتی دیکھ کر پہلے ہی پیر پٹخ کر جا چکی تھی جبکہ مانو اور نازو نے پھیلے شاپر سمیٹے اور کمرہ عبور کر گئیں۔

"بی بی دیکھ تیری ہی بات درست ہے میں مانتا ہوں مگر یوں ہر وقت زبان کڑوی کرنا بھی تو دانشمندی نہیں۔ جوان لڑکی ہے ذرا پیار سے سمجھایا کر ماں کی بات میں بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ اپنے ازلی نرم و ناصحانہ لہجے میں بولے۔

"آپ کافی ہو نا پیار کرنے کے لیے میں تو ہوں ہی اس کی دشمن مگر میں کہہ رہی ہوں شیخ جی۔۔۔ اس کے انداز مجھے ہولاتے ہیں۔ اس کا مزاج آسمانوں پر رہتا ہے کچھ تدبیر کرو۔ اسے نیچے لاؤ کل کو یہ نہ ہو کہ اللہ نہ کرے ہمیں پچھتانا پڑے۔" وہ اندیشوں سے پر لہجے میں بولیں۔ شیخ صاحب پھر سے حقہ گڑگڑانے میں مصروف ہوگئے۔



مہمان کچھ دیر پہلے ہی آئے تھے۔ میرب نے لالی کے ساتھ اندر فریش پائن ایپل جوس بھجوا دیا تھا۔ مہ پارہ نے اسے صرف بادام کی فرنی تیار کرنے کا کہا تھا جو اس نے کر دی تھی۔ باقی سارا انتظام انہوں نے لالی کے ساتھ مل کر کر لیا تھا۔ اجیہ "نامعلوم وجوہات" کی بنا پر بگڑے تیور لیے گھوم رہی تھی۔ باقی سب ڈرائنگ روم ہی میں تھے۔ وہ بھی سر پر دوپٹا جما کر وہیں چلی آئی۔

"صد شکر تم نے اپنی شکل تو دکھائی۔" جوں ہی وہ ماریہ کے قریب بیٹھی اس نے کچھ ناراضی سے کہا۔ تو وہ ہنس دی۔

"چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی ہیں ہمیں بھی بتاؤ۔" ان کے ساتھ ہی ٹوسیٹر پر سعد اور عاشر تھے۔ یہ سوال سعد کی طرف سے آیا تھا۔

اچانک ہی میرب کے لب بھنچے تھے کہ سیدھے ہاتھ پر موجود صوفے پر سائر بیٹھا اس کی جانب سنجیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا لگتا ہے میرب نے کوئی بھوت دیکھ لیا شاید۔" وہ اپنے مخصوص شریر انداز میں بولا۔

"ہاں تمہیں دیکھ لیا ہے نا۔" ماریہ نے مزے سے کہا۔

"حالانکہ اس کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔" عاشر

نے اس کی "اسموکی آئیز" پر چوٹ کی۔

"یہ اشارے وشارے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ سیدھی سادی گفتگو ہی پلے پڑتی ہے۔" وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

"اشارے بوجھنا تو میرب کا کام ہے اور لگتا ہے اس نے بوجھ لیا ہے۔" سعد ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"نہیں بوجھ پائی تب ہی گم صم بیٹھی ہے۔" عاشر ہنسا۔

"جی نہیں یہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر "کسی کو" امپریس کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" سعد نے "کسی" پر زور دے کر کہا۔

"اپنی اپنی چونچیں بند کرکے سائر بھائی کے پاس جاکر بیٹھو۔ چلو شکو یہاں سے۔" ماریہ نے دونوں کو جھاڑا' میرب کا کھویا کھویا انداز وہ بھی نوٹ کر رہی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میرب کہیں کھوئی ہوئی ہرگز نہیں تھی بلکہ محتاط سی بیٹھی تھی کہ جانتی تھی کہ سائر کی نظروں کے حصار میں ہے۔ دوسری طرف ابراہیم صاحب' وقار صاحب سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے عاشر کے ساتھ انگلینڈ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے' کچھ عرصہ اس کے پاس رہوں گا پھر واپسی ہوگی۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ بیٹی بیاہنے کے بعد تو آپ یوں بھی خود کو تنہا محسوس کر رہے ہوں گے۔" وقار نے ان کے فیصلے کی تائید کی۔

"نہیں بھئی... ماشاء اللہ ماریہ بیٹی اور سعد مجھے فی الحال تو تنہائی محسوس نہیں کرنے دے رہے مگر کب تک۔ ان بچوں کی بھی اپنی مصروفیات ہیں پھر عاشر کا بھی اصرار ہے بس اسی لیے ہمت پکڑ ہی لی میں نے۔" وہ بتانے لگے۔

"سعد کے والد نہیں آئے؟" مہ پارہ نے سعدیہ سے پوچھا۔

"بس ان کی کچھ طبیعت ناساز تھی اسی لیے نہیں آسکے۔" وہ بولیں۔

"بھائی صاحب کے جانے کے بعد تو میرب بالکل اکیلی پڑ جائے گی۔" مہ پارہ بولیں۔

"ارے ایسے کیسے۔" وہ برا مان کر بولیں۔ "میرب میری بیٹی ہے۔ میرا گھر اس کا میکہ ہے۔ وہ جب چاہے آئے' ہم بھی خبرگیری کرتے رہیں گے۔"

"سچ سعدیہ! آج کل آپ جیسے پرخلوص لوگ ناپید ہیں۔" وہ ستائشی لہجے میں بولیں۔

"آپ خوامخواہ شرمندہ کر رہی ہیں۔ انسان کا دوسرے انسان پر اتنا تو حق ہے ہی۔" وہ انکساری سے بولیں۔

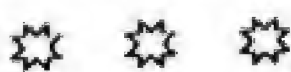
تب ہی ابجیہ نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی' ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان کھانا کھایا گیا مگر ایک بات جو ماریہ نے شدت سے محسوس کی وہ میرب کا پہلے کی نسبت خاموشی اور الجھا ہوا ہونا تھا۔ بہرحال ڈنر کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ لالی دعوت کا بکھیڑا سمیٹنے لگی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں صرف نائٹ بلب روشن تھا اور وہ کمبل تانے کروٹ لیے غالباً" سوچکا تھا یا جاگ رہا تھا' میرب اندازہ نہ کرسکی۔

ایک عجیب سی تھکن نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کرلیا تھا۔ وہ اسی اندھیرے میں بیڈ پر بیٹھ کر اپنی چوڑیاں' جیولری وغیرہ اتارنے لگی۔

"تم آج کے بعد اپنے پڑوسیوں کے گھر نہیں جاؤگی۔" کچھ دیر بعد سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ چوڑیاں اتارتے اتارتے اس کے ہاتھ ایک لحظہ کو تھم سے گئے۔

"سنا تم نے؟" وہی درشت آواز پھر سنائی دی۔

"سن لیا۔" کہنے کو اس نے کہہ دیا مگر نامعلوم کیوں اس کے آنسو تواتر سے گالوں پر بہنے لگے تھے۔



"اچھا بچوں... کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا اپنی خالہ کو... ان شاء اللہ جیسے ہی موقع ملا دوبارہ پاکستان کا چکر لگاؤں گی اور سائر تم میری بیٹی کا بہت

خیال رکھنا' بہت پیاری بچی ہے یہ۔۔۔ اچھا بھائی صاحب! خدا حافظ۔" مہ پارہ ایئر پورٹ کے لیے نکل رہی تھیں۔ سائر انہیں ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ سب سے مل ملا کر وہ رخصت ہوئیں۔

"بڑا احسان کیا مہ پارہ نے؟ بے چاری اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنے دن یہاں ٹھہری رہی۔" وقار صاحب لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ اجیہ پہلے ہی اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

"جی بابا' بہت ہی نائس خاتون ہیں خالہ جان۔ میں انہیں بہت مس کروں گی۔" میرب افسردگی سے بولی۔ تب ہی لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سی ایل آئی پر میرب کے گھر کا نمبر چمک رہا تھا اس نے لپک کر فون اٹھایا۔

"بیٹا کیسی ہو؟" علیک سلیک کے بعد اس کے بابا نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں بابا جان۔"

"بیٹا پرسوں ہماری فلائٹ ہے اگر مناسب سمجھو تو یہ دو دن ہمارے ساتھ گزار لو۔" وہ ملائمت سے بولے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔

"لیں بابا سے بات کریں۔" اس نے فون وقار کو تھمایا۔ ابراہیم صاحب نے سلام دعا کے بعد اپنا مدعا دہرایا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو ابراہیم۔۔۔ ارے بھئی بیٹی ہے میری۔ میرب ٹھیک ہے تم بھیج دو اس کے بھائی کو' میں اسے تیاری کا کہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"بیٹا۔۔۔ دو دن اپنے باپ کے پاس رہ آؤ۔ تمہیں یاد کر رہا ہے ابراہیم۔" وہ پر شفقت لہجے میں بولے۔

"میں سائر کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکوں گی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"خوب بھئی' بہت اچھی بات ہے۔" وہ جیسے اس کی تابعداری پر خوش ہو کر بولے۔

"مگر بیٹا! سائر کو ایئر پورٹ سے آنے میں کچھ دیر تو بہر حال لگ ہی سکتی ہے اور پھر گھر لوٹ کر کیا معلوم وہ تمہیں لے جاسکے یا نہ لے جاسکے۔ صرف کل کا دن ہی تو ہے درمیان میں' پرسوں تو فلائٹ ہے ابراہیم کی۔ ابھی چلی جاؤ تو اچھا ہے پورا دن ابراہیم اور اپنے بھائی کے ساتھ گزار لو گی' ٹھیک ہے نا بھئی۔" وہ اسے تائید طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"مگر سائر کی اجازت' میں ان ہی کے ساتھ جاؤں گی۔" وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ وہ ہنس دیے۔

"ارے بھئی! سائر کا باپ اجازت دے رہا ہے نا تمہیں پھر تم کیوں فکر کرتی ہو۔ جاؤ بیٹا تیاری کرو تمہارا بھائی آتا ہی ہوگا تمہیں لینے۔ یوں کرنا سائر کو کال کرلینا۔ اب جاؤ دیر ہو رہی ہے۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ٹی وی آن کرلیا۔

کچھ دیر تو وہ یونہی عالم تذبذب میں کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر اپنے کمرے کی جانب چل دی۔



"کیوں کیا ہے فون؟" آغا نے شدید ناراض لہجے میں استفسار کیا وہ اس وقت کہیں باہر نکلنے کے لیے تیار ہو رہا تھا تب ہی اجیہ کی کال موصول ہوئی۔

"تم نے نہیں کیا دو دن سے تو میں نے کرلیا۔" وہ اطمینان سے بولی۔ وہ حسب معمول اپنے کمرے میں بند تھی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں اس مہربانی کی وجہ۔" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔ اور شیشے میں دکھائی دیتے اپنے عکس پر ناقدانہ نگاہ ڈالی۔

"کبھی کبھی مہربان ہونے میں کچھ حرج نہیں ہوتا۔" وہ اسے تنگ کر رہی تھی بات دراصل یہ تھی کہ اس دن اچانک ہی ملاقات کا پروگرام کینسل کرنا پڑا تھا بس تب ہی سے نہ اس نے اجیہ کو کال کی تھی نہ کوئی میسج وغیرہ۔۔۔

"مجھے تمہاری بھیک میں ملی ہوئی مہربانی نہیں

چاہیے بہتر ہے اپنے پاس رکھو۔" وہ رکھائی سے بولا۔ اب وہ سائیڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی موبائل وغیرہ اٹھا رہا تھا۔

"آغا اگر تم نے مجھ سے ایسے ہی روڈ بات کرنی ہے تب میں فون رکھ رہی ہوں' میرا اچھا خاصا موڈ اسپائل کررہے ہو تم۔" وہ بھی ناراضی سے بولی۔

"اور تم نے جو اس دن ملاقات کا پروگرام بنا کر اچانک منع کردیا' میرا موڈ بھی ایسے ہی اسپائل ہوا تھا۔" اس نے جتایا۔

"مجبوری ہوگئی تھی' بتایا تھا نا تمہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"پھر اب کب مل رہی ہو؟" وہ اپنے کمرے سے باہر آتا ہوا ایک دم بولا۔

"کل۔۔۔ تم شینا کو بھیج دینا۔" وہ بولی۔

"اس بار پروگرام ڈن ہے یا ابھی بھی اس کے درہم برہم ہونے کے چانسز ہیں؟" وہ جیسے چڑ کر بولا۔ اور اپنے گھر کا لمبا لاؤنج عبور کرکے گارڈن میں نکل آیا۔

"نہیں' پروگرام ہے بالکل۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

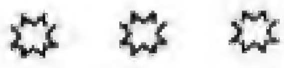
"او کے' پھر کل ملتے ہیں۔" اس نے کہا اور الوداع کہہ کر فون رکھ دیا۔ اجیہ نے ایک آسودہ سانس اپنے لبوں سے خارج کی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی وہ چونک گئی۔ لالی تھی۔

"چھوٹی بی بی۔۔۔ بڑی بی بی جارہی ہیں اپنے گھر۔ صاحب کہہ رہے ہیں انہیں الوداع کہہ دیں۔" وہ کہہ کر مڑ گئی۔ اجیہ لاؤنج میں چلی آئی۔

"اچھا اجیہ۔۔۔ اللہ حافظ" میرب نے گلے لگ کر اسے کہا۔

"او کے۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ ہمیشہ سے زیادہ روشن اور تابناک تھی۔ میرب کو لینے آئے عاشر کی نگاہیں چکا چوند ہوگئیں۔

"او کے انکل زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ او کے اجیہ۔" اس نے وقار صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے بھی خوش دلی سے او کے کہہ دیا اور یوں عاشر اس کے روپ کا ایک اور انداز آنکھوں میں سموئے گھر لوٹ آیا۔



گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج میں مینا بازار اور ڈرامہ فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا تھا۔ لڑکیوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر لڑکی اپنی جگہ بہت پرجوش اور خوش تھی۔ مگر چندا کی تیاریوں کی تو بات ہی اور تھی اسے ایک ڈرامے میں قلوپطرہ کا کردار جو ادا کرنا تھا۔ اسے اپنے کپڑے' زیورات' میک اپ وغیرہ کی بڑی فکر ہورہی تھی۔ کالج میں دیگر ساتھی لڑکیوں کے ساتھ پریکٹس ہورہی تھی اور اس ریہرسل نے اس وقت مزید سنجیدگی اختیار کرلی' جب لڑکیوں نے سنا کہ ان کا ڈرامہ دیکھنے ملک کے ایک نامور و مشہور ڈائریکٹر بھی بطور مہمان خصوصی تشریف لارہے ہیں جن لڑکیوں کو اداکاری کا شوق تھا وہ اپنے ہتھیار تیز کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہوگئیں۔ چندا کو اداکاری کا شوق تھا یا نہیں ہاں۔۔۔ مگر اسے یہ شوق ضرور تھا کہ اس کا چہرہ بھی ان چہروں میں سے ہو' جنہیں روبرو دیکھنے کے لیے ایک خلقت تڑپا کرتی ہے۔ اور یہی شوق آگے کیا رنگ اختیار کرنے والا تھا یہ تو خود چندا بھی نہیں جانتی تھی۔



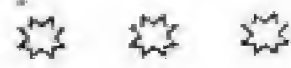
"کیا بات ہے۔ میرب! میں نے اس دن محسوس کیا تھا کہ تم کچھ پریشان سی رہنے لگی ہو تم ٹھیک تو ہو۔" ماریہ نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے دفعتاً پوچھا۔

"کیوں۔ مجھے کیا ہوا۔" میرب چونک کر بولی۔ وہ دونوں اس وقت گھر کی چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ ابراہیم صاحب آرام کرنے چلے گئے تھے۔ عاشر' اور سعد کچھ شاپنگ کرنے گئے ہوئے تھے۔

"میں نے محسوس کیا ہے۔ اسی لیے پوچھ رہی ہوں تم کچھ بجھی بجھی سی لگنے لگی ہو۔ جب تم پچھلی بار یہاں آئی تھیں تب تک تو ٹھیک تھیں۔" ماریہ نے پیکٹ کھول کر اس میں سے نمکین مونگ پھلیاں

پھانکتے ہوئے کہا۔
"نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میرب نے تردید کی "مگر تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوا۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے اسے دیکھنے لگی۔
"چلو، تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔ ذرا ایک بات تو بتاؤ اس نے مونگ پھلیوں کا پیکٹ اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔" یہ سائر بھائی ہمیشہ اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں۔ ہنسنے والی بات پر تو بندہ ہنس لیتا ہے، میں نے تو انہیں اس سچویشن میں بھی بے زار ہی دیکھا ہے۔ تم سے کچھ باتیں واتیں کرتے ہیں یا یوں ہی خاموش رہتے ہیں۔" ماریہ نے اب اسے دوسری جانب سے کریدنے کی کوشش کی۔
"دراصل وہ کم گو ہیں۔ مگر یہ کوئی عیب تو نہیں۔" وہ مدافعانہ لہجے میں بولی۔
"نہیں، نہ ہی کم گوئی کوئی عیب ہے، نہ ہی سنجیدگی مگر کچھ تو ہے جو اس بندے میں مسنگ ہے۔" وہ پرسوچ لہجے میں بولی۔
"بہتر ہے کہ تم اپنے انجینیئر صاحب پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔ سائر پر توجہ دینے کے لیے میں کافی ہوں۔" وہ دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی، مگر درحقیقت وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔ ان کا نیا تعلق تھا، اگر ابھی سے لوگوں پر سب کچھ آشکار ہونے لگا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو ان کا تعلق انڈر اسٹینڈنگ کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ اور نجانے کتنے مراحل مزید باقی تھے۔ وہ تو شاید ابھی سے تھکنے لگی تھی۔ تب ہی تو اس کے تاثرات دوسروں پر عیاں ہونے لگے تھے۔
"منہ دھو رکھو مجھے کوئی شوق نہیں ان پر توجہ دینے کا۔" وہ چڑ گئی۔
تب ہی عاشر کی گاڑی پورٹیکو میں آکر رکی۔ اور اس میں سے مسکراتے ہوئے شاپنگ بیگز تھامے عاشر اور سعد برآمد ہوئے۔
"چلو نیچے چل کر ان کی شاپنگ دیکھیں۔" ماریہ نے کہا۔
"تم جاؤ مجھے ذرا سائر کو کال کرنی ہے۔" اس نے ٹالا۔
"کم آن یار۔ کل فلائٹ ہے عاشر کی۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ آج کی رات اپنی بچپن کی یادوں کو تازہ کریں گے۔ کیرم کھیلیں گے۔ گپ شپ کریں گے اور تم ہو کہ آج بھی ان ہی "مزاجی خدا" سے باتیں کرنے کو مچل رہی ہو۔" اس نے برہمی سے کہا۔
"تم چلو تو میں آتی ہوں۔" اس نے زور دے کر کہا۔ وہ تاسف سے سرہلا کر نیچے اتر گئی۔
اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنا چاہا۔ اور ایک مرتبہ پھر سائر کو کال ملانے لگی۔ بیل جا رہی تھی مگر وہ فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
اس نے تھک کر فون کان سے ہٹا دیا۔ اور اسے میسج کرنے لگی کہ کن حالات میں وہ یہاں آئی ہے اور یہ بھی کہ اس کا فون ریسیو کرے۔ یا خود اسے فون کرے۔ فون اس نے چھت پر رکھی کین کی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور خود لایعنی سوچوں میں گھری سامنے دکھائی دیتے لان میں جھانکنے لگی۔ تب ہی میسج کی بپ ہوئی۔ وہ تیزی سے فون تک آئی۔
"ہم کافی پر تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔ باتیں ہو چکی ہوں تو فوراً" نیچے آجاؤ۔" ٹیکسٹ ماریہ کا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔
کچھ دیر وہ یوں ہی گم صم رہی پھر چاروناچار نیچے اتر آئی۔ جہاں وہ تینوں انہماک سے کیرم کی بازی جمائے بیٹھے تھے۔
"بڑی جلدی آگئیں۔" اسے دیکھ کر ماریہ طنزیہ بولی۔
"آجاؤ میرو قسم سے وہ وہ شارٹ کھیل رہا ہوں کہ خود مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی ہے۔" سعد نے چہکتے ہوئے کہا۔
"میرے دوست انہیں دھپل شاٹس کہتے ہیں۔ آپ کی حیرت کچھ ایسی بھی بے جا نہیں۔" عاشر تپ کر بولا۔
"آؤ بیٹھو۔" ماریہ نے اپنے نزدیک جگہ بنائی۔
"نہیں تم لوگ بیٹھو۔ میرے سر میں درد ہے

سووں گی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی تو ایک پل کے لیے سب ہی نے اسے حیرت سے دیکھا۔
"چلو کوئی بات نہیں، جاؤ سو جاؤ۔" اس کی اتری صورت نے اس کی کہی بات کا بھرم رکھ لیا تھا تب ہی عاشر نرمی سے بولا۔
"ہاں ہاں تم جاؤ، اس کے لیے تو میں ہی کافی ہوں۔" سعد شیخی سے بولا۔ مگر ماریہ کچھ نہیں بولی۔ حالانکہ صرف وہی تھی جس کے پاس بولنے کے لیے بہت کچھ تھا۔



"وہ تو جانا نہیں چاہ رہی تھی میں نے ہی اسے زبردستی بھیج دیا، کہہ رہی تھی سائرے اجازت لے کر جاؤں گی۔ بہت تابعدار اور فرمانبردار بچی ہے۔ بہت خوش نصیب ہو تم سائر! ماشاءاللہ۔ ایسا ہے کہ تم اسے فون کرلینا تاکہ وہ کسی پریشانی کا شکار نہ ہو جائے۔" وہ ماہ پارہ کو ڈراپ کر کے گھر آیا تو یہاں یہ خبر منتظر تھی۔ وہ جو صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ریلیکس بیٹھا ہوا تھا ان کی بات پر چونک کر سیدھا ہوا۔
"کب گئی؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
"کچھ ہی دیر گزری ہے۔" انہوں نے بتایا۔
"اوکے۔" وہ کہہ کر اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا فون رنگ ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا میرب کا تھا۔ اس کے جبڑے یکدم بھینچ گئے اور اس نے فون بنا آف کیے ہی بیڈ پر اچھال دیا۔
عورت اور اس کے مکر، بابا کو اپنی ڈھال بنا رہی ہو میرب۔ بہت غلط کر رہی ہو۔ بہت ہی غلط۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔



ساری تیاری وہ پہلے ہی مکمل کر چکی تھی۔ مگر وقار صاحب سے اجازت لینے کا مسئلہ اب بھی درپیش تھا۔ دوپہر اب ڈھل رہی تھی۔ وقار صاحب آرام کرنے کے بعد اب اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں چلے آئے تھے اور لالی کو چائے کا کہنے کے بعد اب صوفے پر براجمان چینل سرچنگ میں مصروف تھے۔ تب ہی اجیہ نے موقع غنیمت جانا اور ان کے پاس چلی آئی۔
"بابا۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ" اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔ زندگی میں انسان بہانہ بازی کرتے ہوئے پہلی دفعہ اٹکتا ہے۔ اس کے بعد رواں ہو جاتا ہے۔ یہ اسے کھیل سا محسوس ہونے لگتا ہے۔
"ہاں بولو۔ کوئی پرابلم ہے۔ پیسے چاہئیں۔" انہوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا جو کہنے اور نہ کہہ پانے کی متضاد کیفیت کے زیر اثر تھی۔
"میری فرینڈ شینا ہے نا۔ اس کے گھر شام میں گیٹ ٹوگیدر ہے۔ مجھے بھی انوائٹ کیا ہے اس نے، ان فیکٹ مجھے لینے آرہی ہے۔ میں جاؤں۔" اس نے تمام تر ہمت مجتمع کر کے کہہ ہی دیا۔ شینا کے نام پر بابا کے تاثرات تیزی سے بگڑے تھے۔
"کس قسم کی گیٹ ٹوگیدر۔" انہوں نے خشک لہجے میں استفسار کیا۔
"ایسے ہی۔" اس کا حلق خشک ہونے لگا۔
"بھلا یہ کون سا طریقہ ہے اجازت لینے کا۔ شام میں پارٹی ہے۔ تم ایک گھنٹہ قبل بتا رہی ہو۔ اسے اجازت طلب کرنا نہیں مطلع کرنا کہتے ہیں۔" وہ ناگوار لہجے میں بولے۔
"بابا۔ آج تک میں اس کے گھر نہیں گئی۔ آج موقع تھا تو سوچا کہ" اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوف بھی لاحق تھا کہ اگر انہوں نے نہ جانے دیا تو۔
"آج تک گھر نہیں گئیں تو کیا ہوا۔ وہ محترمہ تو آئے دن یہیں پائی جاتی ہیں۔ پھر کوئی تقریب ہوتی تو اور بات تھی۔ یہ گیٹ ٹوگیدر میں شرکت کرنا کوئی ضروری تو نہیں۔" انہوں نے دو ٹوک لہجے میں گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کے آنسو یکدم ہی بہنے لگے۔
"میری کوئی بہن نہیں۔ ہمارا کوئی رشتے دار نہیں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے، کہیں جاؤں! دوست بناؤں تو آپ لوگ خفا ہو جاتے ہیں۔ بتائیں میں کیا کروں۔" وہ اپنا سر تھام کر روتی ہوئی سامنے صوفے پر ٹک گئی۔

وقار اس کے یوں رونے پر بے چین سے ہو گئے۔
لالی جو چائے رکھنے آئی تھی۔ فکر مندی سے اجیہ کو دیکھنے لگی۔

"لالی۔ ذرا پانی لے کر آؤ۔" وقار صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ پلٹ گئی۔

"اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔ شاباش خاموش ہو جاؤ۔" انہوں نے نرم روی سے اسے پچکارا۔ انہیں نرم پڑتا دیکھ کر وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

"لو پیو پانی۔ لالی بیٹا دو اجیہ کو گلاس۔" لالی پانی لے آئی تھی انہوں نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی اسے کہا۔ درحقیقت اس کے رونے سے انہیں بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بچوں نے ایک محروم زندگی گزاری ہے۔ مگر مجبور تھے' زندگی کبھی کبھار آپ کو اس زاویے سے پٹختی ہے کہ دوبارہ اٹھنا ناممکن میں سے لگنے لگتا ہے۔

"نہیں پینا مجھے پانی۔" اس نے لالی کا ہاتھ پرے کیا۔

"پانی پیو اور جا کر تیار ہو جاؤ۔ تمہاری سہیلی تمہیں لینے آئی ہی ہوگی۔" انہوں نے دانستہ خوش دلی سے کہا۔

"سچ بابا۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

"ہاں جاؤ مگر جلدی آجانا۔ کتنے بجے بھیجوں سائر کو۔" وہ اب ایک مرتبہ پھر ٹی وی پر مصروف ہو گئے۔

"سائر بھائی کو۔ دس گیارہ بجے تک۔" پہلے تو اس نے سائر کو منع کرنا چاہا مگر آج ہی سارے مطالبات منظور نہیں ہو جانے تھے اسی لیے واپسی کا وقت بتا دینا اس نے مناسب سمجھا۔ اور جلدی سے اٹھ کر کمرے میں چلی آئی' مبادا وقار کوئی اور سوال کر بیٹھیں۔ وقار نے اس کے کھلکھلاتے وجود کو طمانیت سے دیکھا۔

"چلو کیا حرج ہے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بچی۔ جاتی ہی کہاں ہے۔" وہ چائے لبوں سے لگا کر خبریں سننے بیٹھ گئے۔



"میری بیٹی اداس ہو رہی ہے۔" ابراہیم آرام کرسی پر بیٹھے تھے جبکہ میرب نے اپنا سر ان کے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

"جی بابا۔ یہ آپ کو یکایک ہی عاشر کے ساتھ جانے کی کیا سوجھی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"بیٹا۔ اس کا ذہن مجھ میں ہی اٹکا رہتا اب تو۔ ایسے میں اس کی کام میں یکسوئی متاثر ہوتی۔ اب میں اس کے سامنے رہوں گا تو اسے تسلی رہے گی۔" وہ نرمی سے اس کا سر سہلا کر بولے۔

"اور میں۔ میرا نہیں سوچا آپ نے کہ میں آپ کو کتنا مس کروں گی۔" وہ گردن اٹھا کر انہیں ناراض نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"مس تو میں بھی کروں گا بچے۔" ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مگر تم سے زیادہ اب عاشر کو میری ضرورت ہے۔ تمہاری تنہائی اور میری فکر اب ختم ہو چکی ہے۔ مگر عاشر تو ابھی تنہا ہے نا۔ اس کی تنہائی بانٹنا بھی تو ضروری ہے۔" وہ متانت سے بولے۔

میری تنہائی شاید ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور بڑھ گئی ہے بابا۔ وہ سوچنے لگی۔

"کہاں کھو گئیں۔ بھئی تم تو میرے جگر کا ٹکڑا ہو جو میں نے بڑے مان کے ساتھ وقار کو سونپا ہے۔ اس امید پر کہ وہ تمہارا بالکل اسی طرح خیال رکھے گا جیسا کہ میں رکھا کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وقار واقعی تمہیں بہت پیار اور اہمیت دیتا ہے' کیوں؟" وہ اس سے پوچھنے لگے۔

"جی بابا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ واقعی اس میں شک نہیں تھا۔ مگر جس کے حوالے سے وہ اس گھر میں گئی تھی کیا اسے بھی اس کا خیال ہے۔ وہ پھر سے سوچنے لگی۔

"اب تم اس طرح اداس ہو گی تو میرا دل تو یہیں رہ جائے گا بھئی۔" وہ کہنے لگے "ہم اسکائپ پہ بات کریں گے۔ میں تمہیں فون کرتا رہوں گا۔ اور پھر ایک سال کی تو بات ہے۔ عاشر کا کنٹریکٹ ختم ہوتے ہی ہم واپس لوٹ آئیں گے۔" وہ اسے تسلیاں دیتے رہے۔

"پرامس کریں مجھ سے روز بات کریں گے۔" میرب نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ وہ ہنس دیے۔

"بھئی پرامس۔ اور ہاں' ماریہ کا گھر اب تمہارا میکا ہے' تمہارا جب دل چاہے یہاں آکر رہنا' ملنا۔ کیونکہ یہ گھر تو میں کرائے پر چڑھوا رہا ہوں یوں بھی خالی ہی پڑا رہنا ہے اس نے۔ ٹھیک' اب جاکر عاشر کو دیکھو۔ اس کے کام ختم ہوئے یا نہیں۔ یہ نہ ہو کہ فلائٹ نکل جائے۔ اس کی پنکچو ئیلٹی سے تو تم واقف ہو نا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"جی بابا!" وہ اٹھ گئی۔

سارے گھر کا سامان طریقے سے دو کمروں میں منتقل کردیا گیا تھا۔ ان کمروں کو مقفل کرکے چابیاں سعدیہ بیگم کے حوالے کردی گئی تھیں۔ خالی خالی گھر دیکھ کر اس کا دل بھی خالی ہونے لگا۔

اور بابا نے کیا کہا' ماریہ کا گھر میرا میکا ہے اب۔ آپ نہیں جانتے بابا زندگی بہت پیچیدہ ہوگئی ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ ان پیچیدگیوں کو میں کیسے آسان بناؤں گی۔ وہ سوچ گئی۔



مقررہ وقت پر شمینا اسے لینے آچکی تھی۔ وہ سرخ اور سیاہ جدید تراش خراش کے خوب صورت سوٹ میں ہمیشہ کی طرح بہت' بلکہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ ایک انوکھی سی چمک نے اس کے دلکش وجود کا احاطہ کر رکھا تھا تب ہی اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ثینا نے اک ستائشی سیٹی سے اس کا استقبال کیا۔

"واؤ۔ آج تو پہچانی نہیں جارہیں تم۔" اس نے گاڑی زن سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو۔" وہ نجانے کیوں آج شمینا کے سامنے جھینپ رہی تھی۔

"نہیں بلیومی۔ آج تو آغا پاگل ہونے والا ہے۔ خیر وہ تو پہلے ہی سے تمہیں دیکھ کر پاگل ہوچکا ہے۔" وہ بولی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں۔" اس نے ثینا کا تبصرہ نظر انداز کرکے پوچھا۔

"یار۔ گھر ہی جارہے ہیں' وہیں ویٹ کررہا ہے وہ تمہارا۔" اس نے بتایا۔ وہ بہت تیز ڈرائیو کررہی تھی۔

"گھر۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "مگر میں گھر میں اس سے کیسے ملوں گی۔"

"کم آن۔ وہاں سے وہ تمہیں کہیں لے جانے والا ہے۔" وہ مسکرائی۔ یوں ہی ادھر ادھر کی باتوں میں اس کا گھر آگیا۔ جہاں آغا پہلے ہی اپنی بلیک بی ایم ڈبلیو میں اس کا منتظر تھا۔ وہ گاڑی سے اتری۔ شمینا زن سے گاڑی دوبارہ بھگالے گئی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھی۔

"زہے نصیب" وہ اس کے بیٹھتے ہی شوخی سے بھرپور آواز میں بولا۔ اجیہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس کا اعتماد زائل ہونے لگا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"کچھ بولو بھی۔ فون پر تو خاصی گفتگو کرلیتی ہو۔" وہ پھر بولا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ آغا کے وجود سے پھوٹتی مہنگے کولون کی خوشبو اس کے حواس مختل کیے ہوئے تھی۔

"چپ بیٹھنے کے لیے آئی ہو تو بہت غلط کیا ہے۔ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔" وہ بولا۔

"نہیں تم بات کرو۔ میں سن رہی ہوں۔" وہ اپنے حواس کو مجتمع کرکے گویا منمنائی۔

"نہیں میں تمہیں سنوں گا' تم بولو۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"کیا بولوں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"یہی کہ میں کیسا لگا؟" وہ بہت خراماں خراماں ڈرائیو کررہا تھا۔

"تم' تم اچھے ہو۔" وہ کسی قدر اعتماد سے بولی۔

"محض اچھا؟" وہ مایوسی سے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ شاید یہ آتش عشق دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔"

"عشق وشق کا تو مجھے نہیں پتا مگر تم اچھے بندے ہو۔" وہ اب کی بار پختہ لہجے میں بولی۔

"چلو تم نے اچھا ہی سمجھ لیا اس ناچیز کو یہی بہت ہے۔" وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

"مگر جانِ زندگی۔ میں تم سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ اس جرم کی تم جو سزا تجویز کرو گی' مجھے قبول ہو گی۔" اور اجیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے اس مکالمے کا کیا جواب دے۔

"بھئی' یہ جو تم تھوڑی دیر بعد خاموش ہو جاتی ہو نا' یہ غلط ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"تمہارے عشق کا میں کیا جواب دوں؟" وہ نا سمجھی سے بولی۔

"بہت نادان ہو لڑکی۔ تمہیں تو بہت کچھ سکھانا پڑے گا۔" وہ جیسے تاسف سے بولا۔

"میں ایک اچھی شاگرد ثابت ہوں گی۔" وہ دلکشی سے مسکرائی۔

"خوب۔ حالات اتنے بھی برے نہیں۔" وہ محظوظ ہوا۔ پھر پوچھنے لگا۔

"کہاں چلنا ہے۔"

"جہاں تم لے چلو۔" اس نے گویا اجازت دی۔

"ہوں۔ جملہ خاصا خوش آئند ہے۔" وہ ذو معنی لہجے میں بولا۔ وہ مسکرا دی۔

اور اس کے سنگ سفر کرتے ہوئے۔ عہد و پیمان باندھتے ہوئے۔ ہر فکر کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے اجیہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ جملہ خوش آئند نہیں تھا۔ بالکل بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہاری بہن ہے نا' اللہ کی قسم بے حد حسین ہے۔"

مانو آڈیٹوریم میں ناظرین کی نشستوں پر اپنی دوستوں کے گروپ کے ساتھ براجمان تھی۔ آج ڈرامہ قلوپطرہ اسٹیج ہو رہا تھا۔ قلوپطرہ کا کردار چندا ادا کر رہی تھی۔ اداکاری تو خیر اس کی اوسط درجے کی تھی مگر اس کا حسن۔ آج اگر سینکڑوں لوگوں کے درمیان کوئی چہرہ جگمگا رہا تھا تو وہ اسی کا تھا۔ مانو کی سہیلیوں میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی یہ کمنٹ کر رہی تھی۔ کوئی متاثر ہو کر' کوئی رشک سے' کسی کا لہجہ حسد و جلن سے لبریز تھا' الغرض آج کی محفل بلاشبہ چندا نے تسخیر کر لی تھی۔

سب کی نگاہوں میں اس کے لیے واضح پسندیدگی تھی مگر کچھ "خاص" نگاہیں اسے کسی اور ہی زاویے سے جانچ رہی تھیں۔

قلوپطرہ۔ جو حسین اتنی نہیں تھی مگر وہ ساحرہ تھی۔ دیکھنے والی نگاہوں کو اس کے گرد ایک مقناطیسیت محسوس ہوتی۔ وہ ساحرہ تھی اور اس کے حسن کے چرچے کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تھے اور اسٹیج پر موجود یہ قلوپطرہ ساحرہ ہی نہیں تھی' بے تحاشا حسین بھی تھی۔ اور حسن و سحر کا یہ امتزاج کتنی صدیوں تک چرچوں میں رہنے والا تھا۔

اس کا اندازہ وہ دو نگاہیں لگا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"گھر چلو شام تک تمہیں' تمہارے سسرال ڈراپ کر دیں گے۔" سعد جو ڈرائیو کر رہا تھا۔ میرب کی اتری شکل دیکھ کر بولا۔ وہ لوگ اس وقت ایئرپورٹ سے واپس آ رہے تھے۔ عاشر اور ابراہیم جا چکے تھے اسے ڈھیروں نصیحتیں' تاکیدیں کر کے۔

"ہاں۔ ویسے بھی اس وقت صبح کے نو ہی تو بجے ہیں۔ آرام سے نیند پوری کر کے جانا تم اپنے گھر۔" ماریہ بھی دلجوئی کرنے والے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ مجھے میرے گھر ہی ڈراپ کر دو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کچھ گھنٹوں کی تو بات ہے۔ اس طرح اترا ہوا منہ لے جانا کیا اچھا لگے گا۔" ماریہ نے اپنائیت سے ڈپٹا۔

"پلیز ماریہ! ویسے ہی میرے سر میں درد ہے' اپنے گھر جا کر ہی آرام ملے گا۔" اس نے بے مروتی سے کہا۔ تو ماریہ چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر سعد نے بھی کوئی بات نہیں کی' خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میرب کا گھر آ گیا اور وہ اپنا چھوٹا سا کالا بیگ تھامے

گاڑی سے اتر آئی۔

"تھینک یو اور اللہ حافظ۔ اس وقت سب سوئے ہوئے ہوں گے، نہیں تو اندر آنے کے لیے کہتی۔" وہ ذرا سا جھک کر اندر جھانکتے ہوئے بولی۔

"شکریہ کی ہمیں ضرورت نہیں، البتہ تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ اب جاؤ اندر۔ ہمیں بھی گھر پہنچنا ہے۔" ماریہ نے اس کی بات کا ناراضی آمیز جواب دیا۔ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ کر گیٹ کی طرف چل دی جسے چوکیدار اس کے لیے وا کر چکا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی اندر داخل ہوئی گو کہ اس کا بیگ اتنا بھاری نہیں تھا مگر نیند کی کمی، گہری اداسی اور نامعلوم سی تھکن جو وہ خود پر طاری محسوس کر رہی تھی، ان سب نے مل کر اس کا وزن کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ تب ہی اس نے ایک جھٹکے سے بیگ پتھر کی روش پر رکھ دیا۔ چند ثانیے رک کر اس نے ایک لمبی سی سانس لی پھر بیگ کا ہینڈل تھامنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، کسی نے اس سے پہلے ہی اسے پکڑ کر اٹھا لیا تھا۔ وہ بے تحاشا چونک اٹھی۔ یہ سائر تھا۔ جو یقیناً" اس وقت جاگنگ سے واپس آیا تھا۔ وہ اس سے بنا کچھ کہے بیگ لیے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میرب کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ تاہم وہ بھی لان عبور کر کے گھر میں داخل ہوئی۔ اندر صبح کا مخصوص سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سائر اس کا بیگ صوفے پر رکھ کر شاور لینے جا چکا تھا۔ آنے والے وقت کے اندیشوں نے اس کا وجود لرزا رکھا تھا۔ سائر کے موڈ کا اندازہ وہ اچھی طرح لگا چکی تھی۔ تب ہی کچھ پریشان، کچھ گم صم سی وہ صوفے پر ٹک گئی۔ تب ہی تولیے سے بال رگڑتا، نکھرا نکھرا سائر باتھ روم سے برآمد ہوا۔

"سائر۔ مجھے بابا نے زبردستی بھیجا تھا۔ میں آپ سے پوچھ کر جانا چاہتی تھی مگر سچویشن کچھ ایسی ہو گئی کہ میں بابا کو انکار نہ کر سکی۔ پھر بابا جان اور عاشر کی فلائٹ بھی تھی۔ مجھے ان کے ساتھ بھی تو ٹائم اسپینڈ کرنا تھا نا۔ مگر میں نے آپ کو وہاں جاتے ہی کافی فون کیے مگر آپ نے ریسیو نہیں کیے، نہ ہی میرے کسی میسج کا جواب دیا۔ بابا بھی آپ کا پوچھ رہے تھے۔ بہت۔ ان سے تو آپ نے فون پر بات کر لی تھی مگر مجھے کال نہیں کیا۔" پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"تمہارے نزدیک میری کیا اہمیت ہے۔ وہ میں اچھی طرح جان گیا ہوں اس لیے بہتر ہو گا کہ تم مجھے ڈسٹرب کیے بغیر چپ چاپ سو جاؤ یا جو دل چاہے کرو۔" وہ بال سنوارتے سنوارتے یک دم مڑ کر زہر خند لہجے میں بولا۔

"آپ کی اہمیت کیسے نہیں ہو گی سائر! آپ میرے شوہر ہیں۔" وہ احتجاجاً" بولی۔

"مجھے تمہاری بکواس سے دلچسپی نہیں۔" اس نے میرب کا احتجاج چٹکیوں میں اڑا دیا۔

"آخر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے سائر! جو آپ مجھ سے شادی کے محض ڈیڑھ ماہ بعد ہی اتنا روڈلی بیہو کر رہے ہیں۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"اپنے آپ سے پوچھو۔" وہاں اطمینان کا وہی عالم تھا جب کہ اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ اور وہ یک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ جو بڑے مطمئن انداز میں اپنے بال سنوار رہا تھا چونک کر مڑا۔

"اوہ نو۔ یہ کیا بچپنا ہے؟" وہ اس کے نزدیک آکر ناگواری سے بولا۔ اس کے رونے میں کچھ اور شدت آگئی۔

"پلیز۔ خاموش ہو جاؤ۔" وہ پریشانی سے بولا۔ پھر روم فریج تک گیا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کے قریب آیا۔

"یہ لو پانی پیو۔ اور خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ مجھے کسی کو روتے دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔" وہ مضطرب تھا۔

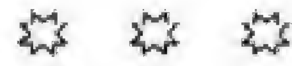
"نہیں چاہیے پانی۔" وہ بھی ضدی ہو گئی۔

"دیکھو۔ پانی پیو اور آرام کرو۔ اگر ناشتا کرنا ہے تو میں لالی سے کہہ دیتا ہوں۔" وہ اب ملائمت سے کہہ رہا تھا۔ اس نے گلاس تھام کر لبوں سے لگا لیا۔

"شکریہ میں سوؤں گی۔" وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

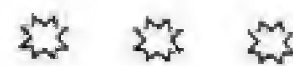
"اوکے، میں باہر جارہا ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔" وہ ہنوز نرم لہجے میں بولا۔ میرب نے لیٹ کر کمبل اپنے اوپر پھیلالیا۔ وہ اے سی کی کولنگ بڑھاتا ہوا روشنی بجھا کر باہر آگیا۔

کیا عجیب شخص ہے یہ پہلے رلاتا ہے پھر بہلاتا ہے۔ اس نے سونے سے قبل آخری بات یہی سوچی تھی۔



"کیا کروں۔ کیا کروں آخر۔" وہ اپنے نیم تاریک بوسیدہ فلیٹ میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھی تھی۔ اسے مری سے آئے ہوئے بھی ایک ہفتے سے زائد ہو چلا تھا۔ مگر نجانے کیا بات تھی جوں ہی وہ فون ملانے لگتی ایک دم ہی وحشت زدہ ہو کر کال بند کر دیتی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو وہ کسی معاملے میں اس قدر سوچ بچار سے کام لے رہی تھی۔ شاید سب کچھ لٹا کر جو آخری داؤ کھیلتے ہیں ان کی کیفیت یہی ہوتی ہو گی۔ امید و ناامیدی کے بین بین۔ ناامیدی سو فیصد۔ امید چند فیصد۔ ہارنے کی صورت میں کنگال ہو جانے کا امکان اس کی جان سولی پر اٹکائے ہوئے تھا۔ جبکہ ہارنے کے لیے اس کے پاس جان کے علاوہ شاید کچھ بچا بھی نہیں تھا مگر وہ یہ آخری داؤ کھیلنا چاہتی تھی۔ خود جیتنے کے لیے نہ سہی۔ کسی کو ہرانے کے لیے۔ بد ترین شکست دینے کے لیے بہترین حکمت عملی ضروری ہے۔

"مگر جب تک پہلا قدم نہیں اٹھاؤں گی، آگے کے راستے کا تعین کیونکر کر سکوں گی۔" اس نے اپنا مورال بلند کرنا چاہا۔ اسے کچھ ڈھارس ہوئی۔ اور ایک مرتبہ پھر فون ہاتھ میں تھام لیا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔



"ہیلو۔ کیا میں آصف شیرازی سے بات کر سکتی ہوں؟" چندا دوپٹا اچھی طرح سر پر جمائے فون پکڑے کھڑی تھی۔ یہ کالج سے چھٹی کا وقت تھا۔ اس سے قبل کہ مانو آجاتی، اسے یہ اہم کال کرنی ہی تھی۔ وہ اس وقت کالج کے سامنے بنی فوٹو اسٹیٹ شاپ کے پی سی او پر موجود تھی۔

آصف شیرازی... ملک کے نامور ڈائریکٹر شکیل احمد ملک کے گروپ کا ایک ورکر تھا، کام نئے ٹیلنٹ کو احمد ملک تک لانا تھا۔ آصف شیرازی کی گھاگ نگاہوں نے چندا کے قیامت خیز حسن کو تاڑ لیا تھا پھر اداکاری بھی وہ اچھی نہیں تو بری بھی نہیں کر رہی تھی۔ اسی لیے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس نے چندا کو دے کر کال کرنے کو کہا تھا اور چندا پر تو گویا شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"آپ کون؟" وہاں سے آپریٹر کی شیریں و ملائم آواز سنائی دی۔

"میں... آپ ان سے کہیں کہ کالج فنکشن میں انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا تھا۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ویٹ کیجیے۔" فون ہولڈ کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو..." وہ بے تابی سے بولی۔

"ہیلو... جی کون؟" وہاں سے کچھ دیر بعد اجنبی لہجے میں استفسار کیا گیا۔ اسے کچھ سبکی سی محسوس ہوئی۔

"بھول گئے آپ... آپ ہی نے تو مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا۔" اس نے یاد دلایا۔ اس کی نظریں کالج کے گیٹ کا بھی احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

"اوہ... اچھا اچھا آپ، بھئی کہیے کیسے یاد کیا۔" یک دم ہی خوش دلی سے پوچھا گیا۔

"آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں اگر انٹرسٹڈ ہوں تو آپ مجھے ٹی وی پر کام دلا سکتے ہیں۔" وہ وقت ضائع کیے بغیر بولی۔

"جی کیوں نہیں، بالکل دلا سکتے ہیں۔" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"تو میں کیا کروں اس کے لیے، میرا مطلب ہے کہ کہاں آؤں؟" وہ پوچھنے لگی۔

"دیکھیے ڈائریکٹ ٹی وی اسٹیشن آئیں گی تو شاید

آپ کا کام نہ بنے۔ ایسا ہے کہ پہلے آپ مجھ سے کہیں ملاقات کرلیں۔ میں آپ کو دیگر باتیں جو اس فیلڈ کے لیے ضروری ہیں، سمجھا دوں گا اس طرح آپ کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"کہاں ملنا ہوگا۔" وہ بہ عجلت بولی۔

"جہاں آپ کے لیے سہولت ہو۔" بندہ بہت سمجھ دار تھا۔

"کل ہی مل لیں... کالج ٹائم میں، میں آجاؤں گی نیشنل پارک میں۔" وہ بولی۔

"نیشنل پارک تو کافی بڑا ہے، وہاں کہاں کہاں ڈھونڈوں گا میں آپ کو۔" وہ کچھ پریشانی سے بولا۔

"کینٹین کی طرف آجایئے گا، ٹھیک نو بجے۔"

"چلیں، ٹھیک ہے۔ پھر کل انتظار رہے گا آپ کا۔" وہ بولا۔

"ہاں... ہاں او کے۔" اس نے کہہ کر کھٹ سے فون رکھ دیا۔ تب ہی گیٹ سے باہر مانو یہاں وہاں متلاشی نگاہوں سے دیکھتی نظر آئی۔

"چلو..." وہ اس کے قریب آکر پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

"کہاں تھیں تم... اتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ تھکتی نہیں ہو تم دوستوں سے باتیں بگھار بگھار کے۔" چندا نے مانو کو ڈپٹا۔ وہ ہونق بنی اس کی شکل دیکھے گئی۔

"مگر تمہیں تو میں کب سے اندر تلاش کر رہی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ہی باہر آتے ہیں نا۔"

"تمہیں بھی میں نے اندر تلاش کیا تھا۔ تم کہاں تھیں۔" وہ اسے جھاڑ کر بولی۔

"میں تو کچھ دیر پہلے ہی اپنی کلاس سے نکلی ہوں۔" وہ صفائی دینے والے لہجے میں بولی۔

"بس بس... گھر چلو بہت گرمی ہے آج۔" وہ ڈپٹ کر بولی تو مانو کندھے اچکا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ چندا کی آنکھوں میں چمک تھی اور چال میں مستی مگر یہ باتیں مانو محسوس نہ کر سکی۔



اوفوہ! کتنی بے ترتیبی پھیلا رکھی ہے یہاں۔ میرب نے خود کلامی کی۔ زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھی سو اس نے بھی گھر کے توجہ طلب امور میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ پہلے پہل صفائی والی سے گھر کی تفصیلی صفائی اپنی نگرانی میں کروائی۔ شریف سے لاؤنج کی سیٹنگ کچھ تبدیل کروائی۔ لان تو مناسب ہی تھا۔ ہاں البتہ کچھ پودے گل سڑ چکے تھے، انہیں اکھڑوا کر ان کی جگہ نئے پودے لگانے کا حکم صادر کیا۔ کچن کی صفائی وغیرہ کے لیے ایک پورا دن درکار تھا سو اسے بعد کے لیے اٹھا رکھا اور خود شاور لینے اپنے روم میں چلی آئی۔ وقار صاحب اسے اس انداز میں دیکھ کر بہت خوشی اور طمانیت محسوس کر رہے تھے۔ اجیہ کچھ دیر قبل کالج سے لوٹی تھی اس نے بھی بھرپور انداز سے اسے سراہا تھا۔ وہ شاور لے کر فریش ہوگئی۔ اک آسودگی سی اسے اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی اس نے سر پر لپٹا تولیہ اتار کر ڈائننگ چیئر پر رکھا اور گیلے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی تب ہی اس کی نگاہ رائٹنگ ٹیبل کی بے ترتیبی پر پڑی۔

عجیب انسان ہیں۔ چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنا جیسے جانتے ہی نہیں۔ وہ سر جھٹک کر ہلکے سے مسکرائی اور ٹیبل پر پھیلے کاغذات سمیٹنے لگی۔ کاغذات سمیٹ کر اس نے ایک فائل میں رکھے۔ کچھ حساب کتاب کی ڈائریاں تھیں انہیں اوپر تلے ترتیب سے جمایا، پین ہولڈر میں رکھا۔ بزنس رسالوں کو یکجا کر کے ٹیبل میں بنے کیبنٹ میں رکھا، تب ہی اس کی نگاہ ٹیبل کی واحد دراز پر پڑی جس میں سے دو تین کاغذ، پرچیاں باہر جھانک رہی تھیں اس نے دراز کھولنا چاہی مگر وہ لاکڈ تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کاغذ کو چھوا، وہ کسی تصویر کا پچھلا حصہ تھا۔ وہ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس تصویر کو باہر نکالنے کی سعی کرنے لگی۔ جو باہر نکل بھی آئی۔ وہ کسی بے پناہ حسین لڑکی کی تصویر تھی۔ میرب ساکت نگاہوں سے یہ تصویر دیکھے گئی۔

سائر کی زندگی میں کوئی اور لڑکی تھی... نہیں تھی

نہیں۔۔۔ شاید آج بھی ہے۔ ان کا روکھا پھیکا جذبوں سے عاری انداز چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ یہ آج بھی ان کی زندگی میں موجود ہے۔۔۔ تو پھر میں کہاں ہوں۔ لمحوں ہی میں اس کے آنسو بھل بھل بہنے لگے یہ انکشاف عجب طرح سے اسے دولخت کر گیا تھا۔ اس نے مردانی سے تصویر کسی ڈائری میں رکھ دی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ لنچ پر سب اس کا انتظار کر رہے تھے وہ اپنے بقایا آنسو اپنے اندر اتار کر باہر چل دی کسی سے کچھ کہنے سننے کا اب فائدہ نہ تھا۔

اگر میرب تصویر ذرا غور سے دیکھ لیتی تو شاید ایسا نہ سوچتی۔۔۔



"یہ آنکھیں نہیں جام سے بھرے پیمانے ہیں۔" آصف شیرازی نے اس سے کہا تھا۔ وہ اس سے مل آئی تھی اور اس ملاقات نے اس کا دماغ عرش معلی پر پہنچا دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے منہ سے اپنی بے ساختہ اور کھلی ڈلی قسم کی تعریف سنی تھی اور زندگی میں پہلی بار ہی اسے یہ تجربہ بھی ہوا کہ کسی مرد کی کی گئی تعریف کیسا سرور بخشتی ہے۔

"ان لبوں پر مسکراہٹ تو سجا کر دیکھو۔ ہزاروں قتل نہ ہو جائیں تو کہنا۔" اس کے کانوں میں پھر اس کی آواز گونجی۔ وہ جو کافی دیر سے برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے کھڑی مختلف زاویوں سے اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ ہلکا سا مسکرائی پھر تھوڑا زیادہ پھر مسکراہٹ ہلکے سے قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر میتھی کے پتے چنتی بی بی جو کافی دیر سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھیں اس کے ہنسنے پر یک دم ہول کر بولیں۔

"اوری چندا۔۔۔ دماغ پر گرمی تو نہیں چڑھ گئی تیرے جو شیشے میں دیکھ کر یوں خوامخواہ قہقہے لگا رہی ہے۔"

اس کے مسکراتے لب یک دم بھینچ گئے اور اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"کبھی تو میری جان چھوڑ دیا کریں۔ آپ کو پورے گھر میں میں ہی نظر آتی ہوں کیا۔" اب وہ بال کھول کر کبھی آگے کبھی سائیڈ پر ڈال رہی تھی۔

"باؤلی حرکتیں کرتی تو تو ہی دکھتی ہے تو تجھے ہی کہوں گی نا۔" وہ غصے میں اور تیز تیز پتے توڑنے لگیں۔

"آپ سے تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔" وہ چڑ کر بال سمیٹنے لگی۔

"ہاں کہنے سننے کو شیخ صاحب ہیں نا۔ ان ہی کو سنایا کر اپنی راگنیاں۔" انہوں نے سر جھٹکا۔

"ہونہہ۔" وہ منہ بنا کر اپنے اور بہنوں کے مشترکہ کمرے میں چلی آئی اور سر منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔ مانو کالج کا کچھ کام کر رہی تھی۔ اسے ناوقت لیٹا دیکھ کر فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں کیا ہوا ہے مجھے۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔ وہ جز بز ہو گئی اور پھر واپس اپنی کتابوں پر جھک گئی۔

"ایک تو ذرا پرائیویسی نہیں اس گھر میں بھیڑ بکریوں کی طرح سب ہی اسی روم میں گھسی رہتی ہیں۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"کیسے پورا ہو گا میرا خواب۔۔۔ گھر والے تو ٹی وی کا نام سنتے ہی جان سے مار دیں گے۔ کیا کروں آخر کیا تدبیر اختیار کروں۔" وہ سوچ گئی الجھ گئی۔



"پھر کب مل رہی ہو؟"

"اتنی جلدی جلدی ملنا میرے لیے ناممکن ہے آغا! ابھی کچھ دن قبل ہی تو ہم ملے ہیں۔" وہ بولی۔

"مگر میں اپنی تشنگی کا کیا کروں جو مٹتی ہی نہیں بلکہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔" وہ بے بسی سے گویا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم۔" وہ اپنے دھڑکتے دل کو سنبھال کر بولی۔

"ایک دن پورا میرے نام کرو۔" وہ مچل کر بولا۔

"میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے آغا' میری مجبوریوں کو سمجھو۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"تم میری مجبوری کیوں نہیں سمجھ جاتیں۔" وہ اصرار کرنے لگا۔

"تم مرواؤ گے مجھے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر پسپا لہجے میں بولی۔

"تم نے تو پہلے ہی مار دیا ہے۔" وہ معنی خیزی سے ہنسا۔

"اچھا ایک دو دن تو دو۔"

"ایک نہ دو... بس کل ملو۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"مگر آغا ایسے کیسے... شام میں' میں نہیں آسکتی۔" وہ جھلا کر بولی۔

"تو صبح آجاؤ... کالج بنک کرو۔" نیا مشورہ۔

"ہوں..." وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ "یہ ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر یہی کرو۔" وہ خوش ہو گیا۔

"چلو پھر رات کچھ کنفرم کرتی ہوں اوکے۔"

"اوکے۔" اس نے فون رکھ دیا۔

"ایسا ممکن تو ہے..." وہ ٹھوڑی پر ہاتھ ٹکائے سوچنے لگی۔

"آرام سے ملاقات بھی ہو جائے گی بابا کے سوال کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا۔" وہ اس کے آئیڈیے سے متفق تھی۔ تب ہی اس کے فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

"اب کیا ہے بھئی۔" وہ فون ریسیو کرکے بولی۔ "تم بھی نہ... تمہیں چین نہیں ہے بالکل۔" وہ مسکرائی۔

"میں اجیہ سے بات کر سکتی ہوں..." دوسری طرف کوئی اجنبی لہجے میں بولا۔ اجیہ نے چونک کر فون کان سے ہٹا کر نمبر دیکھا انجان نمبر تھا۔ وہ بنا دیکھے فون اٹھانے کی حماقت کر چکی تھی مگر فون بند نہیں کر سکی کہ دوسری طرف جو کوئی بھی تھی' وہ اسی سے بات کرنے کا کہہ رہی تھی۔

"آپ کون...؟" وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

"میں کون..." وہ زہریلی سی ہنس کر بولی۔

"میں کون ہوں' تمہارے باپ نے نہیں بتایا تمہیں۔"

"ایکسکیوزمی۔" اس نے سختی سے ٹوکا۔ "میرے والد کے متعلق تمیز سے بات کیجیے۔"

"خوب... خوب۔ اچھی ٹریننگ دے رکھی ہے اس نے تمہیں۔" وہاں سے پھر نفرت بھرے انداز میں کہا گیا۔

"مگر آپ ہیں کون... اور آپ کو کیا بات کرنی ہے۔ ذرا جلدی کہیے مجھے اور بھی کام ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"ماں کہاں ہے تمہاری؟" وہاں سے سلگتے انداز میں پوچھا گیا۔

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" وہ بولی۔ تو اسے فون پر اک ہذیانی قہقہہ سنائی دیا۔

"بہت خوب... یہ تمہارے باپ نے بتایا ہے تمہیں؟"

"آپ کیا بکواس کر رہی ہیں' لگتا ہے' آپ نے غلط جگہ فون کر لیا۔" وہ تپ کر بولی۔

"بالکل ٹھیک جگہ فون کیا ہے میں نے اجیہ فاروقی... مدت سے تمہاری تلاش تھی مجھے۔ میری تلاش آج جا کر تمام ہوئی ہے۔" وہاں سے گہرے لہجے میں کہا گیا۔

"مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے' کچھ پتا تو چلے۔" وہ الجھ کر بولی۔ "اور پھر میں یہ بھی نہیں پہچان پائی کہ آپ ہیں کون۔"

"جان پہچان تو برسوں کی ہے' مگر لگتا ہے کہ تمہیں انجان رکھا گیا ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔

"میرا ٹائم ویسٹ کرنے کا شکریہ... میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"مجھ سے مل سکتی ہو؟"

"واہ کیا بات ہے آپ کی... آج آپ پہلی بار مجھے فون کر رہی ہیں میں جانتی تک نہیں آپ کو اور آپ ملنے کا کہنے لگیں۔ کچھ عجیب باتیں نہیں کر رہیں آپ۔" وہ طنز آمیز لہجے میں بولی۔

"چلو رکھ دو فون... اگر کبھی میری ضرورت پڑے تو

مجھے یاد کر لینا۔" دل گیر لہجے میں کہا گیا۔
"مگر آپ ہیں کون اور مجھے بھلا آپ کی ضرورت کیوں پڑنے لگی۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔
"چلو میں بتا دیتی ہوں کہ میں کون ہوں... مگر کیا تم سننے کی تاب رکھتی ہو؟" استفسار کیا گیا۔
"آپ کو پہیلیاں بجھوانے کا شوق ہے کیا؟ سیدھی طرح بات کیوں نہیں کر رہی ہیں۔" اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔
"چلو پھر سنو۔"
اور راجیہ کو لگا جیسے زمین و آسمان دونوں اس پر گر پڑے ہوں۔



"کیا سوچ رہی ہو؟" سائر جو اپنے بیڈ پر نیم دراز لیپ ٹاپ پر مصروف تھا میرب سے پوچھ بیٹھا۔ وہ کافی دیر سے بظاہر کسی کتاب میں سر دیے ہوئے تھی مگر اس کی توجہ اور دھیان دونوں ہی کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ سائر کو وہ کچھ گم صم اور افسردہ سی مگر اپنی اپنی سی لگی تب ہی وہ یہ پوچھ بیٹھا۔
"ہوں... کچھ نہیں۔" وہ چونک کر بولی۔
"ابراہیم انکل یاد آ رہے ہیں؟" وہ لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتا اس سے مخاطب تھا۔
"ہاں..." یک لفظی جواب۔
"فون کر لو انہیں یا اسکائپ پر بات کر لو۔" فراخدلانہ مشورہ۔
"صبح بات ہوئی تھی اسکائپ پر ان سے۔" اس نے بتایا۔
"چلو ریڈی ہو جاؤ... باہر چلتے ہیں۔" وہ یک دم بولا۔ میرب نے تحیر سے اسے دیکھا۔
"کیا کہا آپ نے؟"
"پانچ منٹ میں ریڈی ہو جاؤ... ڈرائیو پر چلتے ہیں۔" اس نے لیپ ٹاپ آف کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے تو میرب نے مناسب ہی پہن رکھے تھے۔ بالوں میں برش پھیر کر اور ہونٹوں پر گلوس لگا کر وہ ریڈی تھی۔ وہ دونوں وقار صاحب کو بتا کر باہر نکل آئے۔

اے حاصل خلوص بتا کیا جواب دوں
دنیا یہ پوچھتی ہے کہ میں کیوں اداس ہوں

اس نے اپنی پسند کا میوزک لگا دیا۔ میرب کا دھیان غزل کے بولوں میں اٹکنے لگا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا، وہ یہ مصرعہ بار بار دہرا رہا تھا۔ وہ جو کچھ حیرت و خوشی کی ملی جلی سی کیفیت میں اس کے ساتھ چلی آئی تھی اب پھر سے بجھنے لگی۔ وہ اس کے پاس تھا مگر ساتھ کسی اور کے تھا۔
"کچھ بات کرو۔" فرمائش کی گئی۔
"میں زیادہ باتیں نہیں کرتی۔" روٹھے پن سے بتا دیا۔
"حیرت ہے لڑکیاں تو بہت بولتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ بلاشبہ اس کی مسکراہٹ مردہ تنوں میں جان ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میرب نے ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"کتنی لڑکیوں کو جانتے ہیں آپ؟" پھر وہ چبھتے لہجے میں پوچھنے لگی۔
"مجھے لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یوں ہی ایک بات کی جو خاصی مشہور ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"آپ اتنے روڈ کیوں رہتے ہیں۔" وہ اسے دیکھ کر بولی۔
"میری عادت ہی کچھ ایسی ہے۔" وہ انہماک سے ڈرائیو کر رہا تھا۔
"آپ کا کوئی بیسٹ فرینڈ ہے؟" وہ کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔
"نہیں... مگر یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" یک دم ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔
"یوں ہی۔" وہ باہر دیکھنے لگی۔
"آئس کریم کھاؤ گی... لڑکیاں شوق سے کھاتی ہیں۔" وہ سمندر کے کنارے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی نسبتاً آہستہ کر کے بولا۔
پھر لڑکیاں؟ یہ کن لڑکیوں کا ذکر کر رہا ہے... یوں

کیوں نہیں کہتا کہ "وہ" لڑکی باتیں بہت کرتی تھی، آئس کریم شوق سے کھاتی تھی۔ وہ اداسی سے سوچنے لگی۔

"کہاں کھو گئیں۔۔۔ جواب دو۔"

"ہاں۔ کھلا دیں۔" وہ نیم دلی سے بولی۔ وہ گاڑی پارک کرنے لگا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ سامنے ہی تاحد نگاہ تک وسیع سمندر مرکری لائٹس کی روشنی میں نہایا دکھائی دے رہا تھا۔ سمندر کی مخصوص تند و تیز ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔ وہ پارلر میں داخل ہوئی۔ ملگجی سی روشنی میں پارلر کا ماحول بڑا دلفریب محسوس ہو رہا تھا۔

"کون سا فلیور لو گی۔" وہ چیئر پر بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"آپ کو جو پسند ہو۔" وہ سمندر پر نگاہ جما کر بولی۔ (اب کہیں گے "لڑکیوں" کو تو فلاں فلیور پسند ہوتا ہے) وہ سوچنے لگی۔

"مجھے تو بلو بیری پسند ہے وہی لے آؤں تمہارے لیے۔" وہ اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں۔۔۔" وہ بولی۔ "پینا کولاڈا یا پھر ونیلا۔" وہ کاؤنٹر کی جانب چل دیا۔

آج اس مہربانی کا مطلب۔۔۔ کیا ان کے دل تک میری رسائی ممکن ہو چلی ہے۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جو کوئی بھی ہے یا تھی۔ میں تو اس کے پاسنگ بھی نہیں تو بھلا یہ اس کی یادوں سے دامن کیسے چھڑا سکتے ہیں۔ اسے کیسے بھلا سکتے ہیں۔ وہ رنجیدگی سے سوچ گئی۔

"اٹھو۔۔۔ گھر چلتے ہیں۔" کچھ دیر بعد سائر بگڑے تیور لیے واپس لوٹا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ گیا تھا تب تو اس کا موڈ بڑا خوش گوار سا تھا، یہ یکایک اسے کیا ہوا؟

"کیا بات ہے سائر! کیا ہوا؟" وہ تعجب سے بولی۔

"تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔۔۔ اٹھو فورا"" وہ دانت کچکچا کر بولا۔ وہ مزید کچھ پوچھے، کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی معیت میں گاڑی تک آئی

اور بیٹھ گئی۔ گاڑی اک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی۔ وہ بڑی پریشانی میں گھری بیٹھی تھی۔

"وہ چار لڑکے جو سامنے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ کیا تم جانتی ہو انہیں؟" کچھ توقف کے بعد گاڑی میں اس کی آواز سرسرائی۔ اس کی بات پر میرب بھونچکا رہ گئی۔

"سانپ کیوں سونگھ گیا تمہیں جواب دو۔" وہ بری طرح دہاڑا۔

"آپ۔۔۔ کیا۔۔۔ کہہ رہے ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ سراسیمگی سے اٹکتے ہوئے بولی۔

"وہ لڑکے تمہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے اشارے کر رہے تھے، تم ہی نے شہ دی ہو گی ورنہ کسی لڑکے کی اتنی جرأت کہاں۔" اس کے لفظ تھے یا زہر میں بجھے تیر جو سیدھا اس کے وجود میں گڑ گئے۔

"خدا کے واسطے سائر۔۔۔! اتنی پست ذہنیت کا مظاہرہ مت کریں۔ مت ایسے الزام لگائیں مجھ پر کہ میں خود اپنی نگاہوں سے گر جاؤں۔" وہ تکلیف سے بلبلا اٹھی۔

"تم لوگ اسی لیے تیار ہو کر باہر نکلتی ہو کہ لوگوں کی نگاہیں تمہیں سراہیں۔ تمہاری تعریف کریں۔" وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

"میں اس طرح کی نہیں ہوں سائر" آپ میرے ساتھ کیوں یہ سلوک کر رہے ہیں۔" وہ روتے ہوئے دفاعی انداز میں بولی۔

"سب ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔ میرے سامنے ڈرامے مت کرو۔" وہ بے لچک و کٹھور لہجے میں بولا۔

"کسی ایک کی بے وفائی کا بدلہ سارے زمانے سے نہیں لیا جاتا۔" وہ احتجاجا" چیخی۔

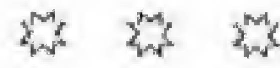
"کیا کہا تم نے۔" اس نے معا" گاڑی سنسان سڑک پر روک کر کچھ اس سفاکی سے پوچھا کہ میرب کانپ کر رہ گئی۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔" وہ سہم کر بولی۔

"آج کے بعد اگر مجھ سے زبان درازی کی تو یاد رکھنا، تمہارا حشر کر دوں گا۔ میں نامرد نہیں ہوں جو عورت کی بے ہودہ گوئی برداشت کر لوں۔" اس نے کچھ دیر بعد

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے تنبیہہ کی۔

اب وہ خاموش ہو گئی تھی۔ سارے آنسو دل پر گر گر کر سائر کے لیے نفرت کا گڑھا بھرتے رہے۔ گاڑی لمبی سڑک پر دوڑتی رہی۔ باہر کالی رات کچھ اور سیاہ ہو گئی تھی۔



"اب تو خوش ہو؟" آصف نے چندا سے پوچھا تھا۔

وہ لوگ اس وقت ملک پروڈکشن ہاؤس کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ دونوں کے آگے چائے اور سینڈوچز رکھے ہوئے تھے۔ دو تین متواتر ملاقاتوں کے بعد آصف اسے پروڈکشن ہاؤس لے ہی آیا۔ ملک صاحب سے اس کا تعارف بھی کروا دیا اور اسے کام دینے کی سفارش بھی کر دی ملک صاحب خاصے پروفیشنل بندے تھے ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ خالص، سچے، باصلاحیت لوگوں ہی کو کام دیتے تھے مگر چندا کے حسن جہاں سوز نے یہاں بھی کام دکھا دیا۔ وہ اس کا بے داغ حسن دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ تھوڑی سوچ بچار کے بعد اپنے ایک ڈرامے جس کی ہیروئن الٹرا ماڈرن دکھائی جانی تھی کے لیے اسے موزوں قرار دیا۔ وہ یقیناً قسمت کی دھنی تھی ورنہ اس فیلڈ میں ایسے کسی کا کام بنتا ہے۔

"ہوں.... تمہارا شکریہ۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

ان دونوں کے مابین تکلم کے تکلفات مٹ چکے تھے۔

"صرف شکریہ پر ٹرخاؤ گی؟" وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"اور کیا دے سکتی ہوں تمہیں فی الحال۔" اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

"بیش قیمت خزانوں کی مالک ہو.... یوں تو نہ انجان بنو۔" وہ اسے وارفتہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔ چندا نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہاری بکواس پھر شروع ہو گئی۔" وہ بے زاری سے بولی۔ نجانے وہ کب اتنی گھاگ ہو گئی تھی کہ نہ

صرف اسے اس "قسم" کے رویوں کو ہینڈل کرنا آگیا تھا بلکہ وہ اپنے مطابق سامنے والے کا موڈ "ٹیون" بھی کرسکتی تھی مگر نہیں۔ کچھ افراد کے اندر شاید پیدائشی طور پر ہی اس قسم کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔

"ہک ہاہ' یہ بھی تمہاری ادا ٹھہری خیر' چلو جائے پیو۔" اس نے اک ٹھنڈی دلبرانہ سی سانس کھینچ کر کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ میرا کام یہاں بن بھی گیا تب بھی مجھے گھر والوں سے اجازت ہرگز نہیں ملے گی۔ دراصل میرے گھر والے بڑے دقیانوسی سوچ کے حامل ہیں وہ مجھے اس فیلڈ میں ہرگز نہیں آنے دیں گے۔" وہ شدید پریشانی میں مبتلا اپنی مخروطی انگلیاں ہولے ہولے اپنی تسبیح پیشانی پر بجا رہی تھی۔

"یہ سب تو پہلے سوچنے والی باتیں ہوتی ہیں بی بی۔" وہ کچھ رکھائی سے بولا۔

"اتنا آگے آنے کے بعد یہ سب سوچنا نری حماقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ گھر والوں کا کیا ہے' چھوڑ آؤ انہیں۔ کل جب تم مشہور ہو جاؤ گی پیسہ تمہارے گھر کی باندی ہوگا تب دیکھنا خود ہی بہانے سے دوڑے چلے آئیں گے۔" وہ بے پروائی سے بولا اور سینڈوچ کترنے لگا۔

"تمہیں علم نہیں ہے' اسی لیے ایسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ چڑ کر بولی۔ "میں نے گھر چھوڑ دیا تو وہ مجھے جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔" اس نے آصف کو معاملے کی سنگینی سے آگاہ کرنا چاہا۔

"تب پھر ایسا کرو... واپس گھر جاؤ اور آرام سے کسی اپنے ہی جیسے مڈل کلاسیے کا انتظار کرو جو تمہیں بیاہ کرلے جائے اور تمہیں صرف بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھے۔ ان گورے گورے ملائم ہاتھوں سے آٹا گندھوائے' جھاڑو لگوائے اور اپنے روتے دھوتے بچے پلوائے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ آصف کے کھینچے گئے نقشے پر اس نے جھرجھری سی لی۔

"خدا کی پناہ... کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں کب واپس جانے کا کہہ رہی ہوں' میں تو آگے کی راہیں کھوج رہی ہوں۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ تم گھر چھوڑ آؤ اور اپنے کام پر اپنے کیریر پر توجہ دو۔" وہ قطعیت سے بولا اور چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔

"راستے بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتے' انہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے اور میں نے راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔" وہ فاتحانہ مسکرائی۔

"ذرا میں بھی تو سنوں۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"یہ میرے انٹر کا آخری سال ہے امتحان میں دو مہینے رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میری آپا کی شادی ہے۔ میری اماں میرے رشتے کے لیے بھی کوشش کر رہی ہیں' جانتی ہوں میں یہ بات' جوں ہی میرا رشتہ ملا انہوں نے نہ میری پڑھائی دیکھنی ہے' نہ کچھ اور جھٹ سے شادی کردینی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا رشتہ کہیں اور طے کردیں کیوں نہ میں خود ہی اپنا بر ڈھونڈ لوں۔" وہ اتنا کہہ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"خوب... مگر اس میں آپ کی کامیابی کہاں ہے۔" وہ طنزیہ بولا۔

"ہے نا... میں اپنی مرضی کی شادی کرکے رخصت ہو جاؤں گی ان کے گھر سے' اس کے بعد میں سیاہ کروں یا سفید اپنی مرضی کی مالک ہوں گی۔" وہ داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہوں... مگر یار! یہ بہت لمبا کھڑاگ نہیں ہو جائے گا۔ پھر شادی شدہ ہونے کا مطلب جانتی ہو... ملک صاحب نے کھٹ سے انکار کردینا ہے۔" وہ پُرسوچ انداز میں اسے دیکھ کر بولا۔

"بھئی... یہ شادی کوئی پراپر شادی نہیں ہوگی... صرف ایک معاہدہ ہوگا۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔

"مگر ایسا الو کا پٹھا تمہیں ملے گا کہاں سے؟" وہ جھلاہٹ آمیز بےزاری سے بولا۔

"تم ہو نا... تم کرو گے مجھ سے شادی۔" اس نے گویا خزانے کی چابی اسے تھمانے کی بات کرکے اسے ششدر کردیا۔

"میں...! چلو ٹھیک ہے۔" لمحہ بھر کی سوچ بچار بھی فضول تھی۔ چندا جانتی تھی' وہ انکار نہیں کرے گا اور

یہی ہوا۔ وہ خود کو کیش کروانا سیکھ چکی تھی۔ وہ دل کھول کر مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے، بڑی خاموش ہو۔" آغا، اجیہ کی بے توجہی و خاموشی مسلسل نوٹ کر رہا تھا۔ اسی لیے ٹوک بیٹھا۔ وہ اس وقت کالج بنک کر کے اس کے ساتھ تھی۔ اب اتنی صبح کوئی ریسٹورنٹ وغیرہ تو کھلا ملتا نہیں۔ کسی ہوٹل جانے پر وہ راضی نہیں ہوتی سو اسی لیے اسے لیے ساحل سمندر پہ چلا آیا۔

"کیا میں تم سے اپنی کوئی بات شیئر کر سکتی ہوں۔" وہ جھجک کر بولی۔ میک اپ سے مبرا چہرہ صبح کی تازگی بھرے ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ کالے سیاہ بالوں کی پونی سمندر کی شوریدہ ہواؤں سے کاندھے پر ڈول رہی تھی۔ کاندھوں پہ پڑا گلابی دوپٹا ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ سفید یونیفارم میں اس کا سانچے میں ڈھلا وجود۔۔۔ وہ کتنی ہی دیر نگاہ نہیں ہٹا سکا۔

"بتاؤ۔" اس نے کچھ بے چینی سے پوچھا۔

"یار۔۔۔ کیا تم مجھ سے اجازت مانگ رہی ہو اگر ہاں تو غلط کر رہی ہو۔ بھئی تمہیں تو بلا جھجک مجھ سے کوئی بھی بات شیئر کر لینی چاہیے۔" وہ حوصلہ افزا لہجے میں بولا۔ وہ کچھ لمحے تک یونہی بیٹھی اپنے بیگ کے اسٹریپ کو گھماتی رہی جیسے کہنے اور نہ کہنے کا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔

"کیا ہے یار! بول بھی دو۔" وہ اب کچھ اکتا کر بولا۔

"کل مجھے اک فون آیا۔" اس نے سمندر کی لہروں پر نگاہیں جما کر بتایا۔

"کوئی عورت تھی۔۔۔ اس نے جو کچھ کہا سن کر مجھے لگا جیسے کہ وہ پاگل ہو کوئی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ہے اجیہ ڈیر۔۔۔ کیا بات کی اس نے اور اگر وہ تمہیں پاگل ہی لگی تو اب اس کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہو، ویسے میں بھی تو سنوں آخر اس نے تمہیں ایسا کیا بتا دیا جو تم یوں گم صم ہو۔" وہ بینچ پر ٹیک لگا کر بولا۔

"اس نے بتایا کہ وہ میری ماں کو جانتی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"تو کیا ہوا، تمہاری مام کو بہت سے لوگ جانتے ہی ہوں گے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"نہیں آغا! سارا مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ کہتی ہے کہ وہ مجھے میری ماں سے ملوانا چاہتی ہے۔ ان فیکٹ اس نے بتایا کہ میری ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔" وہ بے انتہا الجھ کر اسے بتا رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ" وہ دفعتاً اپنی سیٹ سے اچھل کر بولا۔ "کسی وچ ڈاکٹر کا فون آیا ہے تمہیں؟"

"آغا۔۔۔ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" وہ ہنوز سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں ڈارلنگ۔" وہ سرعت سے بولا۔ "میں مذاق نہیں اڑا رہا۔ روحوں سے بات کرنا اور کروانا تو وچ ڈاکٹرز ہی کا کام ہوتا ہے یار! نارتھ امریکا میں بہت ملتے ہیں۔"

"تم میری بات نہیں سمجھے۔" وہ اک گہری سانس لے کر تفکر سے بولی۔

"وہ کہتی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔"

"کم آن اجیہ! یہ تم کن چکروں میں پڑ رہی ہو۔ صاف ظاہر ہے کوئی تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔" وہ اب ذرا ڈپٹ کر بولا۔

"میں بھی یہی سمجھتی اگر وہ مجھ سے انہیں روبرو ملوانے کا نہ کہہ دیتی۔" وہ ہونٹ کاٹ کر بولی۔

"یہ زندگی ہے اجیہ مذاق یا کوئی ڈرامہ نہیں۔ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ تمہاری مام مر چکی ہیں، تمہارے پورے خاندان کو معلوم ہے یہ بات۔ اگر وہ حیات ہوتیں تو کیا کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ فار گاڈ سیک اجیہ! کسی چکر میں نہ پھنس جانا۔ امیر باپ کی بیٹی ہو، خوب صورت ہو مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کوئی بے وقوف بنا کر کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سو میرا مشورہ ہے کہ اس سب سے باز رہو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آمنہ مقصود

دل، دریا، سمندر، ڈوبنے کے

"آج رمشا بجو آئی تھیں۔"

بظاہر عام سے لہجے اور سادہ سے الفاظ پر مشتمل اس جملے کے تمام ممکنہ معنی و مفہوم مخاطب کی سماعت تک بہ خوبی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گود میں رکھی کتاب پر گڑی اپنی نظریں پل بھر کے لیے اوپر اٹھائیں۔

"اچھا۔" یک لفظی جواب سے نواز کر وہ دوبارہ اسی کتاب میں کھو گئے تھے۔

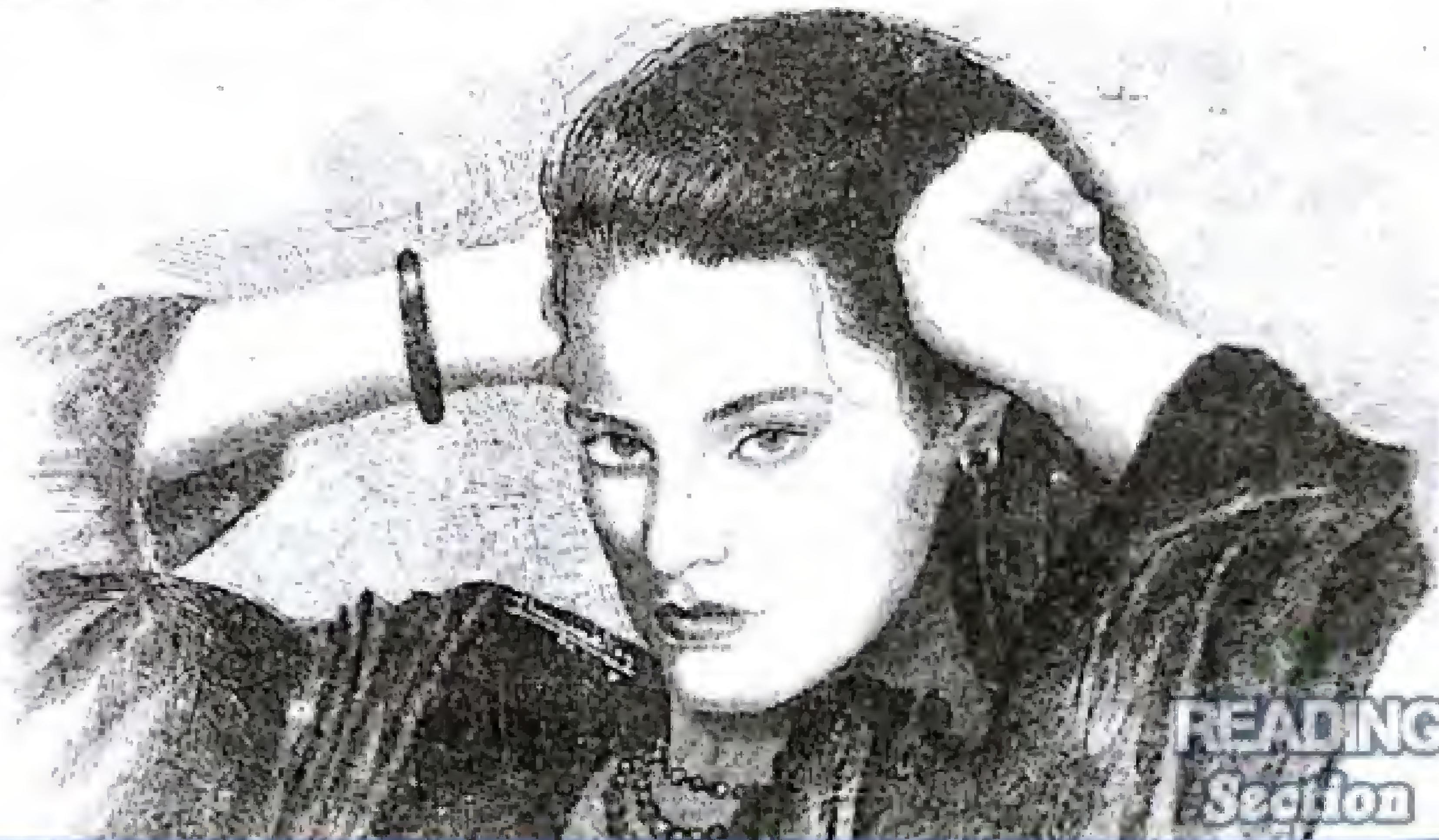
روحی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ جانتی تھی اس ایک لفظ کے تکلف کے بعد اب وہ ہرگز متوجہ نہ ہوں گے۔ دل خوش فہم ہے سو نظریں ان پر جما کر یونہی بیٹھنے پر مجبور کیے رکھا۔ وہ نہایت انہماک سے کتاب میں کھوئے ہوئے تھے۔

"اتنے پرسکون آخر کیسے رہ لیتے ہو تم۔ کوئی ملال' کوئی کسک کیوں نہیں جھلک پاتی تمہارے چہرے سے۔ کسی پچھتاوے کی بہت مدھم سی لکیر بھی تمہارے دل کے نہاں خانوں کا بھید لے کر مجھ تک نہیں پہنچتی۔ کس قدر چھپا کر رکھتے ہو تم خود کو۔" دل مضطرب کا حال اس کی ہر حرکت سے ظاہر تھا مگر لب تھے کہ خاموش۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ اب رات کے کھانے کی تیاری کرتے ہوئے دل کی بھڑاس برتنوں اور دیگر اشیا پر خوب خوب نکل رہی تھی۔ اس اٹھا پٹخ کے جواب میں برتنوں کی آہ و بکا بھی مسلسل جاری تھی۔ جب تک کھانا تیار ہو کر میز پر پہنچا اس کا غصہ بھی پسینے کے ساتھ بہہ چکا تھا مگر ایک انا تھی جو کمرے کے راستے میں دیوار بنی ہوئی تھی۔

روحی نے دروازے پر رک کر کچھ دیر سوچا پھر لاؤنج میں چلی آئی جہاں سوہا اور سویرا ہوم ورک کر رہی تھیں۔

"سوہا! جاؤ بابا سے کہو کھانا لگ گیا ہے۔" یہ اس کا



ناولٹ

مخصوص انداز تھا جو کچھ نہ کہہ کر بھی روٹھنے کی ساری کہانی کہہ دیتا تھا۔

"جی اچھا مما!" سوہا نے کاپی بند کر کے بیگ میں رکھی اور کمرے کی جانب دوڑ پڑی۔

"بابا! مما کہہ رہی ہیں آکر کھانا کھالیں۔" اس نے بیچ راستے میں ہی پیغام رسانی کا فرض با آواز بلند انجام دیا۔

"اف! کتنی جلد باز ہے یہ سوہا بھی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

عدیل بھی جیسے منتظر ہی تھے فوراً" آموجود ہوئے۔

"تم نے کھانا نہیں کھانا کیا؟ اٹھو! ہاتھ دھو کر آؤ۔" وہ خفت مٹانے کو سویرا پر برس پڑی۔

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی وہ سنی ان سنی کر کے صوفے پر جوں کی توں بیٹھی رہی فی الحال کسی سے بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آج کی صبح کا آغاز ہی کچھ اس طرح ہوا تھا کہ اس پر اداسی اور قنوطیت طاری ہو گئی تھی۔

"کل رمشا اگر آہی گئی تھی تو تم نے روک لیا ہوتا۔" ناشتے کی میز پر عدیل نے کہا تھا۔

لقمہ منہ تک لے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ وہ اگر یہ سمجھی تھی کہ بات آئی گئی ہو گئی تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ گزشتہ رات کچھ دریافت نہ کرنے کا ہرگز مطلب یہ نہ تھا کہ وہ اس قصے کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر گئے ہیں۔

"میرے روکنے سے رک جاتیں کیا؟ آپ جانتے تو ہیں وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔" اس نے لاپروا سا انداز اپناتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"ہوں!" عدیل نے مزید کوئی بات کرنے سے اجتناب برتا تھا تو وہ بھی شکر ادا کرتے ہوئے سوہا اور سویرا کے لنچ باکسز پیک کرنے لگی۔

بچوں کی اسکول وین کے روانہ ہوتے ہی وہ لوٹی تو عدیل بھی آفس جانے کے لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ وہ میز سمیٹنے لگی۔

"سنو! آج تم خود چکر لگا لینا۔ اگر رمشا آنا چاہے تو ساتھ ہی لے آنا۔" جاتے جاتے وہ ایک بار پھر اسے امتحان میں ڈال گئے تھے۔

"رمشا بجو! میں نے کب' زندگی کے کسی موڑ پر آپ کے لیے برا چاہا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ تقدیر کا فیصلہ تھا اس میں میرا کیا قصور تھا۔ پھر بھی آپ نے مجھے عمر بھر کے لیے کڑی دھوپ میں ننگے پاؤں چلنے کی سزا دی ہے۔"

دو موٹے موٹے آنسو نالہ دل پر بے قرار ہو کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

"اگر آپ کے نصیب میں وہ سب نہیں تھا' جو آپ نے چاہا تو میرے حصے کی خوشیاں بھی چھین کر کیوں آپ نے مجھے تہی دامن کر ڈالا؟" وہ خود ترسی میں جتلا ہو رہی تھی۔

فون کی گھنٹی دوسری مرتبہ مسلسل بجنے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ مگر وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد موبائل کی بپ بجنے لگی۔

"کیا لے آئیں رمشا کو؟ یہی پوچھنے کو بے قرار ہو رہے ہوں گے۔ آفس جا کر بھی چین نہیں۔" موبائل تلاش کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

"جی فرمایئے۔" نمبر دیکھے بغیر ہی موبائل اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

"روحی بجو! السلام علیکم میں بول رہی ہوں صائمہ' آپ کیسی ہیں؟ کیا کر رہی ہیں؟ بچے اسکول چلے گئے؟" صائمہ گفتگو میں سانس لینے کی قائل نہیں تھی۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔" گھٹی گھٹی آواز میں وہ بمشکل جملہ مکمل کر پائی تھی کہ صائمہ کی باتوں کی ریل گاڑی پھر سے چل پڑی۔

"بجو! میں کافی دیر سے لینڈ لائن پر ٹرائی کر رہی ہوں۔ گھنٹی تو بجتی رہی ہے۔ مگر آپ نے ریسیور اٹھایا ہی نہیں۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی کہ سب خیریت ہو۔ اب آپ کی آواز سنی ہے تو جان میں جان آئی ہے۔" روحی کی آواز تو شاید اس نے اب بھی غور سے نہیں سنی تھی ورنہ مضمحل لہجہ ہرگز پوشیدہ نہ رہتا۔

"آپ کہیں باہر ہیں کیا؟ مجھے لگتا ہے ہماری طرف آرہی ہیں اچھی بات ہے آج میرا ارادہ بریانی بنانے کا ہے۔ بچوں کی فکر مت کیجیے گا۔ انہیں اسکول سے رمیز لے آئیں گے۔" تیز تیز بولتے ہوئے وہ ساری منصوبہ بندی خود ہی کیے جارہی تھی۔

"نہیں صائمہ! آج تو گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ میں نے تو بہت کچھ کہنا تھا آپ سے۔ اپنی الجھنیں کسی اور سے کہہ بھی تو نہیں سکتی۔ میری تو کوئی بہن بھی نہیں ہے۔"

"بہن۔" روحی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"بس کیا بتاؤں بجو! رمشا بجو نے میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ یہ کرو' وہ نہ کرو' یہ کھاؤ وہ پہنو' ہر ہر بات پر یوں ڈکٹیشن دیتی ہیں جیسے میں صرف ایک روبوٹ ہوں کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں سکتی۔" دریافت نہ کرنے پر بھی وہ شروع ہو چکی تھی۔

"آخر کب تک برداشت کروں۔ اگر پلٹ کر جواب دے دوں تو فوراً" خفا ہو جاتی ہیں اور رمیز سے شکایت لگا دیتی ہیں۔ رمیز کا تو پھر آپ کو پتا ہی ہے۔"

روحی جانتی تھی یہ بے جا شکایات نہیں ہیں۔ اگر صائمہ کے لہجے میں لحاظ کا عنصر گھٹ رہا تھا تو اس کی ذمہ داری رمشا بجو پر بھی عائد ہوتی تھی۔ جس صائمہ کو وہ بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں اب اسی کے خلاف صف آرا رہتیں۔

"بجو! اب کل کی بات ہی لے لیں میں چکن قورمہ بنا چکی تو کہنے لگیں۔ مٹن بنانا تھا۔ اتنی گرمی میں دوبارہ ہنڈیا چڑھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میرے انکار پر روٹھ کر گھر سے چلی گئیں۔ میں نے سوچا گھنٹہ دو گھنٹہ میں جب غصہ ٹھنڈا ہو گا تو واپس آجائیں گی مگر ..... وہ تو اب تک نہیں آئیں۔"

"کیا" رمشا بجو گھر واپس نہیں گئیں؟"

تمام ہمدردیاں صائمہ کے ساتھ ہونے کے باوجود اس بات پر وہ ہول گئی تھی۔

اسے تسلی دے کر فون بند کیا اور عدیل کو کال ملا کر ساری صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ دل میں یہ دھڑکا بھی تھا کہ عدیل اسے کل کی لاپروائی پر بہت کچھ سنائیں گے مگر انہوں نے حسب عادت خاموشی سے فون بند کر دیا۔

رمشا بجو کے ساتھ بد تہذیبی کا برتاؤ تو ہر گز نہیں کیا تھا بس ہمیشہ کی طرح لیے دیے انداز میں ملی' وہ بھی گھنٹہ بھر بیٹھ کر چلی گئیں۔ روحی نے اوپری دل سے انہیں کھانے پر روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانیں۔

"ہائے! میری بہن نجانے کہاں ہو گی۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

دو گھنٹے بعد عدیل کی گاڑی کے مخصوص ہارن نے ان کی آمد کی اطلاع دی تو دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ رمشا کو ڈھونڈے بغیر گھر آ ہی نہیں سکتے تھے۔

"روحی! روحی بیٹی! یہ ذرا شجی کی قمیص پر بٹن تو ٹانک دو۔" چچی امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

"جی چچی امی!" ہیر برش سنگھار میز پر رکھ کر وہ فوراً" پلٹی تھی لیکن انہیں جو کہنا تھا کہہ چکیں اب بھلا رک کر بات دوہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ قمیص پلنگ پر رکھ کر پلٹ گئیں۔ روحی نے ایک کھسیانی نظر سامنے آرام کرسی پر جھولتی رمشا پر ڈالی جس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اسے بہت کچھ جتا رہی تھی۔

روحی نے چہرے پر آتی کھلے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور وہیں بیٹھ کر بٹن ٹانکنے لگی۔

"ہونہہ' اسے کہتے ہیں بیوقوف احمق لوگ۔"

رمشا سے اس کی خاموشی برداشت نہ ہوئی تھی۔

"دوسروں کے کام آنا بے وقوفی نہیں ہوتی۔" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو چچی امی کی نظر کمزور ہے یہ سوئی دھاگے والے کام ان سے نہیں ہوتے پھر ان کی کوئی بیٹی بھی تو نہیں ہے..... ہاں وہ ورنہ وہ ہمارے تمہارے منہ کبھی نہ لگیں' رمشا نے اس کا جملہ اچک کر اپنی مرضی سے مکمل کیا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

روحی میڈم! کسی کے کام آنے میں اور بے دام کا

غلام بننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تمہیں لوگوں کے لہجے سمجھ کیوں نہیں آتے۔ ابھی دیکھا نہیں تم نے، انہوں نے نظر ملا کر بات تک نہیں کی بس صرف حکم صادر کرکے چلتی بنیں۔"

روحی کو اس کے نخوت بھرے لہجے پر حیرت ہو رہی تھی۔

"روحی! رویوں کو پرکھنا سیکھو ورنہ نیکیاں کمانے کے میں ایک دن لوگوں کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ جاؤ گی۔" رمشا کا تلخ لہجہ خاصا بلند تھا۔ روحی گھبرا کر باہر کی سمت دیکھنے لگی "ہوسکتا ہے چچی عجلت میں ہوں۔ شاید وہ چولہے پر ہنڈیا چڑھا کر آئی تھیں۔ پھر ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں تکلف کیسا۔" وہ کہنا چاہتی تھی لیکن دانستہ خاموش ہو گئی۔ رمشا سے بحث کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے بھی کہیں تلخ باتیں آسانی سے کہہ جاتی تھی۔ اس نے دانت سے فالتو دھاگہ توڑ کر سوئی سمیت تکلی پر لپیٹا اور بے تاثر چہرہ لیے آئینے کے سامنے کھڑی رمشا کو بغور دیکھتے باہر نکل آئی۔ چچی باورچی خانے سے نکل رہی تھیں۔

"یہ لیں چچی! ہو گیا اور کوئی کام ہو تو بتائیں۔" اس نے بازو پر رکھی شجی بھائی کی قمیص ان کے حوالے کی۔ "نہیں" وہ اس کا گال تھپتھپا کر آگے بڑھ گئیں۔

رمشا کو نجانے کیوں ان سے خدا واسطے کا بیر ہے۔" وہ وہیں کھڑی سوچنے لگی۔ اس کے سادہ اور بے ریا دل و دماغ میں کوئی الجھی ہوئی بات سما ہی نہیں سکتی تھی۔ ہمدرد اور پر خلوص دل اسے ابا سے ورثے میں ملا تھا۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا' ان کے کام آنا' ابا کی طرح اسے بھی خوشی دیتا تھا۔ زخموں سے چور ابا' ہسپتال کے بستر پر جب آخری سانسیں لے رہے تھے تب بھی انہیں اپنے اس دوست کی فکر لگی تھی جو سڑک پر حادثے کے دوران ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھا۔

"روحی سے کہہ دو' وہ انکار نہیں کرے گی۔" یہی تو وہ جملہ تھا جو اس کے اندر توانائیاں بھر دیتا تھا۔ گھر کے کسی کونے سے کوئی پکار آئے روحی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتی۔ چچی امی کو تو خاص طور پر دن میں بیسیوں بار ایسے کام درپیش ہوتے جو صرف روحی کے ہاتھوں ہی انجام پاسکتے تھے اور روحی کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آتی۔

"ارے! واہ بھئی' اتنے مصروف لوگ فارغ کیسے نظر آ رہے ہیں؟" اس نے بانو قدسیہ کی راجہ گدھ' سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا۔ نبیل ہاتھ میں بلا تھامے اسی سے مخاطب تھا۔

آج صبح رمشا کے پیٹ میں اچانک شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ کالج نہ جاسکی۔ مجبوراً" روحی کو بھی گھر میں رکنا پڑا کیونکہ وہ اکیلے جانے سے گھبراتی تھی۔ ہمیشہ یہی ہوتا۔ رمشا اگر کسی وجہ سے کالج نہ جاتی تو روحی کو بھی چھٹی کرنا پڑتی۔ شروع شروع میں رمشا نے اسے بہت سمجھایا عدیل بھی اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری لینے پر تیار تھا مگر وہ نہ مانتی۔ امی نے البتہ کبھی زبردستی نہ کی یوں رفتہ رفتہ سب اس بات کے عادی ہو گئے۔

آج روحی کا انگریزی کا بہت اہم ٹیسٹ تھا جس کے لیے رات گئے تک وہ تیاری کرتی رہی تھی' لیکن رمشا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تو اسے بھی صبر کرنا پڑا کچھ دیر تو وہ یونہی پھرتی رہی پھر راجہ گدھ کا خیال آیا جو کل شام ہی عدیل نے اسے لا کر دی تھی تو دل کی کلی کھل گئی۔ کتاب اٹھائی اور پچھلے صحن میں بچھی چارپائی جا بیٹھی۔ امی اور چچی امی بازار گئی ہوئی تھیں سو فراغت ہی فراغت تھی۔ اب نبیل نے آکر اس کا انہماک توڑا تھا۔

"کوئی کام ہے کیا؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ نبیل کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تمہیں فارغ دیکھ کر زبان پر کھجلی تو ہونے لگتی ہے مگر۔۔۔ اس وقت کوئی کام یاد نہیں آ رہا۔" وہ اپنے بلے سے فضا میں ہٹ لگاتے ہوئے شرارت سے بولا

"بہت باتیں کرنا آگئی ہیں۔ شرم کرو تم سے بڑی ہوں۔"

"اچھا! تو بڑی ہو تم۔" اس نے آگے بڑھ کر روحی کی چٹیا کھینچی۔
"آنے دو چچی امی کو' تمہاری شکایت لگاؤں گی۔" وہ روٹھے پن سے بولی۔
"لو ایسا بھی اب کیا کہہ دیا۔ میں تو گیند ڈھونڈنے آیا تھا۔" وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"تم اتنی تیز دھوپ میں کرکٹ کھیلنے جا رہے ہو؛ اب تو شکایت لگانی ہی پڑے گی۔" روحی نے بھی چٹخارہ لیا۔
"میری شکایت لگاؤ گی اچھا! ابھی بتاتا ہوں۔" نبیل نے لپک کر اس کے ہاتھ سے ناول چھین لیا۔
"ارے... نبیل کے بچے' واپس کرو' پلیز واپس کر دو۔" وہ دونوں چارپائی کے گرد آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ نبیل ہنس رہا تھا جبکہ وہ رو دینے کو تھی۔
"نوری... نوری' شجی بھیا کی آواز لاؤنج سے آئی تھی۔ وہ خلاف عادت بہت زور سے دھاڑ رہے تھے۔ روحی اور نبیل نے رک کر ایک دوسرے کو دیکھا اگلے ہی لمحے روحی نے لاؤنج کی طرف دوڑ لگا دی۔
نبیل نے موقع غنیمت جان کر کتاب چارپائی پر پھینکی اور بیٹ سنبھالتے ہوئے باہر نکل گیا۔
لاؤنج کے دروازے پر پہنچنے تک وہ صورت حال کو کافی حد تک سمجھ چکی تھی۔ شجی بھیا کافی دیر سے اپنے موبائل کا چارجر ڈھونڈ رہے تھے۔ تلاش لاحاصل نے غالباً" انہیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ویسے بھی شجی بھیا آج کل کچھ روٹھے روٹھے سے رہتے تھے۔ کبھی کسی معمولی سی بات پر کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتے تو کبھی بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر چلے جاتے۔ شاید آنے والے وقت کی اداسی اور تنہائی کے احساس نے انہیں ابھی سے آن گھیرا تھا۔ اپنا گھر' محلہ' عزیز اور اپنے وطن کی مٹی چھوڑ کر پردیسی بن جانا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ مگر چچی امی تو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ امریکا جانا میرے شجی کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے۔ اب یہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا تو شجی بھیا خوش کیوں نہیں تھے۔

"معلوم نہیں' کیا حقیقت ہے؟" وہ سر جھٹکتے ہوئے اندر آ گئی۔ باہر کی نسبت اندر کے تاریک منظر سے مانوس ہونے میں آنکھوں کو کچھ دیر لگی تھی جب تک نوری چارجر ڈھونڈ کر شجی بھیا کے ہاتھ میں تھما چکی تھی۔ ڈھونڈا بھی کیا تھا شجی بھیا جس صوفے سے اٹھے تھے۔ اس کے ساتھ والی خالی تپائی پر موجود چارجر واحد چیز تھا جو روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ آندھی کے تیز جھونکے کی مانند اس کے پاس سے گزر گئے۔
کمرے کے مزید واضح ہوتے منظر نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شجی بھیا نے صحن میں جھاڑو لگاتی نوری کو تو حلق پھاڑ کر بلایا تھا جبکہ رمشا بجو کمرے میں موجود تھیں۔ وہ کسی پتھر کی سل کی مانند ٹھہرے ہوئے زمانوں کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ نظریں سامنے کی دیوار پر کسی نادیدہ و ناقابل فہم تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
"جاؤ! تم اپنا کام کرو۔" روحی نے حیران کھڑی نوری کو وہاں سے بھیجا اور خود رمشا کے قریب صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب کے وہاں سے ہوا ہونے کی باری رمشا کی تھی۔ مگر روحی اس کے نین کٹوروں سے چھلک جانے کو بے تاب پانی کی ان کہی داستان پڑھ چکی تھی۔



شجی بھیا کا سفر من چاہا تھا یا ان چاہا۔ اس کا بھید وہ کسی کو دیے بغیر پردیس سدھار گئے۔ ان کے جانے سے چچی امی کے کام بھی اچانک ہی سمٹ گئے تھے۔ اب نہ روحی کے نام کی پل پل پکار آتی تھی اور نہ ہی رمشا اس سے الجھتی تھی۔ سکوت کی ایک دبیز چادر تھی جو گھر کی مجموعی فضا پر تن گئی تھی۔ رمشا منہ لپیٹے کسی کونے کھدرے میں پڑی رہتی۔ یا پھر امی کے ساتھ نکڑ والے ڈاکٹر کے کلینک کے چکر لگتے رہتے۔ جانے وہ کون سی بیماری تھی جو کسی طبی رپورٹ سے ظاہر نہ ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ اسے اندر سے ختم کر رہی تھی۔ وہ ایک دیمک زدہ دیوار کی مانند لگنے

لگی تھیں۔
گھر کے باقی افراد بھی بظاہر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ کولہو کے بیل کی مانند' بند آنکھوں سے ایک ہی دائرے میں گول گول چکر لگاتے ہوئے۔ چچا صبح ہی صبح بنا ناشتے کے اسٹور پر چلے جاتے۔ امی سر جھکائے مہر بہ لب دال چنتی رہتیں۔ ان کی دال میں جانے کیسے کنکر تھے جو چنے ہی نہ جاتے تھے۔ چچی امی البتہ اسے کبھی کبھی اپنے کمرے میں بلا لیتیں۔
"یہ سوٹ دیکھو روحی! اچھا ہے نا؟ رکھ لو' سلوا لینا۔" وہ زبردستی اسے تھما دیتیں۔
"شجی نے پیسے بھیجے تو میں یہ لے آئی۔ ماشاء اللہ بہت اچھی نوکری ملی ہے اسے بہت خوش ہے میرا لعل' اللہ نظر بد سے بچائے۔" وہ اس کی حیران نظروں میں رقم سوال کا خود ہی جواب دیتیں۔
"کئی ایک چٹی گوری میمیں کام کرتی ہیں اس کے ساتھ' کہتا ہے امی اگر کسی ایک سے شادی کرلوں تو گرین کارڈ پلک جھپکتے میں مل جائے گا۔" ان کی بظاہر بے نیازی سی ہنسی میں دبی دبی خوشی انگڑائیاں لیتی اور روحی کی نظروں کے سامنے رمشا کی پانیوں سے بھری آنکھیں رقص کرنے لگتیں۔ وہ بددل ہو کر باہر آجاتی۔

☼ ☼ ☼

"برف کا گولا کھاؤ گی؟" عدیل نے اچانک پوچھا تھا۔ روحی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"اتنے ہجوم میں چھوٹے بچوں کی طرح برف چوستی ہوئی اچھی لگوں گی؟" اس نے کالج گیٹ پر کھڑے لوگوں کے ہجوم پر نظر دوڑائی۔
"کبھی کبھار بچہ بن جانا اچھا ہوتا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرادیا۔
"اچھا! رہنے دو' چلتے ہیں۔" اپنا ارادہ خود ہی بدلتے ہوئے وہ بائیک کی طرف بڑھ گیا تو روحی بھی خاموشی سے آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
جب سے رمشا نے کالج جانا چھوڑا تھا عدیل نے خود بخود روحی کو کالج لانے لے جانے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔
وہ سدا سے ایسا ہی تھا' کم گو اور بظاہر لا تعلق نظر آنے والا۔ لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ اور ان بولتی آنکھوں کے فسانے صرف روحی کے دل کی دھڑکنیں ہی سمجھ سکتی تھیں۔ اظہار' نہ قول و قرار' ایک بے نام سا بندھن تھا جسے بس دونوں سمجھتے تھے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی دونوں میں شرم و لحاظ کی ایک دیوار بھی گویا اپنی اپنی حدیں دونوں نے طے کر رکھی تھیں اور یہی ان کے تعلق کا حسن تھا۔
عدیل ہر روز اسے کالج کے گیٹ پر اتار کر یونیورسٹی کی راہ لیتا اور واپسی پر اسے لیتے ہوئے گھر آجاتا۔ راستے بھر میں دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہتے تھے۔ آج عدیل نے نجانے کیا سوچ کر اسے برف کے گولے کی آفر کر ڈالی تھی۔ سو وہ زیر لب مسکرا دی۔ اس کے پس و پیش پر وہ با آسانی مان بھی گیا لیکن پھر کچھ دور آکر ایک کیفے کے سامنے بائیک روک دی۔
"عدیل!" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔
"دراصل میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں' جو گھر پر ممکن نہیں۔"
"اچھا! ٹھیک ہے۔" روحی کچھ سوچ کر اس کے ساتھ چل دی۔
"ہاں! اب بولو۔" اپنے سامنے رکھے اورنج جوس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اعتماد سے کہا۔
"روحی! شجی بھیا شاید اب کبھی واپس نہ آئیں۔ وہ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ دل کے زخم بھلے مندمل نہ ہوں لیکن واپسی کا راستہ اب ان کی مسافتوں کو کبھی چھو کر نہیں گزرے گا۔ رمشا کے لیے اب ہمیں ہی کچھ کرنا ہے۔ اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ دل کٹتا ہے میرا اسے یوں قطرہ قطرہ مرتا دیکھ کر۔" وہ کہہ رہا تھا اور روحی منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ کتابوں میں سر دیے بے نیاز رہنے والا لڑکا بے خبر ہرگز نہیں تھا۔
"میں چاہتا ہوں رمشا زندگی کی طرف لوٹ آئے

اس کے لیے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"
"میں تیار ہوں۔" روحی نے فوراً" سے پہلے ہامی بھری۔



جاڑوں کی دھوپ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کبھی چپکے چپکے صحن میں اتر کر درو دیوار سے بوس و کنار ہوتی تو اگلے ہی پل اپنی شرمیلی کرنیں سمیٹ کر کہیں روپوش ہو جاتی۔

وہ چارپائی دیوار سے لگائے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔ رمیز پاس ہی کھیل رہا تھا۔ امی پڑوس میں جانے سے پہلے تاکید کر گئی تھیں کہ وہ رمیز کو ہوم ورک کروا دے۔ مگر اس نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ رمیز نے سائیکل چلا چلا کر کچے اور پکے صحن کو ایک سا کر دیا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

روحی کچن سمیٹ کر نکلی تو صحن کی حالت دیکھ کر اسے رونا آنے لگا۔

"رمیز کے بچے....." وہ تھپڑ رسید کرنے کو لپکی مگر سیڑھیاں اترتے عدیل نے اشارے سے منع کر دیا۔

"روحی! کل کے ٹیسٹ کی تیاری ہو گئی؟ نہیں' تو جاؤ پڑھو جا کر۔ یہ سب رمشا کر لے گی۔" چارپائی پر لیٹے اس بے جان وجود کو دیکھتے ہوئے عدیل نے اونچی آواز میں کہا۔ روحی تابعداری سے اندر چلی گئی۔

"چلو رمیز تم بھی جا کر منہ ہاتھ دھولو۔ بتول چچی نے دیکھ لیا تو شامت آجائے گی تمہاری۔" اس نے رمیز کے سر پر چپت لگائی۔

"رمشا! ایک کپ چائے تو بنا دو۔ بہت طلب ہو رہی ہے۔"

رمشا کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو اس نے اپنا سوال دوہرایا۔ اس بار بہ مشکل آنکھوں پر دھرا بازو ذرا سا سرکایا اور مندی مندی بے رونق آنکھوں میں اجنبیت لیے وہ عدیل کو گھورنے لگی۔

"روحی سے کہہ دو۔" اس نے کروٹ لی۔

"روحی سے کہا تو جا سکتا ہے مگر کل اس کا ٹیسٹ ہے اور نکمی کو بہ مشکل پڑھنے کے لیے بھیجا ہے۔ پھر تمہارے جیسی چائے روحی کو کہاں بنانی آتی ہے وہ تو جوشاندہ بناتی ہے۔"

ایک بے جان سی مسکراہٹ رمشا کے پپڑی زدہ ہونٹوں پر ہلکی سی چھب دکھا کر معدوم ہو گئی۔

"اچھا! اب زیادہ منتیں مت کرواؤ اور جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔"

عدیل طے شدہ منصوبے کے عین مطابق چل رہا تھا پھر بھی نجانے کیوں کھڑکی سے لگی روحی کا دل رک رک کر دھڑک رہا تھا۔

"سنو! یہ صحن کی حالت دیکھی ہے؟" رمشا نے اس کے پکارنے پر باورچی خانے کے دروازے میں رک کر عدیل اور صحن دونوں کو باری باری دیکھا۔

"ہمارے گھر کی لڑکیاں اب اتنی بھی بدسلیقہ نہیں کہ کیچڑ زدہ صحن میں چلتی پھرتی رہیں۔"

رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر گھنٹہ بعد ہی صحن شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔

اب یہ اکثر ہونے لگا۔ رمشا کو مصروف رکھنے کے لیے عدیل کوئی نہ کوئی کام نکالتا رہتا اور رمشا اسے کر بھی ڈالتی۔

کبھی چچی امی کی پکار ہر لمحہ روحی کے تعاقب میں رہتی تھی' خاص طور پر شجی بھیا کے کام وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے ذمہ لگاتیں۔ نبیل چھوٹا تھا اس لیے روحی بن کہے ہی اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتی لیکن عدیل نے اسے کبھی آواز نہیں دی تھی۔ وہ اکثر اپنے کپڑے خود استری کر لیتا۔ چائے بھی خود ہی بناتا کبھی کبھار تو اپنے کمرے کی جھاڑ پونچھ بھی خود ہی کر لیتا تھا۔ اب وہ ان کاموں کے لیے رمشا سے کہنے لگا تھا۔

روحی کو چچی امی کی ماسی ہونے کا طعنہ دینے والی لڑکی اب بھاگ بھاگ کر عدیل کے کام کرنے لگی۔

رمشا زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ ایک بدلاؤ روحی کو عدیل کی شخصیت میں بھی محسوس ہونے لگا تھا وہ کم گو اور سنجیدہ سا لڑکا اب بات بات پر ہنس دیتا۔ اکثر شام میں وہ ان تینوں بھائی بہنوں کو چہل قدمی کے

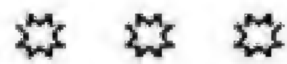
بہانے قریبی پارک لے جاتا۔ پھر وہ اور رمشا کسی بینچ پر بیٹھے سارا وقت باتوں میں مصروف رہتے جبکہ روحی رمیز کے پیچھے ایک سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے جھولے تک بھاگتے بے حال ہوتی رہتی۔ بقول عدیل وہ رمشا کو ایک ٹھہرے ہوئے خاص لمحے سے نکالنا چاہتا تھا۔ روحی کو لگتا جیسے وہ خود کسی لمحے کی گرفت میں آگیا ہے۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب عدیل' رمشا کو کیرم کھیلنے کے لیے رضامند کرتا کیرم تو وہ لوگ پہلے بھی کھیلتے تھے' رمشا اور شرجیل آمنے سامنے رہتے' وہ نبیل اور روحی میں سے اپنا اپنا ساتھی چن لیتے۔ شجی بھیا کے لاکھ کہنے کے باوجود عدیل کبھی بھی ان کے کھیل میں شامل نہ ہوتا وہ پاس ہی کرسی یا مونڈھے پر بیٹھ کر کتاب کھول لیتا اور وقتاً" فوقتاً" لقمے دیتا رہتا۔ روحی جیت جاتی تو خوشی اس کی آنکھوں سے بھی چھلکنے لگتی۔ رمشا اور شجی بھیا اکثر گوٹ چھپا لیتے تو وہ ان کی چوریاں پکڑ لیتا۔ آخر میں شجی بھیا سب کو آئس کریم کھلانے لے جاتے مگر عدیل کو عین وقت پر کوئی اہم کام یاد آجاتا۔

''لگتا ہے بورڈ میں اس بار ٹاپ تمہیں کرنا ہے۔'' شجی بھیا اسے چھیڑتے۔

''ہاں یار! کوئی مقام بنانا ہے تو محنت کرنا پڑے گی۔'' وہ سنجیدگی سے جواب دیتا۔

''مقام تو ہمیں بھی بنانا ہے مگر وہاں جاکر۔'' شجی بھیا کا جاندار قہقہہ رمشا بجو کی آنکھوں کی لو بجھا دیتا۔



''یہ ڈائری آپ نے کہاں سے لی؟'' روحی اپنے اور رمشا کے مشترکہ کمرے میں آئی تو وہ ایک ڈائری پلنگ پر رکھے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ یہ وہی ڈائری تھی جو روحی نے چند روز قبل ایک اسٹیشنری شاپ (کتابوں کی دکان) پر دیکھی تھی۔ کالج سے واپسی پر وہ ایک کتاب لینے کے لیے رکی تھی جہاں عدیل کو یہ ڈائری اچانک پسند آگئی تھی۔

''عدیل نے دی ہے۔ کہہ رہا تھا سوچیں جمع کرکے دماغ پگھلانے کی ضرورت نہیں' اس میں لکھ دیا کرو۔'' وہ چہکی تھی۔

''ہوں! اچھی بات ہے۔'' روحی نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی ''لاؤ ہم بھی تو دیکھیں کیا لکھا ہے آپ نے۔''

''اوں' ہوں! ہر ایک کو دکھانے کی چیز نہیں ہے۔'' جیسے ہی روحی نے آگے بڑھ کر ڈائری کے کھلے صفحات پر نظر دوڑانا چاہی رمشا نے اسے بند کرکے اٹھا لیا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب کے روحی کے چہرے سے زبردستی کی مسکراہٹ بھی غائب ہوگئی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے لڑکیو!'' عدیل دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر آگیا۔

''کچھ خاص نہیں' تم بتاؤ کیا پلان ہے؟'' روحی سے پہلے ہی رمشا نے جواب دیا۔

''ہاں! میرے پاس واقعی ایک خاص پلان ہے۔'' عدیل کی نظریں رمشا پر مرکوز تھیں روحی سر جھکا کر ناخن دیکھنے لگی۔

''وہ کیا؟'' رمشا کا اشتیاق قابل دید تھا۔

''عید آرہی ہے تو سوچا تم لوگوں کو عید کے جوڑے دلوا دیے جائیں' کیوں روحی؟'' عدیل کی یادداشت شاید ابھی ابھی واپس آئی تھی۔

''نہیں! مجھے تو چچی امی نے دلوا دیا ہے' تم لوگ جاکر لے آؤ۔'' اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا۔

عدیل کے چہرے پر خفگی کی ہلکی سی پرچھائیں ظاہر ہوئی تھی لیکن رمشا حیران کردینے کی حد تک پرسکون تھی۔ چچی امی روحی کو اکثر ہی کچھ نہ کچھ دلوا دیا کرتی تھیں۔ تب رمشا ان اشیا کی اٹھا پٹخ کے ساتھ روحی کو خوب باتیں بھی سناتی۔

''چچی کی شاپنگ کا بوجھ اٹھانے ساتھ گئی تھیں اسی کا معاوضہ دیا ہے تمہیں۔''

اور اب ان ہی چچی کے بیٹے کے ساتھ خریداری پر جانے کے لیے وہ جھٹ پٹ تیار ہوگئی تھی۔

اپنی جگہ پر گم صم بیٹھی روحی کھلے دروازے سے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی ان کا ہنستا مسکراتا ہوا ساتھ 'آنے والے دنوں کے لیے شاید تقدیر کو بھی بھا گیا تھا۔



"خالہ امی! آپ ہمارے گھر رہ جائیں نا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کبھی نہ جائیں۔" سوہا' رمشا کی گود میں سر رکھے مچل رہی تھی۔ کریلے چھیلتے ہوئے روحی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"آپ کو بہت مزے کی کہانیاں آتی ہیں۔ ہماری مما کے پاس تھوڑی سی کہانیاں ہیں وہی بار بار سنا دیتی ہیں۔" اس کے گھٹنے سے لگ کر کھڑی سویرا نے بھی اپنی توتلی زبان میں گویا اہم راز افشا کیا۔

"سچ ہی تو کہہ رہی ہیں دونوں۔ میری کہانیاں تو کب کی ختم ہو گئیں۔" روحی کے دل میں ہوک اٹھی تھی۔

"خالہ امی! آپ بہت اچھی ہیں۔ ہمارے ساتھ کارٹونز بھی دیکھتی ہیں اور ہوم ورک بھی خود کرواتی ہیں۔ ہماری مما تو......"

"سوہا۔" روحی کے جھڑکنے پر سوہا سہم کر خاموش ہو گئی۔

"بیٹا! آپ لوگ ہوم ورک کر لو پھر کارٹون بھی دیکھیں گے۔" رمشا نے دھیمی آواز میں دونوں کو پچکارا اور روحی سے نظریں چرا کر دیکھتے ہوئے خود بھی اٹھ گئی۔

عدیل' رمشا کو اس کی کسی سہیلی کی گھر سے لائے تھے۔ سہیلی کے گھر کا پتا اور رمشا کے وہاں موجود ہونے کے بارے میں معلومات عدیل کو کیسے حاصل ہوئیں اس کے متعلق کچھ بتانا انہوں نے ضروری خیال نہ کیا تھا اور روحی کی سوچوں کا جال مزید الجھ گیا تھا۔ ذہن منتشر تھا تو بنتے کام بھی بگڑ رہے تھے۔

کل رات بریانی بنائی تو چاول زیادہ گل کر چپک گئے۔

"یہ بریانی ہے یا کھچڑی؟" عدیل نے پلیٹ اور اسے باری باری گھورا۔

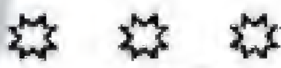
رمشا کھلکھلا کر ہنس دی۔ روحی کا دل چاہا' وہ بھی جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر کہہ دے "کھچڑی تو ڈرائنگ روم میں پک رہی تھی۔ قہقہوں کا تڑکا کچن تک سنائی دیتا تھا ایسے میں بھلا اچھی بریانی کیسے بنتی۔"

آج صبح عدیل اور رمشا چہل قدمی کے لیے نکل گئے اور اس کے سارے سلائس جل کر کوئلہ ہو گئے آملیٹ میٹھا بنا اور چائے نمکین 'اب وہ قیمہ کریلے بنانے کی تیاری کر رہی تھی......

"اک عرصہ ہو گیا رمشا! تمہارے ہاتھ کے بنے قیمہ کریلے نہیں کھائے۔" راہداری سے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے عدیل نے اونچی آواز میں رمشا کو مخاطب کیا۔

"روحی! آج تم آرام کرو' کھانا رمشا بنا لے گی۔" فرمان جاری ہوتے ہی روحی نے سبزی کی ٹوکری چپ چاپ رمشا کے حوالے کر دی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"کھانے کا مزا تو اب آئے گا' چھٹی وصول ہو جائے گی۔" عدیل کی خوشی سے بھرپور آواز اسے یہاں تک سنائی دی تھی۔ گرم سیال چپکے چپکے اس کے گالوں کو بھگونے لگا۔



"بجو! آج تو ہم آپ کو لیے بغیر نہیں جائیں گے۔" رمیز نے بہت مان سے رمشا کا ہاتھ تھاما۔ وہ کئی روز سے مسلسل انہیں گھر واپس چلنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ کبھی عدیل منع کر دیتے تو کبھی سوہا اور سویرا آڑے آجاتیں۔ وہ بھی نہایت مستقل مزاجی سے روز ہی چلا آتا۔ آج تو صائمہ بھی ہمراہ تھی۔ وہ خاصی پشیمان لگ رہی تھی لیکن رمشا کا رویہ بدستور ہتک آمیز تھا۔ انہوں نے صائمہ کے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ گفتگو کے لیے ایک دوبار کی ناکام کوشش کے بعد اب وہ کونے میں لگی بیٹھی تھی۔ اور بجو کا لاڈلا رمیز ان کی



منتیں کر رہا تھا۔

"بجو! عید کی آمد ہے۔ آپ اپنے گھر چلیں ناکہ ہم بھی عید کی خوشیاں منا سکیں۔ ابھی قربانی کا جانور بھی لینا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو تو میں اس طرف توجہ دوں۔"

اب وہ روحی کی جانب مدد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں چرالیں۔

"میرے جانے سے تو تمہارے مسئلے کئی گنا بڑھ جائیں گے۔" رمشا نے روٹھے پن سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

"عید تو ہر سال آتی ہے بلکہ سال میں دو مرتبہ۔ اس میں نیا کیا ہے؟" عدیل پہلی بار بولے۔

"سنا ہے، نبیل آرہا ہے بیوی بچوں سمیت۔" روحی کی بات پر رمشا اور عدیل بیک وقت چونکے۔

"تم سے کس نے کہا؟" عدیل کے متوازن لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"جویریہ کا فون آیا تھا۔" روحی نے نبیل کی بیوی کا نام لیا اسے اپنا آپ بلاوجہ چور سا محسوس ہونے لگا۔

"ہا.... ہاں، اطلاع تو مجھے بھی ہے مگر نبیل کہہ رہا تھا ابھی کنفرم نہیں ہوا۔" عدیل کے ہکلانے کی وجہ روحی کے لیے ناقابل فہم تھی۔

"بجو! صائمہ نے آج کچھ خاص انتظامات کر رکھے ہیں آپ کے استقبال کے لیے۔" پہلو بدلتی ہوئی بات کو رمیز نے عین وقت پر دامن سے پکڑ کر واپس لا کھڑا کیا۔

"ادھر آکر بتاؤ نا صائمہ!" وہ اچھا شوہر ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

صائمہ بھی جھٹ سے اٹھ کر رمشا بجو کے گلے کا ہار بن گئی۔ جواباً" ان کا دل بھی کچھ نرم پڑا۔

"رمیز! رمشا یہ عید ہمارے ساتھ کرے گی۔" عین وقت پر جب سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ عدیل حتمی فیصلہ سنا کر اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

خوشی کی طرح غم کا بھی اپنا ہی ایک رنگ ہوتا ہے۔ دکھ، اذیت، اداسی اور کبھی کبھی پچھتاووں میں ڈوبا ہوا یہ رنگ ہر چہرے پر مختلف عکس اور الگ زاویوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک ہی غم کسی چہرے پر ہلکی سی پرچھائیں بن کر نظر آتا ہے تو کسی چہرے کو مکمل تاریکی میں بدل دیتا ہے۔ کہیں اس کا سایہ عارضی ہوتا ہے تو کہیں سمندر دلوں میں اتر کر ہر چیز کو فنا کر دیتا ہے۔

شجی بھائی نے غم کا یہ رنگ خود اپنے ہاتھوں سے گھر کے ہر فرد کے چہرے پر مل دیا تھا۔ انہوں نے خود سے دس سال بڑی ایک امریکن شہری کیرن سے شادی کرلی تھی۔

چچا نے اس غم کو ایسا دل سے لگایا کہ بستر کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی کراہوں میں چھپی سسکیاں روحی کے آنسوؤں میں مزید اضافہ کر دیتیں۔ امی کے کام بھی مزید طول پکڑ گئے تھے۔ وہ ہنڈیا بھونتیں تو بھونتی ہی چلی جاتیں۔

"امی، امی! ہنڈیا جل رہی ہے۔" اس کے بار بار پکارنے پر "جانے کتنے زمانوں کی دوری سے لوٹتیں کہ انہیں روحی کی بات سمجھ میں ہی نہ آتی، بے بسی سے اسے دیکھنے لگتیں۔

"شجی بھیا پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ امی! رمشا کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔" وہ انہیں سمجھانا چاہتی مگر وہ سنتی ہی کہاں تھیں گندھے ہوئے آٹے کو دوسری پھر تیسری بار گوندھنے بیٹھ جاتیں۔

چچی امی کا رد عمل روحی کی سمجھ سے باہر تھا۔ کبھی وہ بہت خوشی خوشی شجی کی ولایتی دلہن کا تصوراتی سراپا سوچ سوچ کر خوش ہوتیں اور دھیمی آواز میں سہرے گانے لگتیں۔ پھر اچانک کسی سوچ کے زیر اثر غمگین ہو جاتیں اور پہروں گم صم رہتیں۔ مگر وہ ہستی جس سے روحی کو سب سے زیادہ رد عمل کی توقع تھی بالکل پُرسکون، اپنے روزمرہ کے معمولات میں اس طرح سے مصروف تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"شجی بھیا کا یہاں سے چلے جانا ہی ایک غلط قدم تھا۔ اگر انہیں واقعی رمشا بجو سے محبت تھی تو یہاں رہ کر اپنا مقدمہ لڑتے۔ حقیقت سے نظریں چرا کر

انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ رمشا بجو کو بھی دکھ دیا۔ بنا کوشش کے ہی ہار مان لینا تو بزدلی ہے۔" روحی کے دل کی بات آج پہلی بار زبان پر آئی تھی۔ وہ دونوں اسی کیفے میں بیٹھے تھے۔ آج وہ روحی کے کہنے پر یہاں آئے تھے۔ دل پر دھرا منوں بوجھ آخر کسی سے تو بانٹنا تھا اسے۔

گھر بھر میں عدیل ہی وہ واحد شخص تھا جس نے بڑے حوصلے سے ساری صورت حال کا سامنا کیا تھا۔ اسے بھی عدیل پر مان تو بہت تھا۔ لیکن کئی روز سے اس کے لیے دل میں موجود ننھا سا جذبہ ہولے ہولے دوش پر تھا۔ دل میں بسا چہرہ خود سے دور کہیں بکھا میں چھپا ہوا نظر آتا۔ مگر اس کے علاوہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔۔۔۔ امی کا دکھ تو چپ رہ کر بھی بھرے ہوئے چھالوں کی طرح رستا تھا روحی ان کی اذیتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تو کیا تم واقعی نہیں جانتیں؟" میز پر پڑی کی رنگ سے کھیلتے ہوئے عدیل نے چونک کر روحی کو دیکھا۔

"کیا؟" وہ اپنی یادداشت کے سبھی کونوں کھدروں میں جھانک آئی۔

"شجی بھیا کے مقدمے کا فیصلہ دوٹوک ہو چکا تھا ورنہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے ہرگز نہیں تھے۔ ہر کوشش ہر حربہ ناکام گیا کیا جتن نہیں کیے انہوں نے۔ وہ نکاح کر کے رمشا کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن آخر میں تو وہ اس بات پر بھی راضی ہو گئے کہ فی الحال صرف نکاح کر دیا جائے اور رخصتی دو سال بعد ان کی واپسی پر۔ لیکن امی کا ایک ہی جواب تھا۔

"میں نے بچپن سے تیرے لیے جسے سوچ رکھا ہے تیری بیوی بن کر اس گھر میں صرف وہی آئے گی۔ کم از کم میری زندگی میں کچھ اور ممکن نہیں۔"

اسے حیرتوں میں ڈال کر وہ خود ایک بار پھر چابی کے چھلے سے کھیلنے لگا تھا۔

چچی امی کے رویے میں رمشا بجو کے لیے ناپسندیدگی ہمیشہ سے تھی لیکن اسے وہ رمشا بجو کے رویے سے مشروط سمجھتی تھی۔ کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب رمشا نے چچی امی سے بدلحاظی سے بات نہ کی ہو۔

"اب اگر ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو ایک بات اور بھی بتا دوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "رمشا نے شجی بھیا کی آفر قبول نہ کر کے امی ابا پر اس گھر پر بلکہ ہم سب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"کون سی آفر۔۔۔!" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بہ مشکل بولی۔

"رمشا اگر شجی بھیا کے ہمراہ گھر سے چلی جاتی تو ہم سر اٹھا کر کبھی نہ چل سکتے۔ اس نے اپنی محبت کو تو مار ڈالا مگر ہم سب کی عزت بچالی۔" بے تاثر گفتگو کرنے والے عدیل کے لہجے میں آج جذبات بول رہے تھے۔ روحی گم گنگ بیٹھی اسے دیکھنے لگی۔

"تو احسان اتار رہے ہو تم آج کل؟" روحی کی نظروں میں رقم تھا۔ مگر اس کے الفاظ حلق سے جا چپکے تھے۔ وہ بولتی بھی تو کیا۔ بے خبری نہیں وہ بے وقعت بھی تھی۔ ایک کہانی رمشا اور شرجیل کی تھی جو شاید اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ دوسری کہانی رمشا اور عدیل کی تھی جو شروع ہوا چاہتی تھی، نہیں، بلکہ کب سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

روحی کے الفاظ ہی نہیں کھوئے تھے اس کا کردار بھی کسی گم نام کہانی کی بھول بھلیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ کون تھی کیا تھی، کس کہانی کا حصہ تھی یہ سب باتیں اب بے معنی تھیں۔

بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو اس نے بے دردی سے پونچھ ڈالا اور چادر سنبھالتے ہوئے اٹھ گئی۔ کیفے سے باہر آتے ہوئے خود سے چند قدم پیچھے چلتے، اس شخص کے لیے دل کے کسی کونے سے ایک خواہش ابھی بھی ابھر رہی تھی۔

"کاش! وہ اتنا تو پوچھتا تم کیوں رو رہی ہو۔"



آج انکشافات کا دن تھا۔ گھر لوٹی تو چچی امی منتظر تھیں۔ عدیل اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر کہیں

چلا گیا تھا۔ اندر آئی تو چچی کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔

"میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر پلٹ گئیں۔

"شجی نے جو کچھ بھی کیا میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔" اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ بلا تمہید شروع ہو گئیں شاید ان کے صبر کا پیمانہ بھی اب لبریز ہو چکا تھا۔ روحی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ان کے قریب جا بیٹھی۔

"وہ میرا سب سے تابعدار بیٹا تھا۔ تم نے بھی ہمیشہ سگی ماں کی طرح میرا احترام کیا ہے۔ تم دونوں کی جوڑی جچتی بھی بہت تھی۔"

"کیا!" روحی کو لگا وہ زمین میں گڑے نوکیلے پتھروں کی زد میں آ گئی ہے۔

"کیا کیا نہ سوچا تھا میں نے تم دونوں کے لیے۔ مگر میرے ارمانوں کو حاسدوں کی نظر لگ گئی۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "لیکن فکر مت کرو، تم میری بیٹی ہو میری ہی رہو گی، شرجیل نہ سہی، عدیل ہے نا۔ ویسے اس بدھو کے لیے تو میں نے الماس آپا کی مائرہ کا سوچ رکھا تھا۔ چلو خیر اب جو خدا کو منظور۔" انہوں نے اس کی رائے نہیں پوچھی تھی اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"ان شاء اللہ، آج ہی سب طے ہو جائے گا۔ تمہارے چچا نے بتول بھابھی کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔" دوپٹا سنبھالتی وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔

"تم تھوڑی دیر میں چائے دے جانا۔" رک کر کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

اور وہ سوچ رہی تھی کہ چچی امی کے اس فیصلے پر اسے خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔ جو نام اس کی ہر سانس ہر دھڑکن میں تھا، آج ہاتھوں کی لکیروں میں بھی لکھ دیا جائے گا۔ مگر کیا وہ خود بھی اس کا تھا؟

لامتناہی سوچوں کا جال اس کے وجود سے چمٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میرا بھائی ہسپتال کے بستر پر آخری سانسیں لیتے ہوئے ایک آخری خواہش میری مٹھی میں دے گیا تھا اور میں اتنا بے بس ہوں کہ ایک مرتے ہوئے شخص کو دیا قول بھی نہ نبھا سکا۔" چچا میاں کے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے ان کی پژمردہ آواز ابھری تھی۔

وہ نجانے کیا سوچ کر یہاں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے اس معاملے میں گھسیٹنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میرے پہلے فیصلوں پر کب عمل درآمد ہوا ہے، جو اب نئے فیصلے کروں۔ تم ماں بیٹوں کے جو جی میں آئے کرو۔" ان کی آواز نم تھی۔ روحی کی آنکھوں نے چپکے سے چچا کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

"آپ سے کچھ پوچھنا تو گناہ ہے، بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ رمشا ہو یا روحی، دونوں ہی آپ کے مرحوم بھائی کی بیٹیاں ہیں۔ ادھر شرجیل اور عدیل بھی آپ کے بیٹے پھر پچھتاوا کیسا۔ شجی نے تو اپنی مرضی کر ڈالی۔ اب اس سے پہلے کہ عدیل بھی اس کی راہ چلے، ہمیں گڑے مردے اکھاڑنے کے بجائے کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔" چچی کی بات پر کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

"قیامت کے دن میرا بھائی دامن پکڑ کر پوچھے گا کہ تو نے کہا تھا رمشا، شجی کی امانت ہے تو کیا جواب دوں گا۔" کچھ توقف کے بعد چچا نے پھر کہا تھا جسے چچی نے نظر انداز کر دیا۔

"بتول! تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتاؤ۔" جواب میں امی نے شاید نفی میں سر ہلا دیا تھا جب ہی چچی امی کے لہجے سے خوشی جھلکنے لگی تھی۔

"بس پھر ٹھیک ہے رمشا کے لیے جس رشتے کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا انہیں بھی بلا لیتے ہیں۔ اگر بات بن گئی تو عدیل اور روحی کے نکاح کے ساتھ ہی رمشا کی بھی کوئی رسم وغیرہ کر دیں گے۔"

وہ نجانے اور کیا کیا کہہ رہی تھیں، روحی سن نہ پائی۔ اسی وقت عدیل اور نبیل جھگڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے اور روحی کو دروازے سے ہٹنا پڑا۔

"کتنی بار منع کیا ہے ان لڑکوں کے ساتھ اسنوکر کھیلنے مت جایا کرو۔ وہ اچھے لڑکے نہیں ہیں۔" عدیل

غصے سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں چھوڑ سکتا' وہ دوست ہیں میرے۔" نبیل بدلحاظی سے بولا۔

"سارے علاقے کے غنڈے اور چھٹے ہوئے بدمعاش ہی رہ گئے ہیں تمہارے دوست بننے کو۔ آخری بار منع کر رہا ہوں خبردار! تمہیں دوبارہ ان کے ساتھ نہ دیکھوں۔" عدیل کی آواز کچھ بلند ہوئی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔ یہ اچھائی اور برائی کے پیمانے اپنے پاس ہی رکھو۔ جانتا ہوں میں تمہارے بھی سب کرتوت۔" نبیل غصے میں چلّاتے ہوئے تہذیب و اخلاق کی حدود پھلانگ رہا تھا۔

اس شور و غل پر چچی امی اور امی کے پیچھے چچا بھی چھڑی کے سہارے باہر آ گئے۔ دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر رمشا چھت سے نیچے آئی تھی اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں محلے کے لڑکوں کے ساتھ اسنوکر کھیلوں تو برا ہوں' خود گھر کی دونوں لڑکیوں سے معاشقہ چلاتے رہو تب بھی کوئی برائی نہیں۔ ان کے ساتھ گھومو پھو' ڈیٹ مارو سب جائز۔" نبیل کے الفاظ کوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔

"بکواس بند کرو ورنہ تمہارا منہ توڑ دوں گا۔" عدیل نے گھر والوں سے نظریں چرائی تھیں تو رمشا اور روحی کے سر بھی جھک گئے تھے۔

"اپنی دم پر پاؤں آیا تو کیسے....." نبیل کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے چچی امی نے آگے بڑھ کر اس کے گال پر طمانچہ مارا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تو اتنا بے غیرت ہو جائے گا کہ ماں بہن کی تمیز بھول جائے گا۔ سب کان کھول کر سن لو' اگلے جمعہ روحی اور عدیل کا نکاح ہے۔ رمشا! کل کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں ہو سکتا ہے ان کے نکاح کے ساتھ تمہاری منگنی بھی ہو جائے۔" ایک ہی سانس میں بہت حوصلے سے سب کہہ کر وہ واپس پلٹیں اور بتول کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

چچا کے دکھ کا بھاری بوجھ چھڑی کے ناتواں کندھوں پر گراں ہوا تو وہ لرزنے لگی اور چچا دروازے کے سہارے دہلیز پر ہی بیٹھتے چلے گئے۔

رمشا کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو باری باری دیکھتی رہی پھر اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ اسی رات اس نے چھری سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ ڈالی تھیں۔



"امی! آپ چچی امی کے ساتھ گھر چلی جائیں۔ دو راتوں سے مسلسل جاگ رہی ہیں۔ اس طرح تو آپ خود بیمار پڑ جائیں گی۔ آج رمشا کے پاس میں رہ لوں گی۔" روحی نے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بتول چچی! روحی ٹھیک کہہ رہی ہے آپ لوگ گھر جائیں۔ نبیل چھوڑ آئے گا۔ رمشا کی بالکل فکر مت کریں ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں۔ اب یہ خطرے سے باہر ہے پھر میں بھی یہیں ہوں۔" عدیل نے بھی انہیں دلاسا دیا۔

نبیل ٹیکسی لینے چلا گیا تو اس نے بتول چچی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر بینچ سے اٹھایا اور سہارا دے کر آہستہ آہستہ ان کے ساتھ چل پڑا۔

"امی! آپ ابا کو حوصلہ دیجیے گا ان کی صحت اب مزید کوئی پریشانی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔" عدیل کھانے کے برتن سمیٹتی ہوئی چچی سے مخاطب تھا۔

وہ لوگ رخصت ہوئے تو روحی' رمشا کے بیڈ کے پاس چلی آئی۔ کمبل درست کیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔ مختلف قسم کی نالیوں میں جکڑا ہوا اس کا وجود بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ سیاہ حلقے بند آنکھوں کے گرد مزید نمایاں ہو رہے تھے۔

"رمشا بجو! یہ کیا کر ڈالا' آپ ایسی تو نہ تھیں۔" روحی کا دل بھر آیا۔

دو روز قبل اس پر اذیت رات میں جب روحی' نبیل کی باتوں کی بازگشت سے چھپنے کی کوشش میں بستر

پر کروٹیں بدل رہی تھی تو رمشا کی بے کلی بھی اس سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی اور پانی پینے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ پھر جب وہ کافی دیر بعد بھی نہ لوٹی تو روحی کو عجیب و غریب وہم ستانے لگے۔

وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ کچن کے دروازے تک آئی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی ایک دلخراش منظر نے اسے بے اختیار چیخنے پر مجبور کر دیا رمشا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی۔

اس کا کافی خون ضائع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا اگر مزید کچھ دیر اسے اسپتال نہ لایا جاتا تو اس کا بچنا ناممکن تھا۔ اس کا بلڈ گروپ گھر میں صرف شرجیل اور نبیل سے ملتا تھا۔ نبیل کم عمر بھی تھا اور گھر والے اس کے گزشتہ رویے پر شاکی بھی تھے لیکن اس نے ضد کر کے اپنا خون رمشا کو دیا۔ اس عمل میں شاید ایک احساس ندامت بھی تھا۔ وہ طیش میں آ کر اپنی حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ مگر اب پشیمانی حد سے سوا تھی۔ اوائل عمری کے ناپختہ ذہن نے جس منظر کو جس انداز میں دیکھا، سمجھا کہہ ڈالا۔

ہلکی سی کراہ پر روحی دوبارہ رمشا کی طرف متوجہ ہوئی لیکن وہ خواب آور گولیوں کے زیر اثر سو رہی تھی ارد گرد بے مقصد نظر دوڑاتے ہوئے اسے امی کا بٹوہ میز پر پڑا نظر آ گیا۔

"اوہ! اب وہ گھر جا کر مزید پریشان ہوں گی۔" بٹوہ اٹھا کر وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگی۔ مگر بے سود' وہ لوگ جا چکے تھے عدیل بھی اسے کہیں نظر نہ آیا تو واپس آ گئی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں' تم جو کہو گی' وہی ہو گا۔ مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔" یہ عدیل کی آواز تھی جو کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس کی سماعت سے ٹکرائی تو قدم خود بخود رک گئے۔ رمشا بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہی تھی جسے وہ صرف بھنبھناہٹ کی صورت سن سکتی تھی۔ لیکن عدیل کے الفاظ واضح تھے

"تم تندرست ہو کر ایک بار گھر آ جاؤ۔ پھر میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"ہاں بھئی! پکا وعدہ۔ لیکن تم بھی وعدہ کرو۔ ایسی حرکت دوبارہ نہیں کرو گی۔ ایسا کرتے ہوئے تمہیں اس دل کا خیال بھی نہیں آیا جو صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔"

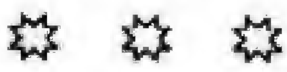
روحی کا دل ڈوبنے لگا۔

"بس! اب چپ ہو جاؤ۔ میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔" وہ رمشا کا ہاتھ تھامے بہت اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

روحی میں مزید وہاں کھڑے ہونے کا یارا نہ رہا تو الٹے پاؤں پلٹ آئی۔ آج اسے بہت فرصت سے رہنا تھا۔ پانی کے یہ چند قطرے ہی فقط اس کے اختیار میں تھے۔ جنہیں جب چاہے' بہا سکتی تھی۔

"رمشا بجو! میں نے ارادتاً" آپ کو بھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ آپ کی خوشیوں کے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں مانگیں۔ دوسروں کے عتاب سے بچانے کے لیے ہمیشہ آپ کے حصے کے کام بھی اپنے سر لیے تاکہ آپ خوش رہ سکیں۔ مگر آپ مجھ سے آج تک راضی نہ ہو سکیں۔ اب میرے دل کی اکلوتی خوشی بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہیں..... ٹھیک ہے اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

بہت عجیب فیصلہ کیا تھا اس نے ساتھ ہی روانی سے بہتے ہوئے آنسو بھی تھم گئے تھے۔



"میری کچھ شرائط ہیں اگر انہیں مان لیں تو مجھے بھی آپ کا فیصلہ بخوشی قبول ہے۔" عدیل نے کھڑے ہو کر اٹل لہجے میں کہا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے گھر کے تمام افراد کو چچا کے کمرے میں جمع کیا تھا۔ ضروری بات کا سن کر روحی کو اسپتال میں کیے اس کے عہد و پیمان یاد آ گئے۔

"روحی سے نہیں' میں رمشا سے شادی کروں گا۔" روحی کے رک کر دھڑکتے ہوئے دل نے ہشن

گوئی کی۔ مگر وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔
"نمبر ایک، رمشا کو کوئی شادی کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔" عدیل نے انگلیوں پر شرائط گنوانا شروع کیں۔
"آخر کب تک؟" چچی امی پہلی شرط پر ہی خاموش نہ رہ سکی تھیں۔
"جب تک وہ خود نہ چاہے۔" عدیل نے چچی پر ایک انتہائی سنجیدہ نگاہ ڈالی۔ چچی زیر لب بڑبڑانے لگیں جسے نظر انداز کر کے وہ اگلی شرط پر پہنچ گیا۔
"نمبر دو، روحی سے میرا نکاح تین ماہ بعد ہو گا، جب تک میرا رزلٹ بھی آجائے گا اور میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری بھی تلاش کرلوں گا۔" اس مرتبہ سب خاموش رہے۔
"نمبر تین، ہم شادی کے بعد الگ رہیں گے۔ میں کرائے کا مکان ڈھونڈ رہا ہوں، جلد مل جائے گا۔" آخری شرط روحی سمیت سب کے لیے خاصی ناقابل ہضم تھی لیکن وہ دوسروں کا ردعمل دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔
چاروناچار اس کی تمام شرائط کو من و عن مان لیا گیا تھا۔ نکاح کی سادہ سی تقریب کے بعد وہ عدیل کے ہمراہ اس مکان میں آبسی، جو کمپنی کی طرف سے عدیل کو ملا تھا۔ یہ بہت اچھا سا گھر اس بہت اچھی ملازمت کے طفیل تھا جو نتیجہ نکلتے ہی عدیل کو مل گئی تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔
یوں روحی کی نئی زندگی کا آغاز ایک بالکل بدلے ہوئے شخص کے ساتھ بہت روکھے پھیکے انداز میں ہوا تھا۔ جس کے نزدیک وہ صرف بیوی تھی گھر والی اور گھر سنبھالنے والی۔ محبت کا دعوا عدیل نے پہلے بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ مگر کچھ باتیں الفاظ کا روپ دھارے بنا ہی بہت خوب صورتی سے اپنا آپ سمجھا جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے روحی ان کہی باتوں کے حسن پر ایمان لانے والوں میں سے تھی۔ اسی لیے آج اس کے پاس عدیل کے دل سے رمشا نام کی تختی اتار دینے کا کوئی ایک حق بھی نہ تھا۔ جبکہ رمشا پورے حق کے ساتھ ان دونوں کے درمیان آج بھی موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

"سفید بکرا میرا ہے اس کو چارا میں کھلاؤں گی۔ تم وہ کالا بکرا لے لو۔" سوہا نے اپنے تئیں قربانی کے بکروں کی منصفانہ تقسیم کی۔
"نہیں مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ میں اکیلی اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔" سویرا ڈرتے ہوئے بڑی بہن کے پاس آکھڑی ہوئی۔
"ٹھیک ہے ہم دونوں مل کر انہیں باری باری چارا کھلا دیتے ہیں۔" سوہا نے مدبرانہ انداز سے بہن کو پرچایا۔
کھڑکی میں کھڑی روحی کی ممتا بھری نظروں نے دونوں بیٹیوں کی بلائیں لیں۔ جن کے زمانے کی فکروں سے بے نیاز چہروں پر چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے روشنی بکھری ہوئی تھی۔
وہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور الماری سے استری کے لیے عید کے کپڑے نکالنے لگی۔ اسے اپنی بچپن کی عیدیں بھی یاد آنے لگیں۔ کس قدر پرمسرت ہوتے تھے وہ دن، ہر فکر سے آزاد بڑی سے بڑی فکر بس عید کے کپڑے اور جوتے مل جانے تک کی ہوتی۔ امی ان تینوں بھائی بہنوں کو عید کی چیزیں دلواتیں تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ چچی امی بھی ہر عید پر روحی کے لیے جوڑا لینا نہ بھولتی تھیں یہ روایت انہوں نے اس کا بچپن گزر جانے کے بعد بھی جاری رکھی حتیٰ کہ شادی کے بعد بھی جب عدیل اسے لے کر کرائے کے مکان میں آبسا تھا۔ روحی کو خود اپنے لیے عید کا جوڑا بنانے کی عادت ہی نہ تھی۔
چچی کی وفات کے بعد پچھلے چند سالوں سے یہ فریضہ خود عدیل نے سنبھال لیا تھا۔ وہ بنا پوچھے بنا کچھ کہے خاموشی سے اس کے لیے عید کا سوٹ لاکر کمرے میں رکھ دیتے۔ وہ بھی خاموشی سے اٹھا کر استری کر کے بچوں اور ان کے اپنے جوڑے کے ساتھ الماری میں لٹکا دیتی۔

مگر یہ عید اس کی زندگی کی نرالی عید تھی سالہا سال کی روایت کیا وہ تو اسے بھی بھولے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں آئی نمی پونچھ کر وہ سوہا اور سویرا کے استری شدہ کپڑے ہینگر میں لگانے لگی۔

"بزرگوں کی خوشنودی حاصل کرنا اس قدر بھی دشوار نہیں وہ ہماری تھوڑی سی محبت اور ذرا سی توجہ اور احترام کے منتظر ہی تو ہوتے ہیں۔" چچی امی کی یاد سے جڑا ایک خیال اس کے ذہن سے گزرا۔

"بجو!! یہی وہ کنجی تھی آپ کی خوشیوں کے دروازے کی' جو آس پاس ہونے کے باوجود عمر بھر آپ کو کبھی دکھائی ہی نہ دے سکی۔ کیسے نظر آتی۔ اپنے ہی ارمانوں کی دھول اڑائے رکھی۔ ہر کچھ اس دھول کے غبار میں چھپا رہا۔ پھر.... پھر ایسا کیا تھا کہ چچی کے انتقال پر...."

وہ قریبی کرسی پر گر کر رونے لگی کیا کیا نہ تھا جو یادوں کے دریچوں پر دستک دے رہا تھا۔ وہ دن جب چچا راہی عدم ہوئے۔ وہ قیامت کے دن بھائی کا سامنا کرنے سے ڈرتے تھے۔ لیکن جب بلاوا آیا تو لبیک کہنے میں دیر نہ کی۔ ان کے تین ماہ بعد ہی امی کے کبھی نہ ختم ہونے والے کام اچانک نمٹ گئے۔ ایک رات وہ اپنی خاموش دنیا سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئیں۔

یکے بعد دیگرے ان دو صدمات سے وہ لوگ ابھی سنبھل نہ پائے تھے کہ اگلے ہی سال چچی.... وہ نبیل کے امریکا جانے کے فیصلے سے سخت نالاں تھیں۔

"امی! شیجی بھیا نے اپنی مرضی کی آپ نے نہیں روکا' عدیل بھائی کی شرائط چپ چاپ مانیں۔ مگر اب میری باری پر اس قدر اعتراض؟" نبیل احتجاج کرتا تو وہ رونے لگتیں۔ پھر اس کی روانگی کی تاریخ سے پہلے خود رخت سفر باندھ لیا۔ سب ہی غم زدہ اور نڈھال تھے مگر رمشا.... وہ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سب کو اپنا غم بھلا کر اس کی فکر کرنی پڑی۔

"بجو! میں آپ کو کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔" روحی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اٹھ کر عدیل کے کلف شدہ کرتا شلوار پر استری پھیرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"چاند تو بے شک آج دسویں کا ہے پھر بھی چاند رات مبارک۔" صائمہ اپنے مخصوص شوخ لہجے میں چہکی تھی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔" روحی نے لہجے کو بہ مشکل بشاش بناتے ہوئے کہا۔

بچوں اور عدیل کے کپڑوں سے فارغ ہو کر اس نے ازراہ مروت رمشا سے بھی پوچھ لیا تھا کہ کچھ استری کروانا ہو تو.... آخر وہ اس کے گھر پر مہمان تھیں اور روحی کو مروت نبھانے کی عادت تھی۔

رمشا نے بھی بہت پس و پیش اور عدیل کے بے حد اصرار پر دو جوڑے نکال کر اس کے حوالے کر ہی دیے جن سے نمٹنے کے بعد اب وہ کچن میں تھی۔ شیر خورما کی تیاری کے لیے اس نے خشک میوہ بھگو کر رکھا اور چائے بنانے لگی۔ گھنٹہ بھر پہلے عدیل نے اسے چائے کا کہا تھا۔ تب سے اب تک وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے نجانے کون سے اہم مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے' روحی جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔ مگر صائمہ کی کال نے اسے روک لیا۔

"دن میں تو قربانی کی مصروفیت ہوگی۔ لیکن رات کے کھانے پر آپ سب کو ضرور آنا ہے۔ میں نے زبردست مینو پلان کیا ہے۔ سچ بجو! اکٹھے مل کر بیٹھے کتنا عرصہ ہو گیا۔ پھر نبیل بھائی' جویریہ بھابھی اور ان کے چنٹو بنٹو بھی آپ سے ملنے کو بہت بے تاب ہیں لیکن میں نے کہہ دیا ہے کل کے ڈنر سے پہلے کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" صائمہ کے خلوص پہ روحی بے اختیار مسکرا دی۔ پھر فون رکھتے ہی چائے کی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔

"کتنے سال بیت گئے تمہاری صرف ایک ہاں کے انتظار میں۔ اب تو ہم بوڑھے ہو چلے ہیں۔ بس کرو رمشا! ضد چھوڑ دو۔ اب تو مان جاؤ۔" ڈرائنگ روم سے آتی عدیل کی مدھم مگر پرجوش آواز نے روحی کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"عدیل پلیز! مجھے مجبور مت کرو۔ اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا۔ تم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے 'ہم واقعی بڑھاپے کی دہلیز کے قریب آپہنچے ہیں۔ جہاں اتنی عمر تنہا گزار لی باقی کی جو تھوڑی بہت ہے 'وہ بھی گزر جائے گی۔" رمشا کے لہجے میں لاحاصلی کا غم ہلکورے لے رہا تھا۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ یہ صرف ایک فرد کی خواہش کا سوال نہیں ہم سب کی خوشیوں کی ڈور تمہارے اس فیصلے سے بندھی ہے۔ میں..... میرے بچے..... کیا یونہی عمر بھر بیچ منجدھار میں ڈوبتے ابھرتے رہیں گے۔" عدیل کی جذبات سے مغلوب آواز روحی کے دل پر آرے چلا رہی تھی۔ وہ اک عمر اس لہجے کے لیے ترسی تھی۔ لیکن عدیل نے یہ جذبے جس کے نام کر رکھے تھے وہ بڑی دھونس سے کہہ رہی تھی۔

"تمہیں منع کس نے کیا ہے خوش ہونے سے 'اپنا گھر ہے 'فیملی ہے۔ ایک مکمل زندگی ہے تمہاری۔ اسی مکمل زندگی کی خاطر ہی تم سے وعدہ لیا تھا کہ شادی کے بعد الگ رہو گے۔"

"اوہ! تو یہ فیصلے آپ کے تھے جنہیں میں اک عمر سے نبھا رہی ہوں۔" روحی کے گرد جھکڑ چلنے لگے۔

"میرے دل و دماغ پر جب تک تمہاری سسکیوں کا بوجھ ہے۔ اس وقت تک میں چاہتے ہوئے بھی کبھی مسکرا نہیں پاؤں گا۔ خدا کے لیے رمشا! ہم سب پر اور خود اپنی ذات پر یہ ظلم کرنا بند کرو۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے ذرہ برابر بھی احترام ہے تو آج میری بات ماننا پڑے گی۔" عدیل کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کون عورت ہو گی جس کا دل مرد کی اس قدر گریہ و زاری پر بھی نہ پگھل سکے۔

روحی کے اب یہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس نے چائے کی ٹرالی وہیں چھوڑی اور اپنے کمرے میں آکر چند جوڑے جلدی جلدی ایک بیگ میں ٹھونسنے لگی۔ اس کی اصل متاع تو اس کی محبت 'اس کا مان تھا' جب وہی نہ رہا تو چیزیں ساتھ لے جا کر کیا کرتی۔ اب تو اسے بنا منزل کے کسی اندھیرے راستے پر سفر کرنا تھا۔

"عدیل! تم نے اچھا نہیں کیا۔ اک زمانہ پہلے محبت کا ٹمٹماتا ستارہ تم نے میرے ہاتھ پر رکھا تھا۔ جس کی مدھم روشنی کے سہارے میں کسی اچھے وقت کی آس پر زندہ تھی۔ مگر آج تم نے وہ آس بھی چھین لی۔" بیگ کی زپ بند کر کے اس نے کمرے پر آخری نگاہ ڈالی اور چادر کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر آگئی۔ شکر تھا کہ بچیاں صحن میں نہیں تھیں ورنہ اس کے پاؤں کی وہ آخری زنجیر ثابت ہوتیں۔

لاؤنج کی کھلی کھڑکیوں سے اس نے آخری بار اپنے جگرپاروں کو دیکھا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں ضبط کرتی وہاں سے ہٹ گئی۔ اپنے مردہ ہوتے وجود کو بہ مشکل کھینچ کر گیٹ تک لانے میں اسے ایک طویل مسافت درپیش تھی۔ وہ گھر جس کو سجانے سنوارنے میں اک عمر گزاری تھی جس کے در و دیوار سے اسے محبت تھی اور جس کو اپنا سمجھنے کے احساس میں وہ اپنے ہونے کا احساس فراموش کر چکی تھی۔ آج وہ احساس

اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔
یہ گھر اچانک سے مکان بن گیا تھا' صرف اینٹ گارے سے بنا ایک مکان۔
لیکن گیٹ کھولنے سے پہلے اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔
روحی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر بیگ اپنے پیچھے یوں رکھ دیا کہ گیٹ کھلنے پر ذرا اوٹ میں چلا جائے۔
"کیا ہوا روحی! راستہ کیوں نہیں دے رہیں؟ لگتا ہے اندر آنے کی اجازت ابھی نہیں ملی۔" گیٹ کھولنے پر وہ سامنے کھڑے شخص کو دیکھتی چلی گئی۔
وہی آواز' وہی لب و لہجہ یقیناً "یہ خواب نہیں تھا۔
"سب خیریت تو ہے نا یار! میں تو تیرا گرین سگنل ملنے پر آیا ہوں۔ مگر یہ روحی...." اب وہ عدیل سے مخاطب تھے' جو شاید گھنٹی کی آواز پر باہر آئے تھے۔
"ہاں ہاں! ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ لیکن سچ سچ بتائیں... گلی کے نکڑ پر رک کر انتظار کر رہے تھے کیا؟"
عدیل کی خوشی سے بھرپور آواز نے روحی کو مزید حیرت میں ڈال دیا کچھ دیر پہلے والے عدیل کا ٹوٹا بکھرا لہجہ ایک دم غائب ہو چکا تھا۔
"میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے۔ تصویر بن گئی ہے۔ لیکن اس میں رنگ بھرنے کا کام آپ کا ہے۔ اب رمشا چاہے آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے یا.... سب اکیلے ہی نمٹنا پڑے گا اندر جا کر۔ میں تو بالکل نہیں بولوں گا۔" شجی بھیا کے کندھے پر بازو رکھ کر انہیں اندر لے جاتے ہوئے عدیل کہہ رہے تھے۔
جواب میں انہوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔
روحی ان پل پل بنتی بگڑتی کہانیوں کے گنجلک تاروں سے الجھتی باورچی خانے میں آگئی۔ مگر اس سے پہلے چپکے سے اپنا بیگ واپس الماری میں رکھ آئی تھی۔
ایک بار پھر چائے بنا کر لوازمات کے ساتھ اسی ٹرالی میں سجائی' جو ڈرائنگ روم کی دیوار سے لگی ہوئی تھی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ شکر ادا کرتی وہ اندر آگئی۔
"کھانا بنانے کے چکر میں مت پڑنا۔ آج ہم سب باہر کھانا کھائیں گے۔" چائے سرو کرنے میں اس کی مدد کرتے ہوئے عدیل نے سرگوشی کی تھی۔
"جی! بہت اچھا۔" اس نے نظر ملائے بغیر جواب دیا اور باہر آگئی۔
"اب میری بہن کو زندگی میں کوئی دکھ دیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ یاد رکھیے! جگا ٹائپ سالا بننے میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا۔" سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے عدیل کی مسکراتی آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔
"میرے تو باپ دادا کی بھی توبہ ہے جناب!" شجی بھیا نے شاید کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔
"رہنے دو عدیل! اس کے لیے تو میں اکیلی ہی کافی ہوں۔" زینہ چڑھتے ہوئے اس کی سماعت سے ٹکرانے والی گنگناتی ہوئی آخری آواز رمشا کی تھی۔



مہر بہ لب آسمان پر دسویں کا تنہا چاند اداسی میں تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا بالکل اس کے دل کی طرح' جو سب کچھ جان کر بھی انجان اور نا سمجھ بنا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک طویل عرصہ تک اپنے وجود میں سوئیاں گڑی ہوئی محسوس کی تھیں۔ مگر آج اس چبھن کے مسلسل اور تکلیف دہ احساس کو کسی نے پل بھر میں بے معنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا دل پھر بھی خوشی سے محروم تھا شاید وہ احساسات کے خالی پن کا شکار ہو رہی تھی۔ کہیں ایک گم نام سی کسک ایک دکھ اب بھی تھا۔
عدیل نے رمشا اور شجی بھیا کی الجھی محبت کے سرے ملانے میں روحی اور خود اپنی زندگی کے بہت قیمتی سال تیاگ دیے تھے۔ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی کانٹوں پر چلایا تھا۔ اگر وہ اسے ایک دوست ایک ہم راز کی حیثیت سے ساتھ لے کر چلتے تو آج وہ ایک دوسرے سے اتنی دوری پر نہ کھڑے ہوتے۔ روحی کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے پر آمادہ تھیں۔
"معلوم تھا تم یہیں ہو گی۔" قدموں کی آہٹ پا کر پلٹی تو وہ سامنے تھے۔ روحی دوبارہ منڈیر سے ٹیک لگا کر چاند کو دیکھنے لگی۔ عدیل بھی اس کے برابر آن کھڑے

ہوئے۔ مگر دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہوگئی۔ دونوں ہی شاید پہل کیے جانے کے منتظر تھے۔
وہ بہت محویت سے روحی کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ وہاں تحریر ہر سوال ' ہر شکوہ گویا ان سے ہم کلام ہو رہا تھا۔
"روحی! آج میں بہت خوش ہوں۔" ان کی نظروں کے تعاقب میں چاند کو تکتے ہوئے آخر عدیل نے پہل کی۔ "خود سے جو عہد کیا تھا آج وہ پورا ہوگیا۔ میں نے قسم کھائی تھی جب تک رمشا کے چہرے پر ہنسی نہ سجادوں' تب تک اپنی طرف کھلنے والے خوشیوں کے سب دروازوں پر قفل لگائے رکھوں گا۔ شکر ہے! میرے اللہ نے مجھے سرخرو کیا۔"
روحی کی شکایتی نظروں نے اسے دیکھا اور ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔
"بہت مشکل ہوتا ہے کہ جس نے دل کو دھڑکنا سکھایا ہو۔ وہی جیون ساتھی بھی ہو۔ پھر بھی انسان خوشیوں سے منہ موڑے رکھے..... بہت مجبوری تھی روحی! میری بہن کی آنکھوں سے لہو رنگ آنسو بہتے تھے۔ ایسے میں میں کیسے ہنس سکتا تھا؟"
"مگر شجی بھیا کی وہ..... امریکن بیوی۔" روحی کو اچانک کچھ یاد آیا۔
"اس پیپر میرج کو ختم ہوئے بھی ایک زمانہ ہوگیا۔"
عدیل نے آگے بڑھ کر منڈیر پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"تم مجھ سے کچھ کہو گی نہیں؟"
"آپ نے شادی کے بعد الگ رہنے کا فیصلہ رمشا بجو کے کہنے پر کیا تھا؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ عدیل نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکرادیے۔
"وہ ان دنوں بہت وہموں کا شکار رہنے لگی تھی۔ امی سے وہ پہلے ہی سے خائف تھی۔ اسے ڈر تھا کہ شادی کے بعد ہم اکٹھے رہے اسی گھر میں تو امی ہمیں خوش نہ رہنے دیں گی..... اور مجھے ڈر تھا کہیں وہ مستقل ذہنی مریضہ نہ بن جائے بس اسے مطمئن کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا۔" چند جملوں میں اس نے اک عمر کی کہانی سمیٹ دی۔
"اگر یہ سب کرنے سے پہلے مجھے اعتماد میں لے لیتے تو شاید یہ زندگی یوں بسر نہ ہوتی۔" روحی کے دل نے بے اختیار شکوہ کیا۔
"شش' جو حسن ان کہی میں ہے۔ وہ کہہ دینے میں کہاں۔" اس نے مچلتے دل کو سرزنش کی۔ اپنی زندگی کسی کی ان کہی کے نام کرنے والی آج خود بہت سے لفظوں کو اظہار کی لذت سے آشنا کیے بغیر چھوڑ رہی تھی۔
"چلو! ہم مل کر چاند سے باتیں کرتے ہیں۔" عدیل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔
"یہ کہہ رہا ہے اچھی بیوی! زندگی کی کٹھن راہوں میں ساتھ نبھانے کا شکریہ۔ ویسے کبھی کبھی کہہ سن لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور چاند راتوں میں چپکے چپکے بیگ لے کر نکل پڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" روحی نے چونک کر عدیل کی جانب دیکھا۔ پھر نظریں جھکالیں۔
"کوئی بات نہیں چاند میاں! ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی۔" عدیل نے بازو اس کے کندھے کے گرد حائل کرتے ہوئے مسکراتے لہجے میں کہا۔
"ہماری بیگم کو عید کا سوٹ بھی تو لینا تھا انہیں کیا معلوم میاں صاحب پہلے ہی لے آئے ہیں۔"
دونوں نے چاند سے نظریں ہٹا کر بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس ہونے والی سچی خوشی نے ان کی بے ساختہ ہنسی میں رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔ ان کہی کہنے سننے کو رات بھی ابھی بہت باقی تھی۔



عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

وہ کئی دنوں سے تاک میں تھی۔ اس کا موبائل واحد امید تھا جو اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ معیز کو مدد کے لیے پکار سکتی اور جب سلطانہ نے معیز کا نمبر مراد صدیقی کو دینے کے لیے موبائل نکالا تو واش روم سے واپس آتی ایبہا نے کن انکھیوں سے اسے موبائل واپس دروازے سے لٹکتے تھیلے میں گھیڑتے دیکھ لیا اور آج جب اسے موقع مل ہی گیا کہ وہ جلدی سے معیز کا نمبر ملا کر اسے مدد کے لیے پکار لیتی تو حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔

جانے کہاں سے آکے سلطانہ نے چیل کی طرح جھپٹا مار کے اس سے موبائل چھین لیا' بلکہ اس کے ساتھ ہی ایبہا کی بھی شامت آگئی۔ منہ سے گندی مغلظات بکتے ہوئے اس نے ایبہا کو مردانہ وار مارنا شروع کیا تھا' اور وہ ٹھٹھرتے حواس لیے بے بسی سے پٹتی اپنا بچاؤ کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ ادھر اُدھر دیکھتا' بہت محتاط انداز میں فون بوتھ کی طرف بڑھا تو دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیب سے معیز کے موبائل نمبر والی پرچی نکال کر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ نمبر ملانا شروع کیا اور اسے حیرت نہیں ہوئی' جب اگلی ہی بیل پہ کال اٹینڈ کرلی گئی۔

"ہیلو....." مراد صدیقی کھنکھارا۔

چوبیسویں قسط



سفیر احسن کے والدین کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھئی ہمیں کیوں اعتراض ہوگا بلکہ میرے خیال میں تو فنکشنز کا مزہ اور بھی دوبالا ہو جائے گا۔" احسن صاحب نے کھلے دل سے کہا۔

رباب کی رنگت تو اڑی سو اڑی۔ سفینہ بیگم کے اندر تو ایک قہر کروٹیں لینے لگا۔

انہوں نے سرد مہری سے ایراز کے اپنی گردن میں لپٹے بازو پیچھے کیے مگر ایراز کو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

اس کی نگاہ اپنے بھائی کے پرسکون اور دھیمی سی مسکراہٹ سے سجے چہرے پر تھی۔

یہ وہ چہرہ تھا جو چار سال پہلے کہیں کھو گیا تھا اور ایراز کو خوشی تھی کہ یہ پیارا چہرہ اس نے خود ڈھونڈ نکالا تھا۔

سفینہ بیگم کو ان لوگوں کے سامنے بہت ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑا مگر رباب پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں نہیں تھی۔ وہ سخت تاثرات لیے اینٹھی بیٹھی رہی۔ سفینہ اس کے ردعمل کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں مگر کیا کرتیں۔

جب اولاد ماں باپ کو بات دینے کے قابل ہو جائے تو ماں باپ کا زندگی بھر کا تجربہ فیل ہو جاتا ہے۔

وہ بھی اسی پوزیشن پر تھیں۔ انہوں نے ایک بار رباب کو زارا کے کمرے میں جانے کی بھی آفر کی مگر وہ سنی ان سنی کیے بیٹھی رہی۔ سفینہ بیگم دل ہی دل میں اپنی بیٹی کے مستقبل کے لیے متوحش ہو رہی ہیں۔

اسی لیے بس ان لوگوں کے جانے کی دیر تھی' سفینہ بیگم پھٹ پڑیں۔

"بس کردیں ماما... خوشی کے موقع کو خوشی سے سیلبریٹ کریں۔"

زارا نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بس بس..." وہ ہاتھ اٹھا کر تیز و تلخ لہجے میں بولیں۔ "خبردار جو مجھے پڑھانے کی کوشش کی ہو تو۔"

ایراز اور معیز خاموشی سے بیٹھے تھے۔ انہوں نے تیز نظروں سے ایراز کو دیکھا۔

"افسوس۔ ایک بیٹا تو خراب نکلا ہی تھا' دوسرا بھی اسی کے نقش قدم پہ چل نکلا۔ تم سے مجھے ایسی امید نہیں تھی ایراز۔"

"بھائی نے کچھ غلط نہیں کیا ماما۔ ابو کی بات مانی تھی اس میں خرابی کیا ہے آخر؟"

ایراز نے نرمی سے کہا۔ وہ سفینہ بیگم کو مزید غصہ نہیں دلانا چاہتا تھا۔

"باپ کی مان لی۔ اور میں جو اسے کب سے کہہ رہی ہوں کہ طلاق دے کر اس سے اپنا پیچھا چھڑائے۔ وہ ماننا اسے گناہ لگتا ہے۔" وہ چیخیں۔

"اس سارے معاملے میں ایمہا بے قصور ہے ماما! وہ تو خود حالات کا شکار بنتی رہی ہے۔"

معیز نے پہلی بار لب کھولے تھے۔ سفینہ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"مان لیا وہ بے قصور ہے' مگر اب کافی کچھ اس کے ہاتھ لگ چکا اس نکاح کے بعد۔ اس سے کہو بیٹے اور یہاں سے جائے۔"

انہوں نے تنفر اور نخوت کا مظاہرہ کیا تو معیز چند لمحے خاموشی سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد اٹھا اور چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سفینہ بیگم کے چہرے پر ان کے مخصوص سرد تاثرات تھے۔

"آپ بھول رہی ہیں ماما... اس نکاح کے بعد آپ کا بیٹا... معیز احمد بھی اس کے ہاتھ لگا ہے۔"

معیز نے عجیب سے انداز میں کہا تو وہ دھک سے رہ گئیں' مگر پھر فوراً" ہی چلانے لگیں۔

"ہاں ہاں۔ اب تم اس منحوس' کرموں جلی کے پیچھے اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کھڑے ہو گے۔" معیز نے انہیں شانوں سے تھام لیا۔

"ماما پلیز۔ اپنی اولاد کی خوشی دیکھیں اور بس۔"

معیز کا دکھ اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ کچھ تو تھا اس کے لب و لہجے میں جس نے سفینہ کے دل کو ہلا دیا۔
"اولاد جلتے کوئلے کو ہاتھ میں لینے کی ضد کرنے لگے تو مائیں ان کی بات نہیں مان جایا کرتیں معیز۔"
وہ قدرے دھیمی پڑیں مگر لہجے کی سختی برقرار تھی۔
"اب تو وہ جلتا کوئلہ ہاتھ میں آچکا ماما! تجربہ ہو چکا۔ ہیرا پایا ہے آپ کے بیٹے نے۔"
ابراز نے وہیں بیٹھے اطمینان سے لقمہ دیا تو وہ تلملا اٹھیں۔
"تم تو اپنی بکواس بند ہی رکھو۔ سخت مایوس کیا ہے تم نے مجھے۔ بھری محفل میں دو تھپڑ تمہیں جڑتی تو کیا عزت رہ جاتی تمہاری۔"
"ماں کی مار میں سو ماؤں کا پیار ہوتا ہے۔ میری تو ویلیو بڑھ جاتی آپ کے دو ہاتھ لگنے سے۔"
لاپروائی سے کہتا وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ سفینہ نے اسے گھورا مگر اس کی بات سن کے دل ذرا سا نرم ضرور پڑ گیا۔

"سب سے بڑا روگ
کیا کہیں گے لوگ"

معیز نے کہا تھا' وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔
"اپنے بیٹے کی خوشی دیکھیں ماما! ہمیں دنیا کے بنائے اصولوں کے مطابق نہیں جینا۔"
وہ ماں تھیں' بیٹے کے چہرے کو اچھی طرح پڑھ سکتی تھیں۔ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگیں۔ بیٹوں کا دل دکھ سے بھرا تو وہ دونوں ان کے دائیں بائیں آبیٹھے۔ اسی اثنا میں زارا بھی آگئی تھی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئی۔ آکے سفینہ بیگم کے قدموں میں بیٹھ گئی ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
"کیا ہوا ماما.... ؟" انہوں نے چہرہ اوپر اٹھایا تو آنسوؤں سے تر تھا اور سرخی لیے ہوئے آنکھیں۔
"کیوں رو رہی ہیں؟" زارا خود بھی رونے والی ہو گئی۔
"روؤں نہ تو اور کیا کروں۔ گھر برباد ہو رہا ہے میرا۔"
وہ چیخ کر بولیں۔ تو زارا کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ وہ گہری سانس بھرتی اٹھ گئی۔
اسے علم تھا اس معاملے میں وہ اپنی ماں کو کبھی بھی سمجھا نہیں سکتی۔ زارا کی بے اعتنائی محسوس کرکے وہ اندر ہی اندر تلملائی تھیں۔
"وہ گھر بنانے والی لڑکی ہے ماما! ٹرسٹ می۔"
معیز نے ان کے شانے پر بازو پھیلاتے ہوئے محبت بھرے تیقن سے کہا تو وہ جلبلا اٹھیں۔
"اب تم اس کی گواہیاں دو گے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تمہاری اس کی جان پہچان کو۔"
"وہ گمنام نہیں ہے ماما۔ ہمارے خاندان سے ہے۔ آپ کے۔ ابو کے۔"
ابراز نے نرمی سے کہا مگر اس کی بات کا وہ اتنا شدید ردعمل ظاہر کریں گی' یہ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا۔
"دھبہ ہے اس کی ماں ہمارے خاندان کے نام پر۔ بھگوڑی۔ اور یہ گھر بنائے گی...." وہ نفرت اور تنفر سے بھرپور لہجے میں گویا ہوئیں تو آواز میں اژدھے کی سی پھنکار تھی۔
"تمہارے باپ کی شرافت راس نہیں تھی اسے۔ اور جس کے ساتھ رخصت ہوئی تھی مجھ سے زیادہ اچھی طرح تم جانتے ہو اسے۔ اسی کی بیٹی ہے وہ۔"
"مگر ایمہا ایسی نہیں ہے۔ بہت مختلف ہے۔" معیز نے کہنا چاہا۔

"ماں کی گود بچے کی پہلی تربیت گاہ ہوا کرتی ہے معیز احمد۔" وہ غرائیں۔
"اپنے تجربات ہی سکھائے ہوں گے اسے بھی۔ کمینی تھی کمینی۔ مر کے بھی تمہارے باپ کے دل سے نہیں گئی۔ کتنے آرام سے جا کے میرا بیٹا اس کی گود میں ڈال دیا۔"
آخر میں وہ رندھے لہجے میں کہتی کف افسوس ملنے لگیں۔ زارا کے دل میں شدید تاسف جنم لینے لگا۔ سفینہ بیگم کی بدگمانی کی کوئی حد نہ تھی۔
"ماما پلیز۔ اب بس کر دیں۔"
"اور تم۔" انہوں نے ایراز کے ہاتھ کو جھٹکا۔
"تمہاری تو شکل دیکھنے کو دل نہیں کر رہا میرا۔ کیوں بکواس کی تھی تم نے سب کے سامنے۔ اگر میں بول اٹھتی تو۔"
"اور جو آپ کرنے والی تھیں۔ اگر بھائی بول اٹھتے تو۔؟"
زارا نے ان کی بات کاٹ کر دکھ سے کہا تو انہوں نے ہلکے سے تفاخر کے ساتھ معیز کو دیکھا۔
"جو باپ کے سامنے نہ بولا' وہ ماں کے سامنے کیا بولتا۔"
"اتنا جانتی ہیں اپنے بیٹے کو تو پھر اسے اس کی خوشی سے زندگی جینے دیں ماما۔"
زارا کھڑے ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولی اور پھر سفینہ بیگم کو لاجواب ہوتا دیکھنے کو مڑی نہیں۔ وہ لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ شاید لان میں۔
"ہنہ۔ دماغ خراب ہے سب کا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔
مگر وہ جانتی تھیں' فی الحال وہ اپنی اولاد کے درمیان بری طرح پھنس چکی تھیں۔
انہوں نے دل ہی دل میں کوئی قطعی فیصلہ کر کے معیز کی طرف دیکھا اور سنجیدگی اور قطعیت سے بھرپور لہجے میں بولیں۔
"میں اسے اس گھر میں قبول کر لوں گی معیز۔ مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"
ان کی آفر اس قدر غیر متوقع تھی کہ معیز اٹھ کر ان کی شرط جانے بغیر ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا اور خوشی سے سنسناتے لہجے میں بولا۔
"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے ماما۔"
ایراز نے کچھ کہنے کو لب کھولے' مگر معیز کے جملے کے بعد تاسف سے لب بھینچ کر رہ گیا۔
معیز کی نگاہ ماں کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھی۔



وہ امی اور بھابھی کے پاس سے اٹھ کے آئی تو عون کمرے میں محو انتظار بوریت کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ ٹی وی چینلز کو بے دلی سے تبدیل کرتے عون کے لبوں پر ثانیہ کو اندر آتے دیکھ کر۔ مسکراہٹ آئی۔
مگر ثانیہ اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی اپنے کپڑے لیے واش روم میں گھس گئی۔ عون کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پر سوچ انداز میں سر کھجایا' مگر کوئی بھی جرم یاد نہیں آیا۔ تو وہ گہری سانس بھر کے تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز کیفیت میں بیٹھ گیا۔
ثانیہ کپڑے تبدیل کر کے نکلی تو حسب عادت چٹیا کھول کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں کو برش کرنے لگی۔

"بڑی مغرور ہو کے آئی ہو تم تو۔ لفٹ ہی نہیں کروا رہیں۔"
وہ سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف رہی۔
"ثانی۔!" عون کی پکار میں تنبیہہ تھی۔
وہ برش رکھ کے بالوں کو نرم سے اونی بینڈ میں جکڑنے لگی۔ وہ رات کو بال چٹیا میں باندھ کے سونے کی قائل نہیں تھی۔ وہ بستر کی طرف آئی۔ یوں ہی منہ پھلائے تکیہ اٹھا کے بستر کو جھاڑا۔ پھر دھپ سے بستر پہ بیٹھ کے عون کو گھور کے دیکھا۔
"اف!" شرارت سے مسکرا کر عون نے آنکھیں میچتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھا تو ضبط کرتے ہوئے بھی ثانیہ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"رہنے کیوں نہیں دیا مجھے ابیہا کے پاس۔" اس نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔
"اوہ!" عون نے گہری سانس بھری۔ پھر اسے احساس دلانے والے انداز میں بولا۔
"شرم کرو بیوی۔! تین دن اور دو راتیں رہ کے آئی ہو اس کے ساتھ۔ ابھی بھی شکوہ۔ ابھی بھی ناراضی؟"
"تین دن ہی تھے، تین سال تو نہیں نا۔" اس نے منہ پھلایا۔ عون کی آنکھیں پھیلیں۔
"یعنی تم تین سال بھی گزار سکتی ہو میرے بغیر۔"
"تو؟ پہلے بھی تو چوبیس سال گزارے ہیں۔" بے نیازی سی بے نیازی تھی۔
عون کی آنکھوں میں تپش سی اترنے لگی۔
"گزارے تو میں نے بھی کئی سال ہیں۔ مگر اب تین دن نہیں گزر رہے تھے۔"
وہ بڑے نارمل سے انداز میں بولا تو ثانیہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
وہ ہلکا سا مسکرایا۔ اور اس مسکراہٹ میں توجہ، محبت اور اس محبت کے اقرار کے تمام رنگ تھے۔
وہ ایک خوبرو مرد تھا۔ ثانیہ کے دل نے پکار پکار کر اعتراف کیا۔ عون کے ہاتھ تلے دبا اس کا ہاتھ موم بننے لگا۔
"وہ اکیلی تھی وہاں۔" ثانیہ نے اس کا دھیان ہٹانا چاہا۔
"اور میں یہاں۔" وہ ترنت بولا اور بس۔ ثانیہ عون عباس ہار سی گئی۔ اس کی تمام دلیلیں دم توڑ گئیں عون کی محبت میں اس کے دلائل سے زیادہ شدت تھی۔ اور جہاں محبت شدید ہو' وہاں گھٹنے ٹیک دینے میں ہی بڑائی ہے۔
ثانیہ کے ہونٹوں پر بھی بہت پیاری اور پر سکون سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے عون کے بازو پہ سر رکھا اور اسی کے انداز میں نیم دراز ہو گئی۔
چہرہ موڑ کے عون کو دیکھا۔
"آئی لو یو۔ بہت زیادہ۔" عون کا اظہار انوکھا تھا تو ثانیہ کا اس سے بھی انوکھا۔
"می ٹو۔ تم سے بھی زیادہ۔"
دونوں کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔



دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز پر کچن میں اپنے لیے چائے بناتی ابیہا کا دل جیسے تیزی سے دھڑک اٹھا۔ شاید معیز آیا تھا۔
اسے واپس آئے تین چار روز ہو چکے تھے اور گھر والوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہ پلٹا تھا۔ حتیٰ کہ اسے اپنے ساتھ لانے والا معیز احمد بھی۔

"اف۔ میری وجہ سے شرمارہے ہیں تمہارے سرتاج۔ مگر اچھا ہے انہیں ذرا ان کی بے اعتنائیوں کی سزا ملنی چاہیے۔" اس کی بے چینی بھانپ کر ثانیہ مذاقاً" کہتی تھی۔ وہ جلدی سے آنچ ہلکی کرتے ساس پین کو کور سے ڈھک کے کچن سے باہر نکلی تو زارا کو اندر آتے دیکھ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔ مگر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی ہو زارا۔؟"

اس کے انداز میں مخصوص پیار تھا۔ زارا کو ٹوٹ کر رونا آیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس سے لپٹ کر دھواں دھار رونا شروع کردیا۔

"آئی ایم سوری ایبھا! مجھے معاف کردو۔ بہت غلط کیا میں نے تمہارے ساتھ۔"

وہ بہت نادم و شرمسار تھی۔ ایبھا نے اس کی پشت تھپتھپائی۔

"وہ سب تو اب ختم ہو گیا زارا۔! خود کو الزام مت دو۔"

وہ اس سے الگ ہو کر دوپٹے سے رگڑ کر آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی۔

"میں نے تمہاری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ محض اپنی زندگیوں کو پرسکون بنانے کے لیے۔ آئم سوری۔ ایبھا۔" وہ بھرائے لہجے میں بولی۔

"غلطی تو میری بھی تھی۔ تم نے کہا اور میں چلی گئی۔ تھوڑا سا تو سوچنا چاہیے تھا مجھے۔"

زارا ندامت کا شکار تھی اور ندامت بھی ایسی کہ خود اذیتی کی سی کیفیت ہو جیسے۔ وہ بار بار دہراتی کہ اس کی وجہ سے ایبھا برے حال کو پہنچی تھی۔

مگر اب جبکہ ایبھا کے خیال میں سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا تو وہ زارا کو بھی ندامت کے اس گڑھے میں سے نکال لینا چاہتی تھی۔

"بڑے اچھے وقت پہ آئی ہو۔ میں چائے بنا رہی تھی۔"

ایبھا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

"بس دو منٹ میں لاتی ہوں چائے۔ پھر دونوں بیٹھ کے باتیں بھی کریں گے اور چائے بھی پئیں گے۔"

وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اپنے کشیدہ اعصاب کو شدید تھکاوٹ کی زد میں محسوس کرتے ہوئے زارا نے سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ معیز کے لیے بہت خوش تھی۔ اس کی زندگی اب بنتی نظر آرہی تھی۔ بگڑی تو بہت بار تھی مگر سنور پہلی بار رہی تھی۔

وہ دودھ کا اضافہ کر کے اپنے اور زارا کے لیے دو کپ چائے لے آئی تھی۔

"مجھے چاہیے تھا کہ اپنی بھابی کو خود چائے پیش کرتی اور یہاں تم میری خاطر کر رہی ہو۔"

زارا نے ندامت سے کہا۔ تو وہ جھینپ سی گئی۔

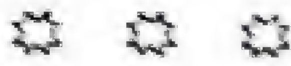
"کوئی نہیں۔ پیو تم۔"

زارا کو اس کی گلابی پڑتی رنگت بہت پیاری لگی۔

لان کے سفید اور گلابی کڑھائی کیے لباس میں سادہ انداز میں بندھے سیاہ بال اور زندگی کی چمک سے بھرپور گلابی چہرہ لیے وہ زارا کو بہت پرکشش لگی۔

"میری شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے آئی مین رخصتی کی۔" زارا نے اسے بتایا۔

"ارے واہ۔ بہت مبارک ہو۔" وہ واقعی خوش ہوئی۔
اسے ثانیہ کی شادی میں آنے والا مزہ یاد آ گیا۔ تو دل میں گدگدی سی ہوئی۔ اسے تو یوں بھی شادی میں شرکت کا بہت شوق تھا۔
"اس سے بھی بڑی خوشی کی خبر ہے ایک۔"
زارا نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ اشتیاق سے زارا سے پوچھنے لگی۔
"اچھا۔ اور وہ کیا ہے؟؟"
"وہ یہ ہے کہ۔ تم بھی میرے بھائی کے سنگ یہاں سے رخصت ہو رہی ہو۔"
زارا کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور ایہا۔ وہ تو مانو ایک دم بے یقینی کی سی کیفیت میں گھر گئی۔
"میری ڈیٹ فائنل ہو رہی تھی تو ساتھ ہی تمہیں اور بھائی کو بھی نمٹا دیا گیا۔"
وہ دوستانہ انداز میں بتانے لگی۔
"کک۔ کس نے طے کیا ہے؟؟"
ایہا امید و آس کے سہارے پوچھ بیٹھی۔ کیا پتا سفینہ بیگم کے دل پہ لگی مہر ہٹ گئی ہو۔
"جھوٹ نہیں بولوں گی ایہا۔ ! ماما نے طے نہیں کیا یہ سب۔" زارا اسے خوش فہمی کا شکار نہیں کرنا چاہتی تھی' صاف گوئی سے بتا دیا اور پھر ساتھ ہی ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔
ایہا کا دل دکھا۔
سفینہ بیگم ابھی تک وہیں کی وہیں کھڑی تھیں۔ ہر حال میں اسے شہ مات دینے کے لیے۔
مگر کبھی کبھار شہ مات دینے کی آرزو رکھنے والوں کے اپنے مہرے بہت بری طرح پٹ جاتے ہیں۔ تب بھی وہ نصیحت نہ پکڑیں تو یہ ان کی کم نصیبی۔
"معیز بھائی کی طرف سے کوئی غلط فہمی دل میں مت لانا ایہا۔ ! وہ تو تمہیں پوری طرح قبول کر چکے تھے۔ بس مجھے ہی عقل نہیں تھی جو تمہیں اس قدر بڑے امتحان میں ڈال دیا۔"
زارا عاجزی سے اپنی غلطی کا بار بار اعتراف کر رہی تھی۔ اور اب جبکہ وہ بارہا معذرت کرنے کے بعد جا چکی تھی تو ایہا کو معیز سے گلہ ہو رہا تھا۔ وہ بستر پہ دراز ہو گئی۔
"وہ کیوں نہیں آئے؟"
اور یہ سوال اس کے معصوم سے مان کو ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ ماتھے پہ ثبت معیز کے لبوں کا ہلکا سا لمس تپنے لگا تو اس نے بے اختیار اپنی پیشانی پہ بازو رکھ لیا۔



معیز احمد اپنے بنا سوچے سمجھے کیے وعدے کا شکار ہو گیا۔ سفینہ بیگم نے صرف دو ماہ کے "ٹرائل بیس" (آزمائشی طور) پر ایہا کو اپنی بہو تسلیم کرنے کی شرط رکھی تھی۔ اور اس دوران اگر انہیں لگا کہ وہ اس گھر کی بہو اور معیز کی بیوی بننے کے لائق نہیں ہے تو معیز کو سفینہ بیگم کی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنا ہو گا۔
اور معیز نے بنا چوں چراں کیے ان کی یہ شرط منظور کر لی تھی۔ سفینہ بیگم کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔
"آپ پھر سے وہی غلطی دہرانے والے ہیں۔ ماما اس آزمائشی امتحان میں انہیں فیل کرنے والی ہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے۔"

سفینہ بیگم اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
ابراز اس کی حد سے زیادہ فرماں برداری پر چڑ گیا تھا۔ معیز ذو معنی انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
"زندگی ہمارے طے کردہ منصوبوں کے مطابق نہیں گزرتی۔ سویٹ برادر۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔"
ابراز کے ہونٹوں پر بھی آہستہ آہستہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
مگر سفینہ بیگم تو یہ چال کھیل کے پہلے ہی روز پچھتانے لگیں۔
"ماما۔ میں پارلر جا رہی ہوں۔"
"ہاں ہاں۔ ضرور جاؤ۔ ٹائم کم رہ گیا ہے شادی میں۔" وہ مسکرائیں۔
"میں ایمہا کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ اس کا نام بھی اپنے ساتھ رجسٹرڈ کروا دوں گی۔"
معیز صوفے پہ مطمئن سا بیٹھا چینلز سرچ کررہا تھا۔ زارا نے پیچھے سے جھک کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا تو معیز کے ہونٹوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
سفینہ بیگم نے تلملا کر پہلو بدلا۔ اور سنجیدگی سے بولیں۔
"اسے گھر پہ ہی رہنے دو۔ پہلے دو بار اغوا ہوچکی ہے وہ۔ ہم پھر سے رسک نہیں لے سکتے۔"
ان کا انداز جتانے والا تھا۔ زارا پھیکی سی پڑی۔
"میں خود پک اینڈ ڈراپ کردوں گا ماما! ڈونٹ وری۔"
معیز نے بات ہی ختم کردی تھی۔ وہ دانتوں پہ دانت جما کر رہ گئیں۔ ہلکا سا گھور کے اپنی لاڈلی کو دیکھا جس نے یہ بے وقت کا شوشا چھوڑا تھا۔
(بھلا ٹرائل میں پہ آنے والی بہو پہ اتنا پیسہ لگانے کی کیا ضرورت۔)
وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ گئیں۔



زارا کی بات سن کر وہ بدک کر رہ گئی۔
"نا۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں یوں ہی ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں پارلر جانے کا۔"
زارا نے پیار اور رشک سے اس کی گلابی رنگت کو دیکھا' سیاہ پلکوں سے سجی گھور سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھنے لائق تھی۔ چہرے پہ کہیں ہلکے سے نیل کے نشان باقی تھے اور بس۔۔۔
"شوق تو کیا۔۔۔ ضرورت بھی نہیں تمہیں کسی مصنوعی لیپا پوتی کی۔ بس یوں ہی میرے ساتھ چکر لگا کے میرے بھائی کا دل ہی خوش کردو۔"
وہ مسکرا کر بولی۔ تو ایمہا کا دل بے طرح سے دھڑکا۔
گلابی رنگت میں گلال سا گھلنے لگا۔
"میں واقعی نہیں جاؤں گی زارا! مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیوی میک اپ۔"
"اوفوہ۔ ابھی تو پہلا سیشن ہوگا۔ اس میں میک اپ کا کوئی کام نہیں۔"
زارا نے ہاتھ ہلا کے گویا مکھی اڑائی اور پھر دوبارہ کسی احتجاج کے لیے اس کا منہ کھلتا دیکھ کر رعب سے بولی۔
"اب بس۔۔۔ اور دو منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ ورنہ ایسے ہی پکڑ کے لے جاؤں گی۔"
ایمہا بے بسی سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ایمہا نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور

بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ باہر کھٹکا سا ہوا۔
زارا پھر آگئی تھی۔۔۔ ایبہا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"زارا! اندر آجاؤ۔۔۔"
وہ پونی میں بالوں کو جکڑتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ جھک کر برش رکھا اور پرفیوم اٹھا کر جلدی سے خود پر ہلکا سا اسپرے کرنے لگی۔
مگر اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے پرفیوم چھوٹتے چھوٹتے بچا۔
دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ معیز احمد اندر داخل ہوا تھا اور اب کمرے کے وسط میں آکھڑا ہوا تھا۔
ایبہا کی گھبراہٹ فطری تھی۔ ہاتھ بے اختیار اپنے گلے پر گیا۔ دوپٹا ندارد تھا۔ کن اکھیوں سے دیکھا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ (حسب عادت) استری کر کے بیڈ پہ پھیلا کے ڈال رکھا تھا۔
"وہ۔۔۔ میں نے سمجھا۔۔۔ زارا ہے۔" وہ سمٹ کر اس کے پاس سے گزرنے لگی۔
"اچھا۔۔۔ میں نے سمجھا۔ تم نے کہا کہ ذرا اندر آجاؤ۔"
شرارت سے جملہ پھینکا تو وہ جو جھک کر جلدی سے اپنا دوپٹا ہاتھ میں لے چکی تھی۔ دوسرے ہاتھ کو معیز کے ہاتھ کی ملائم سی گرفت میں پا کر دھک سے رہ گئی۔
"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ قسم سے میں نے تو زارا کو کہا۔"
فوراً صفائی پیش کی تو معیز نے اس کا دوسرا ہاتھ تھام کر دوپٹا چھڑا لیا اور اس کا رخ اپنی طرف کیا۔
"اچھا۔ یعنی مجھے اجازت نہیں اندر آنے کی تو کیا میں واپس چلا جاؤں؟"
حد تھی معصومیت کی مگر ایبہا جیسی لڑکی کے لیے مزاج کی یہ قسم بالکل انجانی تھی۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" فوراً اس کا دل رکھ لیا۔
وہ سنجیدہ ہوا۔ بنظر غائر اس کا چہرہ دیکھا۔ تو ایبہا کسمسا سی گئی۔ اب تو باقاعدہ سے ٹانگیں لرزنا شروع ہو گئی تھیں۔
"کیسی طبیعت ہے اب؟"
"ٹھیک۔۔۔" اثبات میں سر ہلایا۔ منہ سے اب کوئی بات قیامت تک نہ نکلتی اگر وہ یوں ہی ہاتھوں میں ہاتھ لیے اس کے اتنے قریب کھڑا رہتا۔
معیز نے انگشت شہادت سے اس کی پیشانی کے مندمل ہو چکے زخم کو نرمی سے چھوا۔
"کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا مداوا "سزا" بھی نہیں کر سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے کبھی معاف نہ کرو ایبہا! اور میں تمام عمر اپنے کیے کی تلافی کرتا رہوں۔"
معیز نے اپنی پیشانی ایبہا کی پیشانی کے ساتھ ٹکا دی تھی۔ دکھ، تاسف، پشیمانی۔۔۔ ندامت و شرمساری کا ہر احساس جھلک رہا تھا اس کے الفاظ و انداز سے۔ ایبہا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
معیز کے قرب کے احساس پر اس کی باتوں کا احساس حاوی ہونے لگا۔ ایبہا کو احساس بھی نہیں ہوا اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ معیز نے نرمی سے اس کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا تو بس۔۔۔
یہ حد تھی اس کے زندگی بھر کے ضبط اور برداشت کی۔ وہ بلک اٹھی۔
کسی کا رونا برداشت سے باہر تب ہی ہوتا ہے جب اس "رویے" میں آپ کے دیے ہوئے دکھ بھی شامل ہوں۔
مگر وہ اس کے اندر کا سارا دکھ، سارا خوف بہنے دینا چاہتا تھا۔

نرمی سے اس کی پشت سہلا کر اسے حوصلہ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئی۔۔۔ یوں لگا ہر دکھ' ہر غم پہ آنسو بہا دیے ہوں اور اب رونے کے لیے کچھ باقی نہ بچا ہو۔ پھر وہ جیسے حواس میں لوٹی۔

معیز احمد۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ معیز احمد ہی تھا۔ آسمان کے وسط کا چاند۔ جسے وہ بس کبھی چھونے بلکہ دیکھنے کی تمنا ہی کیا کرتی تھی۔

اور آج یہ چاند آنگن میں اتر آیا تھا۔ یوں کہ اس کی چاندنی اسے سرتاپا سونے میں نہلا گئی۔ مشک بو کر کے پھولوں سے لدی ڈالی بنا گئی۔

وہ کسمسائی تو معیز نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بس۔۔۔؟" وہ جھینپی سی ہنسی ہنس کے اس کے بازو ہٹاتی اپنا دوپٹا اٹھانے لگی۔

"ابھی میں مزید ایک گھنٹے تک تمہیں تسلی اور اور حوصلہ دے سکتا ہوں۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ایہا نے بے ساختہ اسے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔ معیز نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔۔۔ مگر اسی وقت باہر سے زارا کی آواز آئی تو ایہا تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس کے پیچھے معیز آیا تھا۔ مسکراتا چہرہ لیے۔

"آہم۔۔۔" زارا کھنکاری۔۔۔ ایہا کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے آنکھ نہ ملا پائی تھی۔

"میں آپ کو وہاں پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور آپ یہاں۔۔۔"

زارا نے بھائی کو مصنوعی ڈانٹا۔

"ہر چیز کو اس کے اصل مقام پہ ڈھونڈا جائے تو ضرور مل جاتی ہے بے وقوف۔"

معیز نے فلسفہ جھاڑا۔۔۔ تو زارا ہنسنے لگی۔ اس کی نگاہ پلٹ پلٹ کر ایہا تک جاتی تھی اور پھر زارا کو پارلر چھوڑنے تک بیک ویو مرر میں بھی یہ نگاہ اسی پر رہی۔

زارا گاڑی سے اتری تو ایہا بھی اس کے پیچھے۔

"تم کہیں نہیں جارہیں۔"

معیز نے پلٹ کر اس سے کہا تو وہ ٹھٹکی۔۔۔ فوراً" زارا کو مدد کے لیے دیکھا۔

"پارلر تو مجھے جانا ہے تم آئس کریم پارلر جاؤ۔" زارا نے مسکراتے ہوئے آنکھ دبائی تو وہ ہکا بکا سی ان دونوں بھائی بہن کو دیکھنے لگی۔

زارا ہاتھ ہلاتی پارلر کے اندر چلی گئی تھی اور وہ یوں ہی اسے دیکھے جارہی تھی۔

"ہیلو۔" معیز نے ہاتھ بڑھا کے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تو وہ حواسوں میں لوٹی۔

"نیچے اترو اور آگے آجاؤ۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ ایہا تو سرتاپا مشک بو ہوئے جارہی تھی' یہ کیا راز نہاں تھے جو اس پہ آج کھلے جاتے تھے۔

اچھا۔ تو ایسا ہوتا ہے چاہا جانا۔۔۔ اور ایسا ہوتا ہے کسی کی محبت کو "موجھ" لینا؟

وہ گویا ستاروں پہ پاؤں رکھتی اگلی نشست پہ آئی تھی۔

"تھینکس۔۔۔ مائی ہلیز میم۔۔۔"

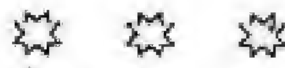
ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ممنون سا لہجہ۔

بھگوڑی ماں کی بیٹی۔

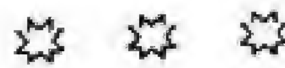
شرابی اور جواری باپ کی نسل۔۔۔ آج تو سارے حسب و نسب کے داغ مٹ گئے تھے۔

"اب سے تمہاری پہچان صرف یہی ہے ایہا معیز احمد۔" معیز نے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔ کہتے ہوئے

اس نے ایہا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اسٹیئرنگ وہیل پر رکھ لیا۔ نرم و گرم ہاتھ کی گرفت میں دبا ایہا کا سرد پڑتا ہاتھ۔
"کہ تم معیز احمد کی بیوی ہو۔" ایہا نے اپنا آپ سبک ہو کر ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا۔
آج اسے ہر داغ اپنے وجود سے الگ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار کھل کے مسکراتے ہوئے معیز احمد کو دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

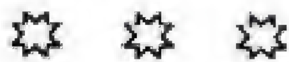


"کیا بات ہے۔ موڈ کیوں خراب ہے سویٹ ہارٹ۔۔۔ ملی بھی نہیں ہو کتنے دنوں سے۔۔۔" سیفی اس کی ہر رمز پہچاننے لگا تھا اب۔۔۔ وہ چکنی مچھلی تھی' ہاتھ تو آتی مگر تڑپ کر ہاتھ سے نکل جاتی تھی اور وہ بڑے صبر سے اس کی یہ تڑپ ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔
"ہے ایک ڈیم فول۔۔۔ جس کی وجہ سے۔۔۔" رباب نے دانت پیسے گویا معیز احمد ہی کو چبا ڈالا ہو۔
"نام بتاؤ اس کا۔۔۔ قدموں میں زنجیریں ڈال کے گھسیٹ لاؤں گا اس کے۔"
وہ موبائل پہ تھا۔ بڑھکیں مار سکتا تھا مگر رباب تو بس یہی حوصلہ چاہتی تھی۔ اس کا مورال ہائی ہوا۔ کوئی تھا جو اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر دنیا ادھر کی ادھر کر سکتا تھا۔
"برباد کرنا چاہتی ہوں میں اسے۔ کھیل تماشا نہیں ہوں میں۔۔۔"
وہ تلخی سے بولی تو سیفی نے ناگواری سے بھنویں اچکائیں۔ (تو کوئی اور بھی تھا اس لائن پہ)
"کیا تم کسی اور میں انوالوڈ ہو؟"
کھردرے لہجے میں پوچھا تو رباب پہلی بار گڑبڑائی۔
"ارے نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔ تم سے پہلے کی بات ہے مگر اب تو اس نے زندگی اجیرن کر دی ہے میری۔ میں اسے سبق سکھانا چاہتی ہوں۔"
"دفع کرو اسے۔۔۔ اب تو وہ رانگ نمبر ہو چکا۔ میری جان! میری پناہوں میں آ کے سب سے محفوظ ہو جاؤ گی تم۔" سیفی نے ذو معنی انداز میں کہا تو وہ کھنک دار سی ہنسی ہنس دی۔
"جو شہزادہ۔۔۔ شہزادی کی تمام شرائط پوری کرے شہزادی اسی کو ملا کرتی ہے جناب۔"
رباب نے شوخی سے اسے جتلایا تھا۔
"ارے تم حکم کرو۔۔۔ نام پتا بتاؤ۔۔۔۔ کون ہے؟"
"ملوں گی تو سارا معاملہ طے کریں گے۔" رباب نے زیادہ بات نہیں کی۔ ورنہ تو کیا کیا کھل جاتا۔
"ہوں۔۔۔ تمہاری طرف تو اپنے بھی بہت سارے حساب نکلتے ہیں۔" سیفی بڑبڑایا۔
"میں اسے برباد دیکھنا چاہتی ہوں سیفی۔۔۔! اگر مجھے پانا چاہتے ہو تو۔۔۔"
منتقمانہ انداز میں کہتے رباب نے شرط کے بدلے میں انعام کے طور پہ اپنا آپ رکھ دیا تھا۔
شرائط کتنی بھی جان لیوا کیوں نہ ہوں اگر انعام آپ کا پسندیدہ ہے تو سردھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ سیفی کو بھی محبت نہ سہی "بزنس" کی خاطر یہ ٹاسک جیتنا تھا۔۔۔ ہر صورت۔



وہ دن ایہا کی زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں میں سمندر کے کنارے معیز احمد کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کے چلتی وہ خود بے یقینی کی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔

"ایک وقت تھا جب میں تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"
ریسٹورنٹ کے خوب صورت ماحول میں ابھی وہ اپنی نروس نیس پر قابو بھی نہیں پا سکی تھی۔ جب اس نے معیز کو بولتے سنا۔ وہ بے ساختہ چہرہ اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔
کہنی میز پہ رکھے بند مٹھی پہ چہرہ جمائے وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ایبہا عجیب سے احساس میں گھرنے لگی۔ پھر دفعتاً" وہ مسکرا دیا۔ اس کی نگاہ ایبہا کے چہرے پر تھی۔
"اب میں سوچتا ہوں کہ میں کتنا بے وقوف تھا۔" "تم سمجھ لو کہ آنکھوں والا اندھا۔"
رک کر اس نے گہری سانس بھری اور دونوں بازو میز کی سطح پر رکھتے ہوئے اعترافیہ بولا۔
"جب آنکھوں پہ نفرت کی پٹی بندھی ہو تو نا صرف نظر بلکہ دل پہ بھی مہر لگ جاتی ہے۔ تب اچھی سے اچھی چیز میں بھی کوئی اٹریکشن (کشش) نظر نہیں آتی۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔
ایبہا اسی طرح اسے دیکھتی رہی اور وہ ایبہا کو۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایبہا کا ہاتھ دفعتاً" اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔
"مگر اب۔۔۔ میں کبھی بھی تم سے دور رہنا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ کی گئی ہر زیادتی، ہر حق تلفی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"
ایبہا کے ذہن میں کچھ کلک سا ہوا۔ اس کے بدلتے تاثرات معیز سے مخفی نہ رہے تھے۔
"ہمدردی مت سمجھنا بیا!" میاں بیوی کے درمیان ہمدردی کا نہیں بلکہ محبت اور مان کا رشتہ ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا مگر اس رشتے میں "ہمدردی" کا کوئی عمل دخل نہیں۔"
وہ مسکرا دیا تھا اور ایبہا کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ اس پر سجدۂ شکر واجب ہو چکا تھا۔
ویٹر کو آتے دیکھ کر ایبہا نے تیزی سے اپنا ہاتھ معیز کے ہاتھوں سے کھینچا تو وہ چونک کر ویٹر کو آتے دیکھ کر بڑبڑایا۔
"بیڈ انسٹری۔۔۔"
وہ مینیو کارڈ تھامے ویٹر کو آرڈر لکھوا رہا تھا۔ ساتھ ایبہا سے پوچھتا۔۔۔ اور ایبہا کا دل مارے تشکر کے رب کے آگے جھک جھک جاتا اور آنکھوں کے کونے خوامخواہ ہی نم ہوتے رہے۔



"یا اللہ۔۔۔ کس قدر نکمی، نالائق اولاد دی ہے مجھے تو نے۔"
اب سفینہ بیگم بھری شیرنی بنی پھر رہی تھیں۔ جب اکیلے واپس آتی زارا نے انہیں بتایا کہ معیز اور ایبہا لانگ ڈرائیو کے لیے چلے گئے ہیں۔ انہوں نے بے ساختہ اللہ سے شکوہ کیا تھا۔
"کیا ہو گیا ماما۔۔۔ اب تو طے ہے سب کچھ اور پھر ان کی بیوی ہے، وہ لے جا سکتے ہیں۔"
زارا نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تو انہیں اور غصہ آنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کے اسے بازو سے دبوچا اور اپنے صوفے پہ لے کے بیٹھتے ہوئے درشتی سے بولیں۔
"اپنا یہ دماغ ہے نا، اسے درست کر لو۔ تم تو رخصت ہو جاؤ گی سسرال۔۔۔ پیچھے یہ جنجال میرے گلے پڑ جائے گا۔"
"اسے گلے سے لگا لیں، وہ کبھی گلے نہیں پڑے گی ماما۔"
"فضول باتیں مت کرو۔" انہوں نے اسے جھڑکا۔

"میں نے دو ماہ کا ٹائم دیا ہے۔ تم دیکھنا ان دو ماہ میں۔ میں اسے کیسے یہاں سے فارغ کراتی ہوں۔"
وہ تنفر سے بولیں۔

"خواب ہے آپ کا ماما۔ پہلے آپ ایسا سوچ سکتی تھیں اور شاید کر بھی لیتیں۔ مگر اب وہ بیوی ہیں بھائی کی۔ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکے ہیں۔ دل سے 'مجبوری سے نہیں۔" زارا مطمئن تھی۔

اس کی ایک فاش غلطی ایبہا اور معیز کی زندگی کو برباد کر سکتی تھی مگر اب جبکہ اللہ نے سب کچھ ٹھیک کر دیا تھا تو وہ سفینہ بیگم کی ہاں میں ہاں ملا کر ان دونوں کی مشکلات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

"اچھا بس۔ تم اپنی عقل دانی بند ہی رکھو۔" انہوں نے بے زاری سے کہا۔ پھر تفاخرانہ بولیں۔

"معیز وعدہ کر چکا ہے۔ مجھ سے اور دیکھنا میں ثابت کر دوں گی کہ وہ ایک بدکردار ماں کی بیٹی ہے جسے شریفوں کا گھر بسانا نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے 'وہ دو ماہ سے پہلے ہی اسے طلاق دے کر فارغ کر دے۔"

زارا نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔

"اچھا ماما۔ میں تھک گئی ہوں ذرا۔ ریسٹ کر لوں۔ اتنی ویر ویٹ کرنا پڑا پارلر میں۔ آج تو کسٹمرز کا رش لگا ہوا تھا۔"

زارا بہانے سے اٹھ گئی تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں اور وہ بے کل سی وہیں بیٹھی رہیں اور انہیں وہیں بیٹھے رہنا تھا اس وقت تک جب تک معیز احمد واپس نہ آجاتا۔



یہ پہلی بار تھا جب گاڑی پورچ میں رکی تو معیز کے قدم اندر کی طرف بڑھنے کے بجائے ایبہا کے ہم قدم ہوئے۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایبہا کے قدم سست پڑ گئے۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر معیز کو دیکھا' وہ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے' دوسرا دروازے کے فریم پہ ٹکائے وہیں کھڑا تھا۔

"اندر نہیں آؤں گا۔"

وہ مسکرا کر بولا تو ایبہا کے دل میں یک گونہ سکون سا اتر آیا' وہ مزید بولا۔

"بلکہ اب تم یہاں سے رخصت ہو کے میرے پاس آؤ گی۔"

اس کی پلکیں بوجھل ہو کر رخساروں پر سجدہ ریز ہو گئیں' چہرے کی سنہری رنگت پہ پھیلتے سیندور جیسے رنگ نے معیز کی نگاہ کو اس کے چہرے پر منجمد سا کر دیا۔

"ایسے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" وہ ہلکا سا بڑبڑایا' پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" وہ ذرا سا رکا پھر مسکرا کر نرمی سے بولا۔ "میری خاطر۔"

اور اب وہ جا چکا تھا تو ایبہا نے اسے مڑ کر اندرونی دروازے میں داخل ہونے تک دیکھا۔

کسی کی محبت کا اعتراف انسان کو کتنا معتبر کر دیتا ہے یہ آج ایبہا نے بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

آج سارا دن وہ ایبہا کے ساتھ رہا اور ایبہا غیر ارادی طور پر اس میں پچھلے چار سال والا معیز احمد کھوجتی رہی۔

مگر وہ اس کرخت اور اکھڑ معیز احمد کی ایک جھلک بھی پانے میں ناکام رہی تھی۔ دروازہ لاک کر کے وہ اندر کی طرف بڑھی تو اس کے ہونٹوں پہ دلکش اور خواب ناک سی مسکراہٹ تھی۔ آج اسے سب سے پہلے شکرانے کے نوافل ادا کرنے تھے۔



"ابھی اس کی رخصتی نہیں ہوئی معیز! یوں اسے لیے پھرو گے تو خاندان والے بھی باتیں بنائیں گے۔"
سفینہ بیگم نے تحمل سے اسے سمجھایا تھا۔ وہ آتے ہی اس سے ٹکرا گئی تھیں' اس موقع کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ غضب خدا کا رات کا کھانا کھا کے لوٹے تھے وہ لوگ۔
"رباب کے ساتھ بھی تو پھرتا تھا ماما!"
معیز نے انہیں تسلی دی۔ وہ مسکرا رہا تھا اور یہ پہلی بار تھا کہ معیز کا یہ خوش باش سا انداز سفینہ بیگم کو تلملانے پر مجبور کر رہا تھا۔ ورنہ تو خوش ہی ہوتیں۔
"وہ تو سب کو پتا تھا کہ اسی سے شادی ہو گی تمہاری۔" انہوں نے بے ساختہ کہا تو وہ شانے اچکا کر بولا۔
"تو اب انہیں بتا دیں کہ میری شادی ایہا سے ہونے والی ہے۔" انہوں نے دانتوں پر دانت جمائے۔ پھر بڑے ضبط سے بولیں۔
"مجھے تو شرم آتی ہے سوچ کر... کیا تعارف کراؤں گی۔ خاندان والوں میں تمہاری بیوی کا کہ صالحہ کی بیٹی ہے یہ..."
"خاندان والوں کی بھی اتنی ہی رشتہ داری ہے ان سے۔" معیز نے انہیں یاد دلایا۔
"مگر ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا معاشقہ نہیں تھا۔" سفینہ... کا لہجہ تلخ و ترش ہو گیا۔
معیز سنجیدہ سا انہیں دیکھنے لگا۔
"وہ ابو کی منگیتر تھیں ماما... ان کا رشتہ گھر کے بڑوں نے طے کیا تھا۔ اس میں معاشقے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔"
"خیر... اب تو پانی سر سے گزر چکا۔ حقیقت تلخ سہی مگر دفع کرو..."
انہوں نے معیز کا بدلتا موڈ دیکھ کر فوراً" اپنا انداز تبدیل کر لیا۔
"میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمہارے نکاح کا ابھی کسی کو علم نہیں۔ اس لیے اسے لے کر مت گھومو۔ کل کلاں کو پتا چلے گا تو بات پھر صالحہ کی بیٹی پر آئے گی۔"
نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے گھوم پھر کر وہ پھر سے اسی بات پر آگئیں تو معیز گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ ایہا کے ساتھ ایک بہترین دن گزار کے آنے کے بعد قدرتی طور پر اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ایسے میں یہ بے وقت کلاس... وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"جاؤ اب... آرام کرو... تھک گئے ہوں گے... صبح کے اٹھے ہوئے ہو..." انہوں نے خود ہی کہہ دیا تھا۔
"آئی لو یو ماما..." جھک کر ماں کی پیشانی چومتے ہوئے وہ پیار سے بولا تو وہ مسکرا دیں۔
"اور میں تمہیں تم سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔" ان کی بات پر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ تو وہ بڑبڑائیں۔
"اسی لیے میں تمہیں اس بے کار سی لڑکی کے پیچھے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے تمہارا پیچھا چھڑا کے ہی دم لوں گی۔"



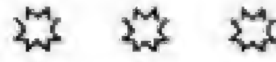
وہ سونے کے لیے لیٹ تو گئی مگر کروٹیں بدل بدل کے ہار رہی نیند نے آنا تھا نہ آئی تنگ آکر وہ اٹھ بیٹھی' تکیہ گود میں رکھ لیا۔
معیز کی باتیں' اس پر توجہ کی نگاہ' اس کا ہلکا سا وارفتہ انداز... کچھ بھی تو نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔ نیند آتی بھی تو کیسے... ہاتھوں پہ اس کا لمس سلگنے لگتا تھا۔

اسے سوچ کر حیا آئی۔ اس ماہ کے آخر تک وہ رخصت ہو کر معیز کے کمرے میں پہنچ جائے گی۔
وہ گہری سوچ میں مسکرائے جا رہی تھی۔ موبائل کی رنگ ٹون نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔
اس نے پاس پڑا موبائل اٹھایا تو معیز کا نام جگمگاتا دیکھ کر اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔
اس نے بٹن دبا کر موبائل کان سے لگا لیا مگر فوری طور پر اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔
"کیسی ہو۔۔۔" وہ پوچھ رہا تھا۔
"ٹھیک۔۔۔" وہ دھیمے سروں میں بولی۔
"سوئیں کیوں نہیں ابھی تک؟"
"نیند ہی نہیں آئی۔"
وہ بے ساختہ بولی' پھر زبان دانتوں تلے دبالی۔
"مجھے بھی۔۔۔" معیز کا بوجھل سا لہجہ اسے سنسنا گیا۔
"مجھے سمجھ نہیں آتی بیا۔۔۔ میں اتنی بڑی بے وقوفی کیسے کرتا رہا۔ تم میرے نکاح میں تھیں۔ ایک مکمل شریک حیات کے روپ میں۔۔۔ پھر میں تمہیں جان کیوں نہیں پایا۔" وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔
ابیہا کو ہنسی آئی۔۔۔ ہاں۔۔۔ اب اسے ان باتوں پہ رونا نہیں آتا تھا۔
"چلیں اب تو پتا چل گیا۔"
ہنسی آلود لہجے میں کہا تو وہ لمبی سانس بھر کے بولا۔
"نقصان بھی تو میرا ہی ہوا۔ اچھی بھلی شرعی بیوی ملی تھی' ناقدری کی تو اب پھر سے رخصتی کا انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔"
اب کی بار ابیہا کی ہنسی طویل تھی۔
جس پہ آپ دل ہار چکے ہوں' وہ اپنی ہار مان لے تو دل کی خوشی کا عالم ہی اور ہوا کرتا ہے۔ کائنات کی وسعتیں پیروں تلے محسوس ہونے لگتی ہیں۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔
ابیہا احساس ہونے پر ایک دم خاموش ہو گئی۔ شاید وہ برا مان گیا تھا۔
"ہیلو۔۔۔" اس نے گھبرا کر کہا۔
"یوں ہی ہنستی رہو بیا۔۔۔! مجھے اپنے گناہ جھڑتے محسوس ہو رہے ہیں۔"
وہ بوجھل سے لہجے میں بولا تو تاسف کا ہر رنگ اس کے انداز میں تھا۔
"بیا۔۔۔"
ابیہا کا رواں رواں سماعت بنا ہوا تھا اور زبان گنگ۔۔۔
"ہوں۔۔۔"
"ایک بات بولوں۔۔۔ یقین کرو گی؟"
وہ اذن لے رہا تھا۔
"آپ کے کہے بنا بھی مجھے یقین ہے معیز۔"
سارے جہاں کا یقین ابیہا کی جذباتیت میں سمٹ آیا۔
"مگر میں پھر بھی یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں بیا!" وہ پکارتا تھا یا جان نکالتا تھا۔ ابیہا نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔

اک عمر ہے جو تیرے بغیر بتائی ہے

اک لمحہ ہے جو تیرے بغیر گزرتا نہیں

وہ مسمرائز تھی، ممنون تھی یا پھر بے یقین۔۔۔ وہ خود اپنے احساسات و جذبات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔
باہر رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔۔۔ اور وہ دونوں جذبات میں۔۔۔ وہ رات ان دونوں کے مابین ایک دوسرے کو مزید سمجھنے والی بہت البیلی اور انوکھی رات تھی۔



سفینہ بیگم کا پارہ ان دنوں ہر وقت ہائی رہنے لگا تھا مگر وہ مسلسل خود کو ٹھنڈا رہنے کی اندر ہی اندر تلقین کرتی رہتی تھیں۔ وجہ یہ ہی کہ زارا جب بھی شاپنگ کے لیے نکلتی، معیز بطور ڈرائیور ساتھ ہوتا اور ایبہا ان کا لازمی جزو۔ اس کی بھی شاپنگ جاری تھی۔

"پاگل۔۔۔ بے وقوف اولاد۔۔۔" انہیں طرارہ آتا۔

"میں اسے طلاق دلوانے کے چکروں میں ہوں۔ یہ نکمی اس کی بری پہ پیسہ اڑا رہی ہے۔"

انہوں نے سوچا ہی نہیں، زارا سے کہہ بھی دیا اور جواباً "زارا کچھ بولی تھیں،" بس تاسف بھری خفگی سے انہیں دیکھا اور خاموشی سے چلی گئی۔

سفینہ دانت پیس کے رہ گئیں۔۔۔



ایبہا شاپنگ کا سامان لاؤنج ہی میں بکھرا چھوڑ کر چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ معیز نے ان دونوں کو کھانے کی آفر بھی کی تھی مگر شاپنگ میں مصروف زارا نے انکار کر دیا۔ معیز نے بطور خاص ایبہا کو آفر کی، مگر وہ زارا کو اکیلے چھوڑ کے جانے پہ متذبذب تھی، سو انکار کر دیا۔ اب بھوک محسوس ہوئی تو بسکٹ کا پیکٹ کھول کے پلیٹ میں بسکٹ نکال لیے۔

باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ ٹھٹکی۔

زارا۔۔۔ یا پھر معیز۔۔۔؟

اس کا دل دھڑک اٹھا۔

معیز سے اب جتنی بے تکلفی ہو چکی تھی، بات چیت کی حد تک ہی سہی، اس کے بعد وہ اکیلے میں اس سے ملاقات کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ چولہے کا برنر آف کرتی کچن سے باہر نکلی تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ سفینہ بیگم کو سامنے پائے گی۔ اس کے قدم وہیں جم سے گئے۔۔۔ رگوں کے خون کی طرح۔۔۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)

کائنات غزل



"مما جی ہمارا بکرا کب آئے گا۔؟" چار سالہ انس نے کچن میں کام کرتی آمنہ کا پلو تھاما۔

"آجائے گا بیٹا" آمنہ نے پلٹ کر انس کو اٹھایا اور سلیب پر بٹھادیا۔ خود پیچھے منہ کر کے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرنے لگی۔

"مما نوڈلز بنادیں پلیز۔" انس کی طرف سے جھٹ فرمائش آئی۔



آمنہ کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ شادی کے ایک سال تک وہ اپنی ساس کے ساتھ رہی پھر دیور کی شادی ہونے پر الگ ہو گئی۔ دو بچے انس' اویس اور شوہر عذیر کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دنوں پہلے آمنہ کی بیسی نکلی تھی جس سے اس نے ڈیپ فریزر خریدا تھا اور بقیہ رقم قربانی کے بکرے کے لیے رکھ دی تھی۔ لیکن انسان جو سوچتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔ عذیر کو کام کے سلسلے میں رقم درکار تھی۔ قربانی کی رقم عذیر کے استعمال میں آگئی۔ اویس تو چلو چھوٹا تھا اسے اتنی عقل نہیں تھی لیکن انس کی آس پاس کے جانور دیکھ دیکھ کر ایک ہی رٹ تھی۔

"مما جی! ہمارا بکرا کب آئے گا۔" آمنہ ایک سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ اس نے نہایت منظم طریقے سے گھر کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں عذیر کے آگے نہیں رکھتی تھی لیکن انس کی ضد سے زچ ہو کر آخر ایک دن عذیر کے سامنے پھٹ پڑی۔

"کتنے دن ہو گئے عذیر آپ کے وعدے کو' میں نے قطرہ قطرہ کر کے جمع کیے تھے قربانی کے لیے چالیس ہزار روپے' آپ اکٹھے لے گئے ایک ہفتے کے وعدے پر۔ بیس دن ہو گئے روپیہ بھی واپس نہیں کیا آپ نے۔" بیڈ پر بیٹھ کر زاروقطار رونے لگی۔

"اوپر سے سارا دن انس کی ایک ہی تکرار 'بکرا کب آئے گا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی بالکل۔" عذیر جو کسی کتاب کے مطالعے میں بری طرح مصروف تھا۔ ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر میں اس کے حواسوں نے کام کرنا شروع کیا تو بولا۔

"ارے۔ ارے یہ بن بادل برسات کیوں بھئی۔؟" آجائے گا بکرا' بیگم روتی کیوں ہو۔ بیس دن ہوئے ہیں' بیس سال تو نہیں۔ چلو اچھی سی چائے تو پلاؤ۔ تمہارے میٹھے میٹھے ہاتھوں کی چائے پینے کا بہت دل چاہ رہا ہے قسم سے۔"

"بس رہنے دیں اپنی باتیں۔ یہی کرتے کرتے عید کردیں گے آپ۔" وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھتی' غصے میں اٹھ کر چائے بنانے چل دی۔

"سنو رہنے دو۔ خود بھی جلی ہوئی ہو' چائے بھی جلادو گی۔" عذیر اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔ کرسی گھسیٹ کے وہیں بیٹھ گیا۔

"یار میں خود بھی پریشان ہوں۔ تم بھی دعا کرو ایسے حالات بن جائیں کہ ہم قربانی کر سکیں۔ رقم تو سمجھو پھنس گئی ہے۔ ادھر ادھر سے کچھ ادھار مل جائے تو ایک کیوٹ سا چھوٹا بکرا لے آئیں گے۔ بالکل اپنے اویس جیسا۔"

اس کے اویس جیسا کہنے پر آمنہ نے مڑ کر اسے آنکھیں دکھائیں۔

"میرے بیٹے کو بکرے سے تو نہ ملائیں۔"

"اوہ۔ شکر تمہارے چہرے پر اسمائل تو آئی۔ ورنہ



میری چائے بھی تمہاری شکل جیسی کڑوی ہو جاتی۔" عذیر نے کہتے ہی اندر کی طرف دوڑ لگائی کیوں کہ اس کے پیچھے آمنہ ڈوئی لے کر بھاگی تھی۔



"واؤ۔ مما کتنی کیوٹ گائے ہے یہ۔ اس کے سینگ بھی بالکل راؤنڈ میں ہیں اور پلکیں بالکل وائٹ۔ مما اس پر اویس کو بٹھا دیں۔"

"نہیں میری جان' قربانی کے جانور کی سواری نہیں کرتے۔" آمنہ شام میں اکثر بچوں کو پارک لے جاتی تھی۔ آج پارک سے واپسی پر انس کی فرمائش پر اسے جانوروں کی طرف لے آئی۔

"مما اس بکرے کو تو دیکھیں کتنی شرارت کر رہا ہے۔ مما ہم اپنا بکرا بالکل شریف لائیں گے۔" اس کی تان ہر بات کے آخر میں اپنے بکرے پر ہی ٹوٹتی۔ اس نے سرہلاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل منڈلانے لگے تھے۔ تو آمنہ نے انس کا ہاتھ تھاما اور پیچھے روڈ پر آگئی کہ مغرب کا وقت بھی قریب تھا اس کی کوشش تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ گود میں اویس کو اٹھائے اور انس کی انگلی تھامے وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ وہ موسم کو انجوائے کرتی جا رہی تھی۔

"مما آئس کریم۔" اُف انس کی فرمائشیں۔

"سیدھے چلو انس۔" اس نے انس کو گھر کا۔ سائیکل پر آئس کریم بیچنے والا خود ہی آکر پاس کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً" اس نے انس کا فیورٹ فلیور لیا "اپنے لیے چاکلیٹ آئس کریم لی۔ کھاتے کھاتے قدم اور بھی ہلکے ہو گئے۔ ٹپ ٹپ بارش کی بوندیں موٹی ہوئیں اور تیزی سے برسنے لگیں۔ اس نے جلدی سے درخت کے نیچے رک کر آئس کریم پوری ختم کی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی جانب چلنے لگی۔

بادل گرج چمک کے ساتھ برسنے لگے تو لوگ اپنے جانوروں پر شیٹس ڈالنے لگے۔ ہر طرف افرا تفری پھیل گئی تھی۔ ایک دم ایک کار اس کے بالکل پاس سے تیزی سے گزری' چند قدم آگے رکی پھر ریورس ہو کر اس کے بالکل ساتھ رک گئی۔ آمنہ کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ اس نے قدم مزید تیز کر دیے۔ لیکن جب کار میں بیٹھے شخص نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔ اس نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی اس کی مدد کو آجائے۔ جیسے ہی اس کی ہاتھ تھامنے والے پر نگاہ گئی تو دوسری چیخ بھی نکل گئی۔

"عذیر۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟"

"جلدی سے آکر بیٹھو گاڑی میں' بالکل بھیگی بلی لگ رہی ہو۔" اویس کو اس نے کھڑکی سے ہی گود میں لیا۔ وہ انس کا ہاتھ پکڑے دوسری طرف آکر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا حرکت کی عذیر' میری جان نکل جاتی تو۔"

"تو اس ناچیز کی جان حاضر ہے' ہاف ہاف کر لیتے۔" آمنہ نے اس کی بات کے جواب میں اس کے کندھے پر ایک مکا رسید کیا اور باہر دیکھنے لگی۔

"ایک تو گاڑی ادھار مانگ کر لایا ہوں کہ ملکہ عالیہ کے ساتھ رومانٹک موسم کو انجوائے کیا جائے لیکن

ملکہ عالیہ کے نخرے کم ہی نہیں ہو رہے۔"
"پاپا مری ویو چلیں۔" باپ کو دیکھ کر انس کی فرمائشیں پھر سے شروع ہو چکی تھیں۔
"بیٹا جی مری ویو پر بہت رش ہو گا۔ آج ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے پھر واپسی میں کینڈل لائٹ ڈنر کریں گے۔"
"او کے پاپا۔" انس اچھے بچوں کی طرح سر ہلا کر دونوں کے درمیان سے نکل کر پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔
"کیا خیال ہے امی کی طرف چلیں۔؟" واپسی میں دونوں بچے تھک کر پچھلی سیٹ پر سو چکے تھے۔ آمنہ بھی اب گھر جانا چاہتی تھی۔ لیکن عذیر کی بات سے انکار نہیں کر سکی تھی۔ کہ اس کی ساس۔ ساس نہیں تھیں بلکہ اس کی ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں۔ دونوں کا بھی ساس بہو کا رشتہ لگتا ہی نہ تھا۔ آمنہ کی ماں اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ یوں اسے لگتا کہ اسے ماں مل گئی۔ ہر بات نہایت پیار سے سمجھاتیں۔ کبھی کسی بات پر ٹوکتی نہ تھیں۔ ہمیشہ موقع کی مناسبت سے اپنے عمل سے کر کے دکھاتیں۔ آمنہ ان سے الگ ہونے پر اپنی رخصتی سے زیادہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔



"بیٹا آج یہیں رک جاؤ' سڑکوں پر بہت پانی کھڑا ہے بچوں کا ساتھ ہے' خدانہ کرے کوئی مسئلہ ہو جائے۔" امی جان نے جمائیاں لیتے عذیر کو کہا۔
"اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ عذیر جو گھر جانے کی وجہ سے اپنی نیند کو بھگا رہا تھا۔ اس نے پاس پڑا کشن اٹھایا منہ پر رکھا اور وہیں کارپٹ پر بچوں کے پاس دراز ہو گیا۔ امی جان نے مسکراتے ہوئے آمنہ کو دیکھا اور سر ہلایا۔
"سدھرے گا نہیں یہ لڑکا۔ آؤ آمنہ' میرے کمرے میں آجاؤ۔ یہ چادر بچوں کو اڑھا دو اور یہ عذیر کو۔ بارش میں بھیگے ہیں کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ تم میرے ساتھ بیڈ پر آجاؤ۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"
"مبارک ہو بیٹا جی' فریزر لے لیا۔" وہ اپنے کمرے میں بیٹھی آمنہ سے مخاطب تھیں۔
"جی امی جان۔" "بقر عید بھی تو قریب آرہی ہے۔"
"لیکن بیٹا فریزر پہ بھی زیادہ لوڈ نہ ڈالنا۔ بجلی کا تو تمہیں معلوم ہے۔ پچھلے سال برابر والی رخسانہ نے نیا ڈیپ فریزر خریدا۔ بکرا کٹوا کر فریز کر دیا۔ گوشت اور پورے بکرے کا لوڈ فریزر سے برداشت نہ ہوا۔ بجلی بھی آنا جانا کر رہی تھی۔ بکرا تو خراب ہوا ساتھ فریزر بھی ایسا خراب ہوا کہ اب تک چل ہی نہ سکا۔" امی جان نے پان کی پٹاری اٹھائی اور پان لگاتے ہوئے بولیں۔
"اور میرا بچہ سچ کہوں تو ہم تو پورا سال ہی گوشت کھاتے ہیں اور قربانی کا گوشت بھی حق داروں تک نہ پہنچے تو اوپر والا انصاف کرنے والا ہے۔"



"کیا بات ہے آج کل میری بلبل بہت اداس ہے۔؟" عذیر دو دن سے اس کی خاموشی نوٹ کر رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا تو بول پڑا۔ وہ ناشتے کے بعد برتن سمیٹنے کے بجائے وہیں ٹیبل پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
"آں۔ ہاں۔ نہیں تو۔" وہ یک دم چونکی اور جبراً" ہلکا سا مسکرائی' مبادا عذیر اس کی خاموشی سے کوئی غلط مطلب اخذ نہ کر لے۔
"اچھا مجھے لگا اس دن آؤٹنگ پر یا امی کے گھر تمہیں کوئی بات بری لگی۔ یا تم نے کسی کی بات کو دل پہ لگا لیا۔ ایم آئی رائٹ۔؟" وہ صوفے پہ بیٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے بولا۔
"ارے نہیں بھئی۔ آپ تو ہر بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ آجاتی ہے طبیعت میں سستی کبھی

بھی۔" وہ جلدی جلدی پلیٹیں سمیٹنے لگی۔

"یہ سستی کہیں کسی مہمان کی آمد کی وجہ سے تو نہیں ڈیئر وائف۔؟" وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تو عذیر اس کے دونوں کاندھے تھام کر بولا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں۔ بجے دو ہی اچھے۔" آمنہ نے کہنے کے ساتھ ہی اسے گھمایا اور باہر کی طرف دھکیلا۔

"خدا کی بندی ایسے دھکے تو نہ دو' بریف کیس تو اٹھا لینے دو۔" وہ ہنستا ہوا آگے بڑھا اور بریف کیس اٹھا کر اسے خدا حافظ کہتا سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ دروازہ بند کر کے اندر آئی تو پھر وہی کیفیت اس پر حاوی ہونے لگی۔ آخر کار وہ جھنجلا گئی۔ اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کیا کرے پھر اسے یاد آیا کہ امی جان کہتی ہیں نماز کے ذریعے سے اپنے مسائل حل کراؤ۔ وہ فوراً" اٹھی وضو کیا۔ دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے باتیں کرنے لگی۔

"یا اللہ میں بہک گئی تھی۔ مجھے تو قربانی کا مطلب بھی نہیں پتا تھا تو مجھے معاف کر دے۔ میرے دل کو سکون دے دے میرے مولا! میں آئندہ جب بھی قربانی کروں گی۔ اقربا' غربا' مساکین کا حصہ سب سے پہلے نکالوں گی۔ بس تو میرے دل کو سکون دے دے۔" وہ خوب گڑگڑا کر روئی۔

رونے سے دل ہلکا ہو گیا تھا۔ اویس کے رونے کی آواز پر جائے نماز لپیٹ کے کھڑی ہو گئی۔

"مما اب تو کل بقرعید ہے اور ہمارا بکرا ابھی تک نہیں آیا' ہم صبح کیا کاٹیں گے۔؟" آمنہ عید کے لیے شیر خورمہ بنا رہی تھی۔ انس نے آکر پھر وہی سوال کر ڈالا جس سے وہ خود بھی بچ رہی تھی۔

"دعا کرو انس بیٹا۔ اللہ پاک بکرا دیں گے۔"

"او کے امی۔" انس اچھلتا کودتا اندر کی جانب بڑھ گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا کہ ابھی اس نے زیادہ ضد نہیں کی۔ کچن سے فارغ ہو کر وہ صبح کے لیے

کپڑے نکالنے کمرے میں آئی تو دیکھا انس اپنے پاپا کی ٹوپی پہنے' جاء نماز پر آنکھیں بند کر کے بڑے جذب کے ساتھ دعا مانگنے میں مشغول تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی آگئی۔

"یا اللہ اب تو بکرا دے ہی دے۔" آمنہ کے دل سے بھی یہی دعا نکلی۔ دروازے پر ڈور بیل ہوئی' ساتھ ہی بکرے کی آواز بھی آئی۔ آمنہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ انس نے دعا کے ہاتھ منہ پر پھیرے اور جاء نماز پر ہی "یاہو۔ بکرا آگیا۔" کا نعرہ لگاتا کھڑا ہوا اور دوڑ کر دروازے تک پہنچا۔ اتنی دیر میں عذیر ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کر اندر آگئے۔ ساتھ میں سفید نہایت خوب صورت بکرا تھا۔ جس کے ریشمی چمکتے بال اور بڑے بڑے سینگ تھے۔ بڑی تمکنت کے ساتھ وہ قدم رکھتا اندر کی جانب آیا۔

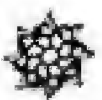
"عذیر۔ عذیر۔ یہ۔ کس کا بکرا ہے؟ اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"آمنہ یہ انس کا بکرا ہے۔ انس کی والدہ کا بکرا ہے۔" عذیر نے نہایت نرمی سے بکرے کی پیٹھ سہلائی۔

"یہ۔ یہ۔ کیسے۔" وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

"یہ ایسے کہ اچانک وہ بندہ جس کے پاس پیسے اٹکے تھے' دینے چلا آیا۔ میں نے آفس سے ہاف ڈے لیا اور گیا سیدھا منڈی۔ وہاں سے یہ باڈی بلڈر لیا اور سیدھا گھر۔ اب بھی کچھ رہ گیا تو پوچھ لو۔ ورنہ اس انٹرویو میں تو تم نے پانی کو بھی نہیں پوچھا۔"

"اوہ سوری۔" وہ سر پر ہاتھ مارتی کچن کی طرف دوڑی۔ عذیر' انس اور اویس سے بکرے کو پیار کرا رہے تھے۔ اویس بکرے کے نرم بالوں پر ہاتھ رکھتا تو قل قل کر کے ہنسنے لگتا۔ اس کے ساتھ سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ آجاتی۔ آمنہ نے اپنی نیت بدلی۔ اللہ نے اس کا کام بنا دیا۔ اس کے چہرے پر بھی آسودہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔



خوب جھگڑا کریں، خوب گریہ کریں
آؤ مل جل کے پھر اک تماشا کریں

وہ جو تھا، کوئی تھا، وہ نہیں ہے یہاں
اب کسی اور کی کیا تمنا کریں

دل نہیں لگ رہا ہے کہیں بھی مرا
اس اذیت میں تھوڑا اضافہ کریں

اب جو کم پڑ گیا ہے، سب ہی کچھ یہاں
کس سے کہیے کہ صاحب مداوا کریں

آگہی کا سفر بس کہ دشوار ہے
جو نہیں چل رہا اس کو چلتا کریں

ٹوٹنا دل کا کوئی نئی بات ہے؟
بات بھی ہو کوئی جس کا چرچا کریں

اس کی آنکھوں میں ڈوبیں کنارے لگیں
ایک ہی عشق ہو اور ایسا کریں

سید کامی شاہ

اُجالا دے چراغِ رہ گزر آساں نہیں ہوتا
ہمیشہ ہو ستارا ہم سفر، آساں نہیں ہوتا

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا

بڑے تاباں، بڑے روشن ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
سحر کی راہ تکنا تا سحر، آساں نہیں ہوتا

اندھیری کاسنی راتیں یہیں سے ہو کے گزریں گی
جلا رکھنا کوئی داغِ جگر آساں نہیں ہوتا

گماں تو کیا یقیں بھی وسوسوں کی زد میں ہوتا ہے
سمجھنا سنگِ در کو سنگِ در آساں نہیں ہوتا

نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

ادا جعفری

یہ چند سانس تمہیں کیوں گراں گزر رہے ہیں
کہ ہم تو جاں ہی سے اب میری جاں گزر رہے ہیں

انہیں خبر ہی نہیں، دھوپ ڈھل چکی کب کی
جو لوگ تانے ہوئے چھتریاں گزر رہے ہیں

نجانے کس کے لیے میں رکا ہوا ہوں ابھی
مجھے تو چھوڑ کے سب مہرباں گزر رہے ہیں

ہے چھینی عشق کی ہر انتہا نے، خودداری
ہم اختیار سے اپنے، کہاں گزر رہے ہیں

کہیں کا بھی نہیں چھوڑا ہے عشق نے ہم کو
سو بے وجود ہیں اور بے کراں گزر رہے ہیں

خدا نہ کردہ کہ تو داد کو کبھی ترسے
ترے جہاں سے ترے قدرداں گزر رہے ہیں

صابر ظفر

گزارش

غموں میں غرق راتیں ہیں
بہت پُر درد باتیں ہیں
میری آنکھوں کے حلقوں کو
ذرا تم غور سے دیکھو
میری پُر خواب پلکوں کو
ذرا تم غور سے دیکھو
میں سونا چاہتا ہوں پر
میری آنکھوں کو عادت ہے
تری یادوں میں جگنے کی
اکیلے یوں سلگنے کی
میں آنکھیں بند کرتا ہوں
خیال یار سے ہٹ کر
سنو میں سو تو جاتا ہوں
عدم میں کھو تو جاتا ہوں
مگر اتنی گزارش ہے
میرے خوابوں میں مت آنا
میرے خوابوں میں مت آنا

ماجد جہانگیر مرزا

شگفتہ جاہ

رنگارنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوم عاشور کے روزے کی بابت سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔"
(مسلم)

دعا،

حضرت رابعہ بصری کی نماز تہجد کی دو اہم دعائیں۔
1۔ اے اللہ! رات آگئی، تارے چمک چکے، دنیا کے بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کرلیے۔ اے اللہ! تیرا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ میں تیرے در پہ مغفرت کا سوال کرتی ہوں۔
2۔ اے اللہ! جس طرح تونے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے۔ اسی طرح شیطان کو مجھ پر مسلط ہونے سے بچا۔

فائزہ، اضواء۔ کورنگی کراچی

لالٹین،

ریلوے حادثے کی محکمانہ کارروائی ہورہی تھی۔ جب چوکیدار کی باری آئی تو اس نے دس مرتبہ ایک ہی بات دہرائی اور کہا۔

"رات اندھیری تھی، حضور! آگے لائن ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے بار بار لالٹین ہلائی۔ لیکن مال گاڑی کے ڈرائیور نے رتی بھر توجہ نہ دی۔"

جب اسٹیشن ماسٹر اور چوکیدار علیحدہ ہوئے تو اسٹیشن ماسٹر بولا۔

"شاباش! تم نے تو کمال کردیا۔ انجینئر صاحب نے مختلف طریقوں سے پوچھا۔ مگر تم نے ایک ہی بیان دیا۔ اب تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔"

"مہربانی ہے جناب! لیکن میں تو سارا وقت ڈرتا ہی رہا کہ اگر انجینئر صاحب پوچھ بیٹھے کہ لالٹین روشن بھی تھی کہ نہیں، تو میں کہیں کا نہ رہتا۔"

عابدہ نثار۔ کراچی

قول حضرت علی رضی اللہ عنہ،

زندگی کے ہر موڑ پر صلح کرنا سیکھو۔ کیونکہ جھکتا وہی ہے جس میں جان ہوتی ہے۔

نوال افضل گھمن۔ لاہور

عورت،

حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔
"عورت چاند کی طرح نہیں ہونی چاہیے جس کو ہر کوئی بے نقاب دیکھے۔ عورت سورج کی طرح ہونی چاہیے جسے دیکھنے سے پہلے آنکھیں جھک جائیں۔"

انشیٰ ناصر۔ کراچی

شکایت،

شوہر نے عدالت میں مجسٹریٹ سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔" جناب! یہ سپاہی ہم میاں بیوی کو یونہی پکڑ کر عدالت میں لے آیا۔ حالانکہ ہم تو گلی میں کھڑے معمولی سی بات پر بحث و تکرار کررہے تھے۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔" مگر آپ لوگ گھر کے بجائے گلی میں کیوں جھگڑا کررہے تھے۔"

بیوی فوراً بولی۔" تو آپ کا مطلب ہے کہ ہم اپنا سارا فرنیچر توڑ ڈالتے۔"

نمرہ، اقراء۔ کراچی

سر کے خطاب کی پیشکش،

ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ریڈنگ قائداعظم کی صلاحیتوں، دیانت داری اور فرض شناسی کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ پہلے اس نے انہیں ہائی کورٹ کا جج بنانا چاہا۔ پھر وائسرائے کی کابینہ میں قانونی رکن کی حیثیت سے تقرر کی پیشکش کی مگر قائد انہیں ٹالتے رہے۔ ایک روز انہوں نے قائد سے کہا۔

"آپ کا سر محمد علی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

قائداعظم نے فرمایا "سر محمد علی جناح کے مقابلے میں، میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے صرف محمد علی جناح کہا جائے۔"

لارڈ ریڈنگ کو یہ جواب سن کر مایوسی تو ضرور ہوئی ہو گی مگر جناح کو کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا اور نہ وہ حکومت کے حواریوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ جناح صاحب سے مایوس ہو کر لارڈ ریڈنگ نے مسز رتی جناح کو ہموا بنانے کی کوشش کی مگر انہوں نے کہا۔

"اگر جناح نے سر کا خطاب قبول کیا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گی۔"

عذرا، اقصیٰ۔ کراچی

مصروفیت،

بیوی نے شوہر کو فون کیا اور پوچھا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

شوہر نے جواب دیا "میں آفس میں ہوں اور بہت مصروف ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو ڈارلنگ؟"

بیوی بولی "کے ایف سی میں ہوں، تمہارے پیچھے بیٹھی ہوں گھٹیا انسان!"

تحریم، عائشہ۔ گوجرہ

احساس،

بچے کو غصے میں ہلکا سا تھپڑ لگا دیں تو وہ رو پڑے گا۔ مگر مذاق میں مارے ہوئے زور کے تھپڑ سے بھی ہنستا رہے گا۔ نفسیاتی درد جسمانی درد سے زیادہ شدید ہوتا ہے اور زبان سے لگایا ہوا زخم کلہاڑی کے زخم سے بھی زیادہ دردناک...

رضوانہ شکیل داؤ۔ لودھراں

پسندیدہ شخص،

حضرت عمر بن خطاب فرمایا کرتے تھے۔

"مجھے سب سے زیادہ وہ شخص محبوب ہے جو میرے عیب سے مجھے آگاہ کرتا ہے۔"

ندا، ھنہ۔ کراچی

دستک،

جاگو! اٹھو! بہت دیر ہو گئی ہے
فرشتے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں

وہ جلدی میں ہیں اور انتظار نہیں کر سکتے
اور اگر ایک مرتبہ چلے گئے تو پھر نہیں آئیں گے

چلو اٹھو! اس کھلاڑی کا بازو
بہت زیادہ آرام کی وجہ سے اپنی طاقت کھو دیتا ہے
بنجر زمین اور غیر کاشت شدہ کھیت کی طرح
جو صرف جڑی بوٹیاں ہی پیدا کرتے ہیں
(ہنری ورڈز ورتھ)

لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

یہودی،

جنگ عظیم کے زمانے کا ایک روسی قیدی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ 1914ء میں جرمنوں نے جیل میں ہمیں مجبور کیا کہ ہم گڑھے کھودیں اور ان میں یہودی قیدیوں کو زندہ لٹا کر ان گڑھوں کو مٹی سے پر کر دیں۔ ہم نے اس بربریت کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ تب جرمنوں نے ہمیں گڑھوں میں ڈالا اور یہودیوں سے کہا کہ ان گڑھوں کو مٹی سے پر کر دیں۔ یہودی فوراً تیار ہو گئے۔ تب جرمنوں نے ہمیں گڑھے سے نکالا اور کہنے لگے۔

"ہم یہ چاہتے تھے کہ تم جان لو کہ یہودی کیسے ہوتے ہیں۔"

مدیحہ نہید۔ کراچی

بادشاہ،

شیر کے ریٹائر ہونے پر جنگل کے سارے جانوروں نے بادشاہ کے لیے اجلاس کیا۔ اجلاس جاری تھا کہ ایک گدھا ایک دم کھڑا ہوا اور بولا۔

"اس بار مجھے جنگل کا بادشاہ بنایا جائے۔"

لومڑی مسکرا کر بولی۔ "میں صدقے جاؤں۔ یہ جنگل ہے کوئی پاکستان نہیں۔"

میری بیوی،

ایک آدمی بزرگ کے پاس گیا اور کہا۔

"میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں میری بیوی —— میرے آگے آجاتی ہے۔ کوئی حل بتائیں؟"

"برخوردار! تو ٹرک چلا کے دیکھ، اللہ مہربانی کرے گا۔" بابا جی نے کہا۔

صائمہ بھی، صدف عمران۔ کراچی

یہ دُنیا ہے،

ایک اونٹ کسی جگہ پر کھڑا تھا اور اُس کی مہار زمین پر گری ہوئی تھی۔ چوہے نے اونٹ کی مہار کو منہ میں لے کر کھینچا۔ اونٹ چلنے لگا۔ چوہے نے دل میں خیال کیا کہ میں تو بڑا شہ زور ہوں کہ میرے کھینچنے پر اونٹ میرے پیچھے پیچھے چل پڑا ہے۔

اونٹ نے جب چوہے کی یہ حرکت دیکھی تو اسے مزید بے وقوف بنانے کی خاطر اپنے آپ کو اُس کے تابع کر دیا۔ چوہے نے اونٹ کی نکیل کو اپنے منہ میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگے آگے غرور کے ساتھ اکڑتا ہوا چلنے لگا۔ پیچھے پیچھے یہ اونٹ مثل تابعدار غلام کے چل رہا تھا۔

دونوں اسی طرح رواں دواں تھے کہ راستے میں ندی آگئی۔ اب تو بس چوہے کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اب تک تو میں نے اس عظیم القامت جسم والے کی رہبری کی اور مجھے فخر تھا کہ اونٹ میرا تابع ہو گیا ہے مگر اب پانی میں رہبری کس طرح کروں۔ یہ سوچتے ہوئے چوہا ندی کے کنارے پر جا کھڑا ہوا۔ اونٹ نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

"اے میرے جنگل و بیاباں کے رہبر! تو اس قدر ڈر کیوں گیا؟ یہ توقف اور حیرانی کیسی۔ مردانہ وار دریا کے اندر قدم رکھو۔ ہمارے رہنما ہو، چلو آگے بڑھو اور دریا میں اترو۔"

چوہے نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اتروں کیا خاک! ندی بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔"

اونٹ نے کہا۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں کہ پانی کتنا گہرا ہے؟"

یہ کہہ کر اونٹ پانی میں داخل ہو گیا اور کہنے لگا۔

"میرے شیخ، میرے رہبر! اس میں تو بہت تھوڑا پانی ہے۔ بس تو اتنے ہی پانی سے دہشت کھا گیا۔ پانی میں آکر رہبری کر۔ تجھے تو اپنی رہبری پر بڑا فخر ہے۔"

چوہے نے کہا۔ "جناب! آپ کے زانو اور میرے زانو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ مجھے غرق کرنا چاہتے ہیں۔ جو پانی آپ کے زانو تک گہرا ہے وہ میرے سینے سے سو گز اونچا ہے۔"

چوہے کو جب اپنی اوقات کا پتا چل گیا تو کہنے لگا۔

"جناب! میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ میری توبہ آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ اس طرح مقتدا اور شیخ بننے کا کبھی دل میں خیال تک نہ لاؤں گا۔ اور دوبارہ زندگی بھر ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ اب خدا کے لیے اس خطرناک دریا سے مجھے پار کرا دیں۔"

اونٹ کو چوہے کی توبہ اور ندامت پر رحم آگیا۔ اس نے کہا۔

"میرے کوہان پر آ کر بیٹھ جا، تجھ جیسے سینکڑوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ایسے پُرخطر حالات میں بحفاظت ندی کے پار لے کر جا سکتا ہوں۔"

درس حیات۔

اگر تجھے خدا نے سلطان نہیں بنایا تو رعایا بن کر رہ۔

کشتی چلانی نہیں آتی تو ملاح مت بن۔

(حکایت مولانا جلال الدین رومیؒ)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

میری بیاض سے

غزالہ عقود —— گجرات

روکے کہاں رُکتے ہیں محبت کے قافلے
بس یوں ہوا کہ دل کے زمانے بدل دیے
سوچا اسے تو ہم نے نہ ملنے کی ٹھان لی
دیکھا اسے تو سارے بہانے بدل دیے

ساجدہ آرائیں —— خانیوال

کچھ اپنے دل پہ بھی زخم کھاؤ مرے لہو سے بہار کب تک
مجھے سہارا بنانے والو میں لڑکھڑایا تو کیا کرو گے

حمیدہ شوکت —— کوٹ مٹھن

ہم نے دیے ہیں عشق کو تیور نئے نئے
ان سے بھی ہو گئے ہیں گریزاں کبھی کبھی

لائبہ عزیز —— چیچہ وطنی

ہونٹوں پہ ہنسی آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے

عابدہ پروین —— لیاقت پور

پھول تو پھول ہیں اس دورِ ہوس میں قابل
لوگ کانٹوں کو بھی چن لیتے ہیں ویرانے سے

مومنہ ریحان —— لاہور

زمانہ محبت کا مارا ہوا ہے
مجھے زندگی کی دعا کون دے گا

پروین سحر —— کراچی

راحتوں سے گریز غم سے فرار
بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں

حنا ذوالفقار —— روہڑی

حیرتیں کہتی ہیں وہ آکے گئے بھی کب کے
ذوقِ نظارہ ہے کہ دیکھا بھی نہیں

عظمیٰ باسط —— کراچی

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر —— کراچی

تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ جلنے اور جلاتے میں بھلا کیا لطف آتا ہے
بس اک چھوٹی انا کے واسطے برباد ہو جانا
خودی کے زعم میں انسان کتنے دکھ اٹھاتا ہے

گڑیا شاہ —— کہروڑپکا

نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں ناصر
ہر اک سانس میرا اب سفر میں رہتا ہے

فاخرہ حیدر —— راولپنڈی

ازل سے کر رہی ہے زندگانی تجربے لیکن
زمانہ آج تک سمجھا نہیں سود و زیاں اپنا

منور خان —— کراچی

ہائے وہ حوصلے محبت کے
دل مجھے کھو کے بے قرار نہ تھا

سارہ گل —— لیہ

اب یہ عالم ہے کہ غم کی بھی خبر ہوتی نہیں
اشک بہہ جاتے ہیں لیکن آنکھ تر ہوتی نہیں

عدیلہ اقبال —— شورکوٹ

مجھے چھوڑ کر وہ خوش ہے تو شکایت کیسی
اب میں اسے خوش بھی نہ دیکھوں تو محبت کیسی

سبط الرحمٰن —— ماچھیوال گاؤں

بس کچھ ہی دیر میں محسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا
میں اس کی سرد مہری پہ محبت مار آیا ہوں

پاکیزہ ہاشمی —— بہاولپور

چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا تھا
فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے!

دعائے سحر، انا احسب —— فیصل آباد

نفرتوں کی حدیں ڈھیر ہو جائیں گی
اب نہ آنا پلٹ کر میرے شہر میں

امۃ الصبور

خواتین کی ڈائری

حرا قریشی کی ڈائری سے

کسی لاابالی، نٹ کھٹ، تصنع و ملاوٹ سے ماورا نہایت ہی پُرخلوص شخص کا تصور ابھرتا ہے، جب بھی میں "بشیر بدر صاحب" کی یہ غزل پڑھتی ہوں، ہر ہر لفظ کے معانی و مفہوم اور جذبوں کی صداقت پر دل جو کھتا ہوا جاتا ہے۔

دُنیا نے دل کو پیار کا تحفہ دیا نہیں
ہم زندگی تھے ہم کو کسی نے جیا نہیں

سورج ہے، چاند سے بھی حسین ایک روپ ہے
ایسے مکاں میں جہاں کوئی دیا نہیں

دُنیا کی اب شکایتیں کس منہ سے ہم کریں
ہم سے وفا کا وعدہ کسی نے کیا نہیں

روٹی بھی چاہیے، ہمیں پانی بھی چاہیے
ہم عام آدمی ہیں میاں، اولیا نہیں

اس کو بھی کچھ خبر نہیں آنچل کہاں گرا
ہم نے بھی اپنا چاک گریباں سیا نہیں

اک روز گھر پہ چاند ستارے بھی آئے تھے
ہم نے مگر زمین کا سودا کیا نہیں

موسم خزاں کا ہے، مری یا نہیں اداس ہیں
پھولوں کو میں نے گود میں کب سے لیا نہیں

میرے لیے کسی کی محبت تھی کائنات
میں نے زمین و آسماں، کچھ بھی لیا نہیں

حمد واجد کی ڈائری سے

علی زریون نے جواں مرگ شاعر دانیال طریر کے لیے اپنے، ہم عصر اور دوست کے حوالے سے ایک تعزیتی نظم لکھی ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کا ایک ایک لفظ ان گہرے اور سچے جذبات کا عکاس ہے جو ایک شاعر نے اپنے دوست شاعر کے نام کیے ہیں۔

تعزیت کیا کروں تری، مرے دوست
دوستی بھی کبھی مری، مرے دوست

تو ابھی بات کر کے سویا تھا
ایسی کیا نیند آگئی مرے دوست

بجھ گیا سانس کا دیا تو کیا
جل اُٹھی تیری شاعری مرے دوست

کون بولے گا اب مجھے ایسے
او مری جان، او علی! مرے دوست

موت سے کیسے ہار سکتی ہے
اتنی پُرجوش زندگی مرے دوست

تو نے دھوکا دیا ہے مجھ کو طریر
یوں بھی کرتا ہے کیا کوئی! مرے دوست

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ریحانہ قمر کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

سب کا احسان اٹھانے کی ضرورت کیا ہے
ساتھ ہو تم تو زمانے کی ضرورت کیا ہے

مسئلہ دونوں کا ہے طے بھی کریں گے دونوں
شہر کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے

دل سے طے کر کے کسی روز الگ ہو جاؤ
چھوڑنا ہے تو بہلانے کی ضرورت کیا ہے

کیا ہوا جو اس سے پہلے سا تعلق نہ رہا
شہر کو چھوڑ کے جانے کی ضرورت کیا ہے

خواہشیں دل سے نکل جائیں تو حیرت کیسی
ان پرندوں کو ٹھکانے کی ضرورت کیا ہے

غول چڑیوں کا تمہیں کیوں نہیں اچھا لگتا
جھیل میں زہر ملانے کی ضرورت کیا ہے

پھول کو خود مچلتے دیکھا ہے قمر
تم ہو خوشبو تو بتانے کی ضرورت کیا ہے

شفق راجپوت کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت غزل آپ سب بہنوں کے نام۔ شاعر کا نام مجھے معلوم نہیں۔

معیار گرتا نہ دوستوں کا نہ ہم بھی دشمن کی ڈھال ہوتے
ضعیف دشمن پہ وار کرتے تو وقت کے ہم دجال ہوتے

نہیں تھا اپنا مزاج ایسا کہ ظرف کھو کر انا بچاتے
ورنہ ایسے جواب دیتے پھر نہ پیدا سوال ہوتے

ہماری فطرت کو جانتا ہے تبھی تو دشمن یہ کہہ رہا ہے
ہے دشمنی میں بھی ظرف ایسا جو دوست ہوتے کمال ہوتے

جو آ کے تم حال پوچھ لیتے تو اتنی لمبی نہ عمر لگتی
کہ وصل کی اک گھڑی میں سارے گزر گئے ماہ و سال ہوتے

اے مبارک مقام اونچا مگر حقیقت ہمیں پتا ہے
بناتے رشتوں کی ہم بھی سیڑھی تو آسماں کی مثال ہوتے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل آپ سب کے لیے۔

شب ڈھلی چاند بھی نکلے تو سہی
درد جو دل میں ہے چمکے تو سہی

وہ قیامت ہو ستارہ کہ دل
کچھ نہ کچھ ہجر میں ٹوٹے تو سہی

ہم وہیں پر ہی بسا لیں خود کو
وہ کبھی راہ میں روکے تو سہی

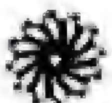
سب سے ہٹ کر ہی منانا ہے اسے
ہم سے اک بار وہ روٹھے تو سہی

دل اسی وقت سنبھل جائے گا
دل کا احوال وہ پوچھے تو سہی

اس کی نفرت بھی محبت ہو گی
میرے بارے میں وہ سوچے تو سہی

اس کے قدموں میں بچھا دوں آنکھیں
ہمارے پاس سے گزرے تو سہی

اس کے سب جھوٹ بھی سچ ہیں محسن
شرط اتنی ہے وہ بولے تو سہی







خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

سمیعہ حنیف منور...... راولپنڈی

ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی حسب عادت "کرن کرن روشنی" سے ابتدا کی۔ ہمارے دین میں اتنی وسعت اور زندگی کے ہر ہر شعبے کے بارے میں مکمل تشریح کی گئی ہے، جو شاید ہی کسی اور دین یا کتاب میں ملے۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ سے ادنیٰ اور بڑے سے بڑے پہلو کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ پھر "ہمارے نام" کو بہت ذوق و شوق سے کھولا مگر دل بری طرح ٹوٹ گیا۔ بہت ماہ گزر گئے نہ تو کوئی خط آپ کی محفل میں جگہ پا سکا نہ ہی کوئی خیالات۔

جی تو مہک کر کر رہا ہے کہ تنزیلہ جی سے انٹرویو کے لیے کوئی سوال بھیجوں مگر دل پہ پتھر رکھ لیا ہے کہ چھپے گا نہیں تو؟......

بہر حال نمرہ جی سے ایک درخواست کرنا ہے کہ وہ جس اچھوتے انداز میں قرآن پاک کی آیات کی تشریح کرتی ہیں، اس کو کبھی وقت نکال کر کتابی شکل میں بھی لائیں۔ یہ کتاب چاہے ہزاروں میں ملے۔ ہم ضرور منگوائیں گے کیونکہ میں نے تفاسیر والی کتب بھی پڑھیں لیکن نمرہ جیسا فلسفہ کہیں نظر نہیں آیا مثلاً" ستمبر کے شمارے میں ہی صفحہ 161 میں حضرت سلیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جو "ہنستے ہنستے مسکرا دیے۔" والے حصے کی خوب صورت ترین تشریح کی گئی ہے۔

تنزیلہ جی آپ کے تو صفحات ہماری آنکھوں سمیت آپ کا رستہ دیکھ رہے ہیں۔ "بن مانگی دعا" کہانی کا ٹیمپو سست ہو رہا ہے۔

آسیہ رزاقی کا "فیصلہ سامنے تھا" منفرد اور پیارا لگا لیکن ہم آسیہ آپی سے زیادہ مزاح کی توقع رکھتے ہیں "قانتہ رابعہ" کی باتیں پڑھ کر رشک آیا اتنی پیاری اور "پڑھاکو" فیملی قسمت والوں کو ملتی ہے دعا ہے سب خوش رہیں (آمین)

"آب حیات" تو ہمارے دماغوں کے لیے آب حیات ہی ہے لیکن ساتھ ساتھ خطرے کی گھنٹی بھی بجاتا ہے کہ دیکھو "دنیا کی سیاست" اللہ ہم سب کو "ان فرعونوں" سے پناہ میں رکھے۔

امثل عزیز کا "شہر آشوب" بے حد دلچسپ اور تجسس والا ہے "پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آرہے ہیں۔

ج: پیاری سمیعہ! اتنی ناراضی! آپ کے خط شامل نہیں ہو سکے معذرت۔ وہ خط شامل اشاعت نہیں ہوتے جو تاخیر سے ملتے ہیں۔ وگرنہ تو ہم آپ کی آرا کے شدت سے منتظر ہوتے ہیں آپ تمام سلسلوں میں شرکت کریں، ہم خیر مقدم کریں گے اور یقین کر لیں، خط شائع ہوں یا نہ ہوں۔ ہم تمام خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔ تنزیلہ کے لیے خط بھجوا دیں۔ وہ ضرور جواب دیں گی۔

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ملائکہ کوثر...... بسم اللہ پور

کتنے ماہ بعد حاضر خدمت ہوں کہیں بھول تو نہیں گئیں اس ناچیز کو۔ پہلے رمضان المبارک کی تیاری پھر رمضان اور میٹھی عید اور اس کے بعد اندرون سندھ کا سفر۔ عروس البلاد کی بھی ایک جھلک دیکھ لی۔ بھاگتے دوڑتے۔ اللہ تعالیٰ اس شہر کے سکون کو قائم رکھے اور اس کی رونقیں بحال رہیں آمین۔ "کہنی سنی" کے پاور فل حروف دل میں

اتارنے کے بعد "کرن کرن روشنی" سے دل وایمان کو تازہ کرتی آگے بڑھتی ہوں۔ تیرے جیسا ہوں سائرہ رضا کا۔ مزاح کا رنگ لیے ہلکا پھلکا سا ناول تھا۔ سائرہ اس طرح ہی لکھتی ہیں۔ شستہ 'رواں رواں۔ "عہد الست" تنزیلہ جی کا خوب صورت ' آؤٹ اسٹینڈنگ ناول۔ حساس اور نازک موضوع 'موضوع پر ان کے قلم کی گرفت بے حد مضبوط' دقیق نگاہ سے دیکھو تو بھی کوئی جھول نہیں' بہت سے انمول جملے جو میری ڈائری میں نوٹ ہیں پھر زبردست سا اینڈ۔ تنزیلہ جی کو بہت بہت مبارکاں۔ آسیہ رزاقی کی تحریروں میں دریا کے پانی جیسی روانی ہوتی ہے پھر نانی' دادی کی خوب صورت باتیں' کہاوتیں کہانی کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ "فیصلہ سامنے تھا" بہت خوب صورت اسٹوری۔ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ طوالت کے باوجود بوریت کا کوئی رنگ نہ تھا اس میں۔ پیاری نمرہ احمد کی انوکھی' نرالی ہماری لاڈلی "نمل" نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے جیسے "اف یہ دال" عائشہ رباب کی اچھی کہانی تھی سادہ مگر سبق آموز۔ نمرہ بخاری کہاں ہیں انہیں ڈھونڈیں۔

ج: ملائکہ! ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہ قارئین جو ہمیں ہر ماہ اتنی دور سے خط لکھتی ہیں' اتنی مشکلوں سے پوسٹ کراتی ہیں۔ اگر وہ کسی ماہ خط نہ لکھیں تو ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔

حنا ارشد فیض..... کراچی

کیوٹ سی انعم فیاض اچھی لگیں۔ کرن کرن روشنی نے اس طرح سے جگمگا کر منور کیا کہ میں جو اکثر اپنے اوپن کچن میں رات میں پائے یا پھر حلیم چڑھا کر دوسرے کام نمٹا لیا کرتی تھی۔ میرے شوہر ہمیشہ کہتے تھے کہ کوئی بچہ پانی پینے کچن میں نہ آجائے۔ تم یہ کام نہ کیا کرو' اصل میں میری دوست کی بچی کڑھی سے جل کر فوت ہوگئی تھی' تب سے میں دن میں طویل وقت والے کھانے پکانے سے ڈر کر رات میں کوکنگ کرتی تھی' اب مجھے اس حدیث کا مفہوم سمجھ میں آگیا کہ تم رات کے وقت بتی بند (چراغ گل) کر دیا کرو۔ اب میں احتیاط کیا کروں گی۔ آپی راشدہ رفعت' بشریٰ احمد کی بہن ہیں؟ قانتہ رابعہ کے پسندیدہ اشعار میں شعر نمبر 3 "اس میں کشیدہ کار ازل سے مراد اگر اللہ تعالیٰ ہے تو بڑا نامناسب سا شعر ہے یہ۔

افسانوں میں "بیلا کا بھائی" اور "حصہ" پسند آئے۔ زندگی "کنارے" میں اتنا جھول اور الجھاؤ نظر آیا کہ بس۔ مجھے تو پیچھے سے دیکھ دیکھ کر سمجھنا پڑا کہ نخبہ ماموں جان کی بیٹی ہے اور حائقہ کس کی بیٹی تھی تایا کی اور عتیق الرحمان کس کا نام تھا۔ یہ غور کرکے پتا چلا۔ اس مرتبہ سب سے بہترین اور لاجواب تحریر تھی فرح بخاری کی "مان" اس تحریر نے میرا مان میرے میاں پر اتنا بڑھا دیا کہ بس۔ ماشاء اللہ میرے میاں بھی مجھے اتنا ہی مان دیتے ہیں انہیں اپنی حنا پر بہت بھروسہ اور اعتماد ہے۔ (آمین)

اب آجائیں اپنے موسٹ فیورٹ ناول "نمل" کی طرف جو کہ رسالے کی جان ہے۔ سعدی اتنا پیارا بچہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے میرا بیٹا جو کہ ابھی سات سال کا ہونے والا ہے وہ سعدی کی طرح ذہین ہو۔

ج: حنا! ہمیں خوشی ہے کہ آپ کا اعتماد بحال کرنے میں خواتین ڈائجسٹ نے آپ کی رہنمائی کی۔ جی ہاں راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد بہنیں ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کہانی لکھ کر بھجوادیں کوما' فل اسٹاپ وغیرہ ہم خود لگالیں گے۔

ڈاکٹر عائشہ جمیل..... لیک سٹی لاہور

اتنے مہینوں سے کوئی خط' کوئی انتخاب نہیں بھیجا۔ سوچا تھا روف کے بعد ہی لکھوں گی اب۔ (ویسے کسی کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی؟)

عہد الست کی تکمیل کے لیے تنزیلہ ریاض کو مبارکباد۔ اس ماہ بہت کمی محسوس ہوئی تھی۔ نمل بہت شان دار ہے اور کہانی جان دار۔ سعدی بہت اچھا ہے مگر اصل ہیرو فارس ہی ہے۔ نمل کا روبرو لازمی کرنا ہے۔ آب حیات پچھلے کچھ ماہ بس سرسری سا ہی پڑھا تھا کہ کہانی کھل جائے تو پڑھوں گی مگر اس قسط میں مزا آگیا۔ پچھلے ماہ ازکی کہہ رہی تھی کہ یہ سالار پھر غلط طرف جارہا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ وہ کچھ غلط نہیں کرے گا۔ میری بات درست نکلی۔ خطوط میں ثناء رحمن نے جن الفاظ میں سائرہ رضا پر تبصرہ کیا۔ میرے دل کی ترجمانی کر دی' مگر میں کبھی بھی اتنے اچھے انداز میں نہ کر پاتی۔ شعاع میں پڑھا کہ "جب ہم ملے" شائع ہوگا اکتوبر میں' سچ بہت خوش ہوئی۔ باجی اسما کہہ رہی تھیں۔ جو بھی ہو بس سائرہ رضا کا ہو تو پڑھنے کا مزا آجاتا ہے۔

"بن مانگی دعا" پڑھ کر اچھا لگتا ہے کیونکہ عفت سحر طاہر

بہت مزے کے جملے لکھتی ہیں۔ یہ ہمیں آخر "رو بحا" سے دوبارہ کب ملوائیں گی؟

راحت جبیں اور فاخرہ جبیں کہاں چلی گئی ہیں آخر اور عالیہ بخاری بھی دیوار شب کے بعد نہیں آئیں۔ ہم آپ کی تحریروں کا انتظار کرتے ہیں۔

فرحت اشتیاق تو ٹی وی کی ہو گئی ہیں۔ ساجدہ حبیب نے لکھنے کا وعدہ کیا ہے پڑھ کر خوشی ہوئی۔

رفعت ناہید سجاد کو بھی کہیں وہ لکھیں۔ چراغ آخر شب ان کا لاجواب ناول تھا۔ عائشہ فیاض بھی اب خطوط نہیں لکھتی ہیں۔ مجھے ان کے خطوط بہت پسند آتے ہیں۔ اور سائرہ رضا کے بھی۔

ایک اور بات ... چراغ آخر شب میں 'فاروق احمد نے ایک شعر پڑھا تھا۔ غالب ندیم دوست سے ... مجھے یہ پورا چاہیے۔

ج : پیاری عائشہ! کسی کا تو ہمیں نہیں پتا مگر ہمیں آپ کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔ اپنی قارئین بہنوں سے ہمارا غائبانہ محبت کا رشتہ ہے۔ تو کمی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تو تشویش بھی ہوتی ہے۔

بھئی! آپ کی تعریف مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ نظموں کے بارے میں کیا کہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ دوبارہ بھجوادیں۔

فاروق احمد نے جو شعر پڑھا تھا۔ وہ یہ ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگی بوئے تراب میں

رفعت مشتاق ... لاہور

آپ کے اخلاق کے تو بہت چرچے ہیں جس نے ہمیں آپ کی محفل میں شرکت کرنے کی آس دلائی ہے۔ خواتین میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ جو میں نے "تقریباً" آٹھویں کلاس سے پڑھنا شروع کیا تھا بس پھر کیا' دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے اپنا خواتین ڈائجسٹ ابھی تک نہیں پڑھنا چھوڑا۔

ج : پیاری رفعت! اخلاق کے بارے میں کیا کہیں البتہ ہماری محبت میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے' ڈائجسٹ سے طویل وابستگی کے بارے میں جان کر دلی خوشی ہوئی۔ آئندہ خط لکھیں تو کہانیوں پر تبصرہ بھی لکھیں۔

نظم کے لیے معذرت چاہتے ہیں ہمارے دیگر مستقل سلسلے بھی تو ہیں آپ ان میں شرکت کر سکتی ہیں۔

ستارہ آمین کومل ... پیر محل

ماہ ستمبر کے خواتین نے میری خوشیوں میں چار چاند لگائے یعنی 6 ستمبر یوم دفاع پاکستان میری سالگرہ کا دن' خواتین' کی آمد بہت شکریہ امی جی! میری خوشیاں دوبالا کرنے کا' پیارا سا سرورق مصروفیات میں بھی افسانے پڑھ ڈالے۔ ویل ڈن پیاری لکھاری سسٹرز اور سمیرا حمید جوگ آس اردو ادب میں نمایاں جگہ بنائے گا سمیرا جیتی رہو اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ "اف یہ دال" ہائے ظالمو! میری پسندیدہ ڈش کی توہین کر دی۔ آسیہ رزاقی ماشاء اللہ جب جب آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ میری موسٹ فیورٹ قلم کار' بلاشبہ مکمل بہت بہترین تحریر ہے۔ شہر آشوب پر تبصرہ تکمیل کے بعد۔ آب حیات کی تو میں سب اقساط جمع کرتی جا رہی ہوں مکمل ہونے کے بعد اکٹھا پڑھنا ہے۔ قانتہ رابعہ' راشدہ رفعت سے ملاقات بہت خوب رہی۔ سلامت رہیں' خامشی کو بیاں ملے میں حرا قریشی سے ملاقات کی۔ واہ یار پتا نہیں کیوں کچھ ادھوری سی لگی۔ عفت سحر طاہر گڈ گرل' بن مانگی دعا بہترین جا رہا ہے۔ اب راحت جبیں' فاخرہ جبیں سے شکوہ کرتے چلیں۔ عزیز خواتین آپ کے ناول کی راہ تک تک کر اکھیاں پتھرا چکی ہیں۔ ساون بھی گزر گیا۔ کوئی رنگیلی سہانی کہانی ہمیں نہ ملی

ج: پیاری کومل! آپ بھی خوش رہیں۔ شمارے پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے ... مگر یہ تو بتائیں کہ آب حیات کی جو اقساط آپ جمع کرتی جا رہی ہیں اکٹھا پڑھنے کے لیے تو آپ کا صبر قابل داد ہے' عمیرہ احمد کا ناول' جلد از جلد پڑھنے کی بے چینی نہیں ہوتی آپ کو؟

راحت جبیں اور فاخرہ جبیں تو ہمیں بالکل بھلا چکی ہیں۔ راحت! فاخرہ! تم ہمیں بے شک بھول جاؤ' ہم نہیں بھول سکتے۔

صوفیہ شاہد ... ننکانہ صاحب

تین سال ہو گئے خواتین ڈائجسٹ کو پڑھتے ہوئے مگر یہ تین سال تو مجھے تیس سال لگتے ہیں۔

اب آتے ہیں مصنفین کی طرف تو جی فرسٹ لیڈی ہیں نمرہ احمد' کیا کمال کا لکھتی ہیں۔ اگر میں انہیں عزت دینا چاہوں تو میں انہیں اکیسویں صدی کا اشفاق احمد ضرور

کھوں گی۔
اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو "تنزیلہ ریاض ' ٹاپ آف دی لسٹ " ہیں اور باقی مصنفین بھی ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں۔ پلیز نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کو جلد از جلد مصنفین کے سروے میں لائیے۔

ج : پیاری صوفیہ! خواتین کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں مگر پیاری لڑکی۔۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے؟

نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کو سروے میں شرکت کی دعوت دے چکے ہیں۔ اب آپ کی فرمائش بھی پہنچا رہے ہیں۔

فوزیہ ثمروٹ 'ام ہانیہ عمران' آمنہ۔۔۔ گجرات

سرفہرست سلسلے کتنی سنی کرن کرن روشنی معلوماتی اور دلچسپ ہوتے ہیں ہر ماہ علم میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

" حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ ' دونوں رائٹرز کے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ نادیہ امین کو بھی ضرور شامل کیجئے گا۔

اس ماہ کے افسانے تقریباً" سارے مزے کے اور سبق آموز تھے۔ "اف یہ دال "خاصا دلچسپ لگا۔

" بیلا کے بھائی " کی چالاکی پہ داد دینا پڑی "فیصلہ سامنے ہی تھا" خوب صورت تحریر ' باادب کردار شافعہ کی فرماں برداری اچھی لگی۔ آسیہ رزاقی کے ہیرو ہیروئن مضبوط

کردار کے تھے۔ شافعہ کا وطن واپسی کا فیصلہ اچھا تھا۔

شہر آشوب اچھا لگا بڑے لگن اور یکسوئی سے شروع کیا۔ مگر باقی آئندہ نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

مان اچھا لگا مگر نمرہ کی بے وقوفی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ جو اپنی دوست کو پوری رقم دے دی۔ چھوٹی چھوٹی بات بھی میکے جا کر سناتی ہیں اور اپنے گھر کا ماحول خراب کرتی ہیں۔

آب حیات عمیرہ احمد کے قلم کو سلام۔ جناب ان کے قلم کی گہرائی ہمارے ناپختہ ذہنوں سے زیادہ ہے۔ اس بار بھی تحریر دلچسپ رہی۔ امامہ کے بیٹے جبریل کی باتیں مزے کی تھیں۔ بڑی خوش خبری ہے 'امامہ کے والد نے اسلام قبول کر لیا۔

مستقل سلسلے اچھے ہوتے ہیں۔ میری بیاض سے زوبار یہ خالد ' سدرہ بتول کی شاعری اچھی لگی۔

تیرے جیسا ہوں سائرہ رضا نے بالکل صحیح لکھا۔ ماہا خود غرض تھی اور وہ ازین کو بھی اپنا جیسا بنانا چاہتی تھی۔ اخت صاحبہ آپ جیسی سوچ کی حامل لڑکیوں کی وجہ سے پاکستان میں بھی اولڈ ہوم کی روایت شروع ہو گئی ہے 'جس گھر کا واحد ایک بیٹا ' بھائی ہو۔ کیا وہ شادی کے بعد سب کو چھوڑ کر بیوی کی غلامی شروع کر دے۔

نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر حیرانگی ہوتی ہے۔ پتا نہیں لوگوں کو آسان طریقے سے جینا کیوں نہیں آتا۔ مسئلہ کوئی بھی نہیں ہوتا اور لوگ مسائل کے پہاڑ اٹھائے پھرتے ہیں۔

دو ماہ سے آپ نے خط شامل نہیں کیا ' پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔

اتنے نخرے دیکھے نہیں جاتے
بھاڑ میں جائے محبت تیری

ج : فوزیہ ! ام ہانیہ اور آمنہ ! پیاری بہنو! اگر آپ جلدی لکھیں تو خط شائع نہ ہونے کی شکایت کبھی نہ ہو اور آپ تو اتنا اچھا تفصیلی تبصرہ کرتی ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم شامل نہ کریں۔ جہاں تک محبت بھاڑ میں جانے کا تعلق ہے تو شاعر صاحب نے بھی غصہ میں کہہ دیا ہے ورنہ محبت کو کون بھاڑ میں ڈال سکتا ہے اور جو بھاڑ میں ڈال دی جائے وہ محبت تو نہیں ہو سکتی۔

نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر کچھ مسائل پر تو واقعی حیرانی نہیں پریشانی ہوتی ہے کہ ذرا سی بات کو مسئلہ بنائے پھرتے ہیں لیکن بعض مسائل واقعی بہت المناک ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔

سدرہ بتول 'ماریہ بتول۔۔۔ ملتان

خط لکھنے کی وجہ صرف " آب حیات "اور " نمل " ہیں حنین ' سعدی ' زمر ' ہاشم ' جواہرات ہر کردار اتنا یونیک اور دلچسپ ہے کہ کسی ایک کو پسند کرنا دوسرے کے ساتھ ناانصافی ہے اور آب حیات میں جب سالار امامہ کو بچوں کی طرح ہینڈل کرتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اور جبریل کی سمجھ داری ' واقعی ہم جو سوچ نہیں سکتے ' وہ رائٹرز ہمارے لیے سوچتے ہیں۔

لیکن مجھے ایک شکایت آپ اگر " آب حیات " اور " نمل " کی پچھلی اقساط کا خلاصہ ختم کر کے نئی اقساط کی جگہ

بڑھادیں تو اچھا ہو گا کیونکہ دو صفحے تو صرف خلاصہ میں نکل جاتے ہیں۔ اور یہ تو آپ سوچیں ہی مت کہ ہم پچھلی قسط بھول جاتے ہیں۔ بھلا یہ کوئی بھولنے والی چیز ہے۔ کسی بھی سروے میں سوال بھیجتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ پتا نہیں شائع ہوں گے کہ نہیں۔

ج : پیاری سدرہ! سروے کے سوالات کے جواب بھیجنے میں ڈر کی کیا بات؟ یہ سلسلہ آپ لوگوں کی شمولیت ہی کے لیے تو شروع کیا ہے۔ جیسے بے دھڑک خط لکھا ہے' اس طرح بے تکلفی سے ان میں بھی شامل ہوں اور ڈرنے کی بھلا کیا بات؟ آپ ہمیں اتنا خوف ناک سمجھتی ہیں۔

خلاصہ اس لیے نہیں دیتے کہ ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ قارئین پچھلی قسط بھول جائیں گی' خلاصہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے آپ پچھلی قسط نہ پڑھ سکی ہوں تو آپ کو اندازہ ہو جائے کہ پچھلی قسط میں کہانی میں کیا ہوا ہے۔

ماہ نور جاناں۔۔۔ میرپور خاص سندھ

میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ میں آپ کی پرانی پڑھنے والی ہوں۔ جب بھی پڑھتی ہوں' لاجواب ہو جاتی ہوں۔ سچ سب رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کسی ایک کی تعریف باقی لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ج : پیاری ماہ نور! خواتین کی محفل میں خوش آمدید! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ حمد کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔

جمیلہ شاہگس۔۔۔ کھگے والا ملتان

خط لکھنے کی وجہ ہیں نمرہ احمد' عمیرہ احمد سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ بہت اہم باتیں بتائیں۔ پہلے آب حیات۔ عمیرہ احمد ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں جو آپ اتنی اچھی کہانی لے کر آئیں۔ یقین کریں اگست کی قسط پڑھ کر میں بہت روئی۔ آخری الفاظ پر "امامہ' جبریل' عنایہ' یہ نعمتیں مجھے اللہ نے دی ہیں۔ کسی انسان سے ان کے لیے بھیک کیوں مانگوں" ہمارا بھی دل ٹھہر گیا اور نمرہ! آپ سے کیا کہوں۔ بہت خوب صورت ناول' نمل' بہت تیزی سے ہاشم کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ سعدی' فارس زمر' حنین' احمر سب کے کردار بہت اچھے ہیں۔ عفت آپ کی کہانی بھی بہت اچھی ہے مجھے تو لائٹ سی کہانی اچھی لگی۔ آخر میں اپنی پیاری رائٹرز کے لیے ایک پیغام' فرحت اشتیاق' راحت جبیں' فاخرہ جبیں' بشریٰ احمد' راشدہ رفعت' نمرہ بخاری' ثروت نذیر کوئی اتنی محبت سے آپ کو یاد کرے تو کبھی جواب دے دیا کریں' ہم سب اتنی شدت سے آپ کو یاد کرتے ہیں۔ ساون برس جاتا ہے' عیدیں گزر جاتی ہیں۔ سالگرہ نمبر گزر جاتے ہیں مگر آپ لوگ نہیں لکھتیں' سب سے زیادہ شکایت مجھے راحت آپ سے ہے۔ سائرہ رضا! آپ نہ بھولنا ہم کو۔ ٹی وی پر جا کر فرحت بہت ٹائم ہو گیا ہے "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کو۔

ج : پیاری جمیلہ! بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے ہمیں اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' اس لیے آپ کی بہت سی ان کہی باتیں بھی ہم نے سمجھ لی ہیں اور ہمیں خط لکھنے کے لیے ہمت کی ضرورت کیوں ہے۔۔۔ بھئی ہم بالکل بھی خوف ناک نہیں ہیں۔ مصنفین تک آپ کی شکایت پہنچا رہے ہیں۔

سیدہ سوہا سجاد۔۔۔ کہروڑ پکا

یوں تو ماشاء اللہ بہترین رسائل ہیں مگر ایک شکایت ہے (معذرت کے ساتھ) کہانیاں ہمیشہ چند ٹاپک پر ہی کیوں ہوتی ہیں؟ مثلاً "لڑکا امیر' لڑکی غریب' گھر والے راضی نہیں۔ اینڈ میں سب ٹھیک یا پھر ظالم سسرال اور مظلوم بہو اور محبت کی شادی۔ بعد میں ناکامی وغیرہ۔ اصل زندگی ان سے مختلف بھی ہوتی ہے جیسے کہ حقیقت میں امیر لڑکا یا لڑکی کے والدین رشتہ اپنے سے کم میں کرتے ہی نہیں اگر کریں تو عزت نہیں ہوتی اور اگر کوئی اپنی ذات سے باہر پسند کرے تو جان سے مار دیا جاتا ہے شادی نہیں کی جاتی۔۔۔۔ یا پھر عزت اور پیار کرنے والے لوگوں کو فتنہ بہو ملتی ہے۔ ہر صورت میں اصل زندگی میں ہمیشہ ہیپی اینڈ نہیں ہوتا۔

ج : سیدہ سوہا! قارئین آپ کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ بھئی ہم آپ کو آپ کی لکھائی سے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہ اشعار' ہماری پیاری سوہا سجاد نے بھیجے ہیں اور آپ کی شکایت بری کیوں لگنے لگی۔ جن حقیقتوں کی آپ نے نشاندہی کی ہے۔ ہم ان ہی حقیقتوں کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے سب اچھا نہیں ہے لیکن یہ ہماری چاہت ہے کہ یوں ہو جائے۔ اور تھوڑی دیر کے

لیے سب اچھا ہونے کے خواب دیکھ لیے جائیں تو کیا حرج ہے۔

مریم اسارف۔۔۔جمبو کلاں

"نمل" بہت زبردست جارہا ہے۔ ویل ڈن نمرہ آپی جی!
"جنت کے پتے" کے بعد اب "نمل" بہت پسند آیا۔
"بن مانگی دعا" بہت اچھا جارہا ہے۔ لیکن عفت آپی آپ نے ارم کو غائب کرکے اچھا نہیں کیا۔ "آب حیات" بھی زبردست جارہا ہے۔ باقی سارا ناولٹ اور افسانے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان آپی بہت سبق آموز کہانیاں لکھتی ہیں۔ میری امی بھی پڑھتی ہیں۔ ہرگز نہیں، وہ تو بس "کرن کرن روشنی" پڑھتی ہیں۔

ج : مریم! ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں، آپ کو بی ایڈ میں داخلہ مل جائے اور خواتین ڈائجسٹ بھی اپنی امی کو کچھ کہانیاں بھی پڑھوائیں۔ پھر وہ پورا رسالہ پڑھیں گی۔

سیما محمد عارف۔۔۔واہ کینٹ

تنزیلہ ریاض کا عہد الست لاجواب اور ہمیشہ یاد رہنے والی تحریر ہے "نمل" بہت زبردست ناول ہے ہر کردار قابل تعریف ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بہن نے تنقید کی تھی کہ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ رائٹر ایکسٹرا معلومات کا امپریشن ڈال رہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس سے ہی تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ورلڈ بینک کے بارے میں معلومات بھی بہت زبردست تھیں۔ پلیز سائرہ رضا کی کہانیوں کو زیادہ سے زیادہ شامل کیا کریں۔ نمرہ احمد، سائرہ رضا، عمیرہ احمد، سمیرا حمید کا بھی انٹرویو کیں۔ یعنی تمام رائٹرز کا انٹرویو ضرور لیں۔

ج : پیاری سیما! خواتین ڈائجسٹ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات پر کہانیاں شائع کی جاتی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے زبان اور اصطلاحات بھی شامل ہوتی ہیں جو کہانی کا لازمی تقاضا ہوتا ہے۔ جہاں تک معلومات کا امپریشن ڈالنے کی بات ہے ہماری رائٹرز خود کو منوا چکی ہیں اور مقبولیت کے اس مقام پر انہیں کوئی امپریشن ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔
سائرہ رضا کا ناولٹ ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہوگا۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔کراچی

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا ٹائٹل دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا، البتہ ستمبر کا شمارہ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ مکمل ناولز، ناولٹ اور افسانے اتنے امپریسو نہیں لگے۔
"آب حیات" کی یہ قسط بھی ہر بار کی طرح سپر تھی، اسپیشلی وہ سین تو سب زیادہ انٹرسٹنگ لگا جب بہت ہی پرتجسس انداز میں سالار نے جیکی کو ریجیکٹ کردیا تو دل کو قرار سا ملا۔ سالار کا اسٹرونگ کریکٹر مسمرائز کردیتا ہے سی آئی اے کے لوگوں نے ہی سالار کو ٹارگٹ کیا ہے اور نیورو سرجن سالار کے برین کا ہی آپریشن کررہا ہے۔ "بن مانگی دعا" بہت ہی تیزی سے اختتام کی جانب رواں دواں ہے آسیہ رزاقی کا ناول "فیصلہ سامنے تھا" کچھ خاص متاثر نہ کرسکا "شہر آشوب" کی پہلی قسط قابل تعریف تھی۔ اجیہ کا معصوم کردار پسند آیا۔ شینا اجیہ کو مس گائیڈ کررہی ہے اور آغا شایان بھی اجیہ کو مس یوز کررہا ہے۔ "نمل" کا ہر ایپی سوڈ پرتجسس اور انٹرسٹنگ ہوتا ہے اب تو فارس کا کردار بھی بہت ہی اسٹرونگ ہوگیا ہے سعدی کے لیے فارس اور زمر کا ایک ساتھ کام کرنا سب سے زیادہ اٹریکٹو لگا۔ "مان" موضوع بہت ہی جاندار اور سبق آموز تھا۔ حقیقت کے قریب تر محسوس ہوا۔
افسانوں میں "بیلا کا بھائی" سب سے زیادہ پسند آیا۔ "جوگ آس" کا اینڈ اداس کرگیا۔ عالی جاہ پر بہت غصہ آیا۔ اس بار "رنگا رنگ پھول" دلچسپی کا مرکز بنا۔ آسیہ فرید کا "مٹی یہ سونے والا شہنشاہ" گڑیا شاہ کا "عام سی لڑکی" ثمینہ کوثر کا "پریشانی" فریحہ شبیر کا "موتی مالا" اور عابدہ نثار کا "جواب" قابل تعریف انتخاب لگا۔

ج : مسرت! پچھلے ماہ آپ کا خط لیٹ ملا اسی وجہ سے شامل نہ ہوسکا۔ اسی لیے دوسرے سلسلوں میں بھی آپ کا نام نہ تھا۔ ستمبر کا شمارہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

حنا احمد۔۔۔کراچی

جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ "نمل" ہے اور اس میں جو کردار ہاشم کا کردار ہے، وہ مجھے بے انتہا پسند ہے مجھے نمرہ احمد سے شکایت ہے کہ شروع سے ہاشم کے کردار کو اتنا بہترین رکھا ہے انہوں نے، پر اب گراتی جارہی

ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس کے کردار کو بگاڑ دیں گی، کیونکہ وہ ہیرو جو نہیں۔ نمرہ سے گزارش ہے کہ جس طرح اسے شیر کی طرح جیتا ہوا دکھایا ہے اسی طرح آگے بھی اس کے کردار سے انصاف کیجئے گا ورنہ اس ناول میں کچھ نہ رہے گا۔

ج : پیاری حنا... !ہاشم کا کردار روایتی ولن کا کردار نہیں ہے۔ وہ ذہین ہے، اپنی فیملی سے محبت کرتا ہے، لیکن اس نے اپنی ذہانت کو منفی انداز میں استعمال کیا۔ دولت کمانے کے لیے جائز اور ناجائز کی تفریق ختم کردی اور اپنی فیملی سے محبت نے اس کو جرم میں حصہ دار بنا دیا۔ اب نمرہ ایسے شخص کو ہیرو تو نہیں بنا سکتیں؟ لیکن ایک اطمینان رکھیں۔ وہ اسے روایتی ولن بھی نہیں بنائیں گی۔

ماہم حمید... میرپور خاص

سب سے پہلے سب کو عید کی مبارک باد۔ سرورق اس بار نہیں بلکہ ہمیشہ کی طرح بے حد خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے آب حیات پڑھا۔ یہ کہانی ایسی ہے کہ مجھے لگتا ہے، اس کی تعریف کے لیے میرے پاس لفظ ہی نہیں ہیں۔ اور یہ قسط پڑھ کر تو اللہ پر میرا یقین اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ کس طرح اللہ نے بچایا امامہ، سالار اور ان کے بچوں کو۔ اس کے بعد نمل کی طرف گئے، نمرہ احمد تو ہیں ہی مس جینئس۔ نمرہ کہانی میں اشعار بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ بالکل سچویشن کے مطابق۔ اس ماہ کا شمارہ اس لیے بھی زیادہ اچھا لگا کیونکہ میری تیسری فیورٹ رائٹر سمیرا حمید کا افسانہ بھی اس ماہ شامل تھا لیکن مجھے سمیرا سے پوچھنا ہے کہ وہ اتنے دکھی افسانے کیوں لکھتی ہیں۔ کہ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ فوزیہ ثمریٹ کو "ہمارے نام" میں نہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی اصل میں ان سے ایک عجیب سی انسیت ہو گئی ہے۔

ج : پیاری ماہم! ہماری جو قارئین باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں، وہ اگر کسی ماہ خط نہ لکھ سکیں تو ہمیں خود بھی بڑی تشویش ہونے لگتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان کا فون نمبر ہمارے پاس نہیں ہوتا کہ ان کی خیریت معلوم کر سکیں۔ فوزیہ ثمریٹ بھی ان ہی میں شامل ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بلاشبہ عہد الست، نمل اور آب حیات بے مثال کہانیاں ہیں۔

اقرا اشتیاق طور... جہلم

سرورق بہت اچھا تھا تازگی کا احساس ہوا۔ فرح بخاری کا مان بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں حصہ سب سے سبقت لے گیا۔ آسیہ رزاقی کا فیصلہ سامنے تھا اچھا تھا۔ "قصہ درخت تلے" پورے رسالے کی جان تھا، جتنا وقت کسی مسئلے کے حل میں لگتا ہے اس وقت میں انسان اس مسئلے کو مسئلہ سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔

ج : پیاری اقراء بہت شکریہ! آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

نازیہ امجد نور... سکھر

گزشتہ دس سالوں سے میں خواتین کی خاموش قاری ہوں دراصل شادی سے پہلے اجازت نہیں تھی اور شادی کے بعد چھوٹی نند بھی چھپ کر پڑھتی تھیں انہوں نے کہانیاں سنائیں تو دلچسپی بڑھتی گئی اور آج صاحب جی کی اجازت سے ہی پڑھتی ہوں۔ جس کہانی نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ ناول ہے نمرہ احمد کا "نمل" بے شک ایک انمول ناول ہے اور نہایت دلچسپ اور قرآن پاک کی جس طرح تفسیر بیان کی گئی ہے بہت ہی خوب صورت ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے بہت ہی کم ٹائم ملتا ہے پڑھنے کا۔ بچے چھوٹے ہیں اور گھر کی تمام ذمہ داریاں جو کہ اللہ تعالیٰ صاف ستھرے طریقے سے یہ خوشی پوری کروا دیتے ہیں۔ الحمد للہ میں شادی کے بعد سے شرعی پردہ کرتی ہوں، یقین کیجیے جب سے شرعی پردہ شروع کیا ہے میں پرسکون ہوں اور اللہ تعالیٰ کو میں ایسے ہی اچھی لگتی ہوں۔

ج۔ پیاری نازیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

روبینہ لیاقت۔ پاک گیٹ ملتان

ہم گزشتہ سات آٹھ سال "خواتین ڈائجسٹ" کے خاموش قاری رہے۔ خاموشی توڑنے کی وجہ بنا نمرہ احمد کا "نمل" ویل ڈن نمرہ جی شکر ہے ہاشم نے سعدی کو مارا نہیں۔ سعدی مجھے اپنے بھائیوں کی طرح لگتا ہے "عہد الست" "آب حیات" بھی اچھا جارہا ہے۔ "آسیہ رزاقی" کے ناول کے کیا کہنے۔ افسانے بھی لاجواب تھے اور آخر

میں اگر میں غلطی پر نہ ہوں تو حیدر مسعود اور ایمن، فرحت اشتیاق کے ناول "میرے ہمدم میرے دوست" کے کردار ہیں۔ زوبار یہ خالد کے سوال کے جواب میں لکھا تھا۔

ج ۔ روبینہ! آپ کا کہنا درست ہے حیدر مسعود اور ایمن میرے ہمدم میرے دوست کے کردار ہیں ۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آسیہ ارم وسیم خان

"میری ڈائری سے "اچھا سلسلہ ہے نیا سلسلہ بھی بہت اچھا ہے رائٹرز کے بارے میں جاننے کی سب کو دلچسپی ہوتی ہے۔ میں بھی آپ کی "خامشی کو بیاں ملے" میں شامل ہونا چاہتی ہوں (کیا طریقہ ہے)

اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ عمیرہ جی کیا بات ہے آپ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ آب حیات بھی آپ کی پچھلی تحریروں کی طرح دل، دماغ کو جھنجوڑ دینے والا ہے۔

"نمل" بڑے زور و شور سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نمرہ احمد کا نام ہی کافی ہے۔ پلیز نمرہ! آپ سعدی کی گمشدگی کو لمبا نہیں کرنا۔ سعدی، زمر اور حسین کی وجہ سے تو اتنے پیارے سین سننے کو ملتے ہیں۔ "عہد الست" میں مجھے زارا والی اسٹوری پسند ہے اور یہ کیا گورکھ دھندا ہے ایک قسط میں ہم نور محمد کی ایسی بے رحمانہ موت پر ٹپ ٹپ آنسو بہار رہے ہوتے ہیں تو اگلی میں وہ زندہ ملتا ہے وہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

ج ۔ پیاری آسیہ! تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر آپ کا خط شامل نہ ہو سکا خامشی کو بیاں ملنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے۔ جس طرح یہ خط لکھ کر پوسٹ کیا ہے اسی طرح لکھ کر پوسٹ کر دیں۔

ناہید نور الٰہی

کرن کرن روشنی سے مستفید ہونے کے بعد آب حیات کی طرف دوڑ لگائی عمیرہ جی مبارک باد کی مستحق ہیں کہ اتنی اچھی تحریر پڑھنے کو مل رہی ہے اس کے بعد "بن مانگی دعا" پڑھا۔ ثانیہ اور عدن کی نوک جھونک میں مزا آتا ہے۔ نازلی نصر سے ملاقات اچھی لگی اگر ہو سکے تو ہما حمید سے ملاقات کروائیں۔ باقی مستقل سلسلے ہر ماہ کی طرح بہترین ہوتے ہیں۔

ج ۔ ناہید! آپ کی صحت کے لیے دعاگو ہیں۔ شوگر کی بیماری میں اگر احتیاط کی جائے تو یہ مہلک نہیں ہوتی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ نے اپنا فون نمبر لکھا ہے ہم فون کر کے آپ کو آپ کے افسانے کے متعلق بتا دیں گے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



سلیوٹ

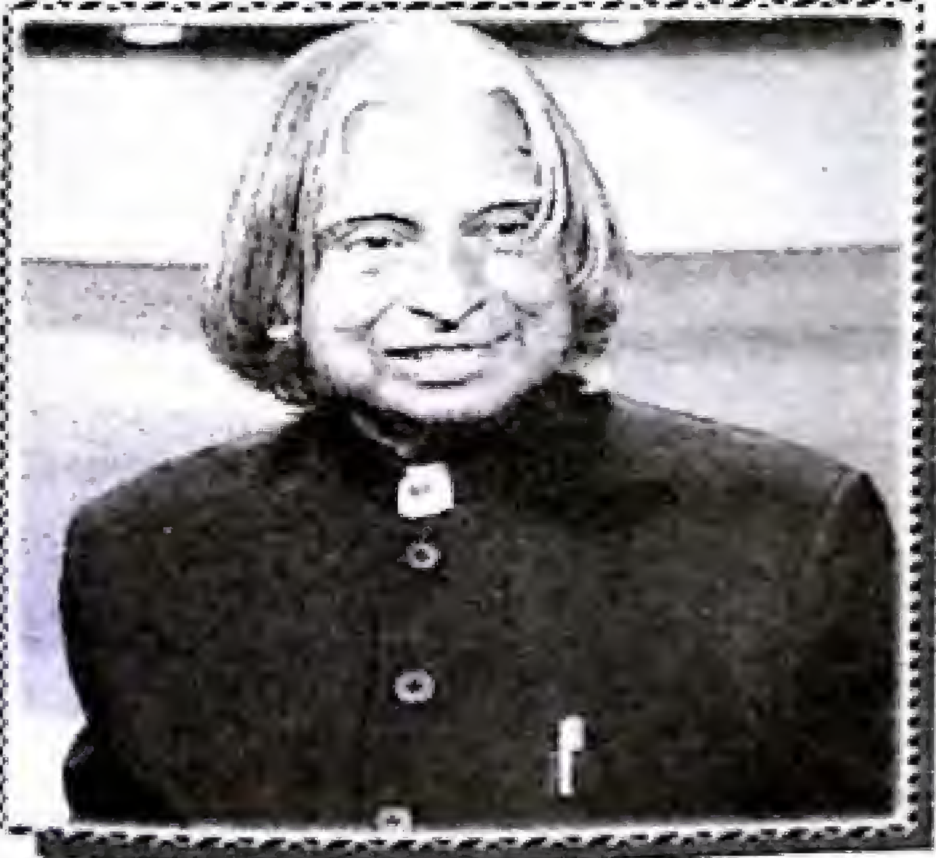
ایم ایم عالم صاحب نے 7 ستمبر 1965 کو پچاس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پانچ بھارتی ہنٹر طیاروں کو گرا کر ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جو رہتی دنیا تک برقرار رہے گا شاید ہی کوئی مستقبل میں اس ریکارڈ کو توڑ پائے۔

ایس انجم آصف لکھتے ہیں کہ "ایک ملاقات میں' میں نے ایم ایم عالم صاحب سے پوچھا کہ کیا پاکستان اور بھارت کی دوستی ممکن ہے؟ عالم صاحب نے کچھ دیر مجھے دیکھا' پھر مسکرائے اور بولے جس طرح نیولے اور سانپ میں دوستی ممکن نہیں ہے اسی طرح پاکستان اور بھارت کی دوستی ممکن نہیں اور اگر کوئی یہ سوچتا ہے تو زبردست غلطی پر ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان کی دوستی ممکن ہوتی یعنی ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہ سکتے تو پھر پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی' مسلمان لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر پاکستان ہجرت کیوں کرتے۔" (کاش یہ بات سمجھ میں آجائے)

ایم ایم عالم صاحب ایک سچے اور محب وطن پاکستانی تھے۔ 1971 میں جب بنگلہ دیش وجود میں آیا تو اس وقت کی بنگلہ دیشی حکومت نے ایم ایم عالم صاحب کو یہ پیشکش کی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر بنگلہ دیش چلے آئیں اور بنگلہ دیشی فضائیہ کے سربراہ کا عہدہ سنبھالیں۔ ایم ایم عالم صاحب نے یہ پیشکش یہ کہہ کر مسترد کردی کہ بنگلہ دیشی فضائیہ کا سربراہ بننے سے بہتر ہے کہ میں پاکستانی فضائیہ سے ایک ائرمین کے طور پر وابستہ رہوں جو میرے لیے زیادہ فخر کی بات ہے (کیا آج ہم میں یہ جذبہ حب الوطنی ہے۔؟)

جلی ہوئی روٹی

بچپن کی باتیں انسان پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ بعض اوقات اس کا پورا مزاج بنادیتی ہیں۔ بھارت کے مرحوم صدر عبدالکلام چوراسی سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی میں جہاں بھی رہے' جس عہدے پر بھی رہے۔ انہوں نے کبھی کھانے میں نقص نہیں نکالا۔ جو ملا خاموشی سے کھالیا۔ اس کے پیچھے ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ جب وہ چھوٹے تھے اور ان کا خاندان کافی بڑا تھا'





سارے گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ روٹی پکانے کی ذمہ داری بھی ان کی ماں کی ہی تھی۔ ایک دن وہ روٹی پکا رہی تھیں کہ ایک روٹی جل گئی' ماں نے وہ روٹی اپنے لیے رکھ لی' تو ان کے باپ نے یہ روٹی اپنی بیوی سے مانگی' انہوں نے منع کیا کہ وہ ان کے لیے دوسری روٹی پکا رہی ہیں۔ لیکن شوہر نے زبردستی یہ کہہ کر کہ مجھے جلی ہوئی روٹی پسند ہے وہ روٹی لے لی۔ جب سب کھانا وغیرہ کھا کر اپنے اپنے بستروں پر سونے چلے گئے تو عبدالکلام نے اپنے باپ کے پاس جاکر چپکے سے یہ پوچھا کہ "کیا واقعی آپ کو جلی ہوئی روٹی پسند ہے؟" والد نے مسکرا کر کہا کہ "بیٹا جلی ہوئی روٹی کس کو پسند ہوسکتی ہے؟" عبدالکلام نے اپنے والد سے کہا کہ "پھر آپ نے ماں سے جھوٹ کیوں بولا۔" اس پر والد نے مسکرا کر بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ "بیٹا تمہاری ماں سارا دن کام کرتی ہے۔ ہمیں اچھا کھانا پکا کر کھلاتی ہے ہمیں نے اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی سینکڑوں روٹیاں کھائی ہیں' ایک دن اگر جلی ہوئی روٹی کھالی تو کیا ہوا؟ یہ روٹی اگر میں نہ کھاتا تو تمہاری ماں کھاتی اور یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ عبدالکلام اپنے والد کی یہ بات کبھی فراموش نہ کرسکے۔ (کاش! مردانگی کے زعم میں مبتلا کھانا اٹھا کر پھینکنے والے مرد اس واقعے سے سبق سیکھیں)۔

راز

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ووٹنگ کے وقت انگوٹھے پر لگائی جانے والی سیاہی انہوں نے 1946 میں ایجاد کی۔ حکیم اجمل کے ایک نسخے پر ریسرچ کرکے انہوں نے اجملین کے نام سے بلڈ پریشر کی ایک دوا بنائی جو اس وقت دنیا بھر میں استعمال ہو رہی ہے۔ سائنس کے علاوہ سلیم الزماں صدیقی کا حوالہ طویل العمری بھی تھا۔ انہوں نے

ستانوے سال کی عمر پائی اور آخری سانس تک کام کرتے رہے' وہ مشروب مغرب کے رسیا ہونے کے ساتھ ساتھ چین اسموکر بھی تھے' ایک سگریٹ ختم ہونے سے پہلے دوسرا جلالیا کرتے تھے۔

ان کے شاگرد ڈاکٹر مشتاق اسماعیل (جو خود بھی سائنس دان ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے) نے جب ان کی طویل العمری اور صحت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے ہنس کر کہا۔ "میری طویل العمری کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتا۔"

انار ایک نعمت

جدید تحقیق کے مطابق انار کا جوس ہمیں دل کے دورے سے محفوظ رکھتا ہے۔ کیلی فورنیا میں واقع ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے سائنس دانوں نے مردوں اور خواتین پر مشتمل ایک گروپ کو' جن کے دل تک خون کا بہاؤ کم تھا' روزانہ ایک گلاس انار کے جوس کا پلایا گیا' (جن کے دل تک خون کا بہاؤ کم ہوتا ہے ان میں کچھ عرصے بعد دل کے دورے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے) تین ماہ بعد ان کے دل تک خون کا بہاؤ اوسطاً "سترہ فیصد بہتر ہوچکا تھا۔ اس ریسرچ کے مطابق اس میں اہم ترین کردار انار میں شامل ان اینٹی آکسیڈنٹس اجزا نے ادا

کیا تھا جو شریانوں کی صفائی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں اس لیے اللہ کی دی ہوئی نعمت انار کا استعمال کریں۔

صحیح کا فیصلہ

صوفیہ لورین کارلو پونٹی سے اپنی شادی سے متعلق کہتی ہیں کہ "میں اور کارلو لندن جانے کے لیے جہاز میں بیٹھے تو باتوں کے دوران میں نے کارلو کو بتایا کہ "کل مجھے کیری (کیری گرانٹ) نے زرد پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے' زرد رنگ حسد اور رقابت کی علامت تو نہیں ہوتا؟" میں نے کارلو سے یہ بات انتہائی معصومیت سے کی تھی (واہ صوفیہ جی! کیا معصومیت ہے آپ کی۔ کہ۔۔؟) لیکن کارلو یہ بات

برداشت نہ کر سکا اور اس نے بے ساختہ میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ سب کے سامنے تھپڑ کھا کر شرم سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ میری عمر اس وقت تیئس سال تھی۔ اس عمر میں انسان زیادہ تر فیصلے عقل کے بجائے دل سے کرتا ہے۔ لیکن اس وقت میں نے دل کے بجائے دماغ سے سوچا اور اس معاملے کو بالکل ہی مختلف زاویے سے دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا کہ کارلو اتنے عرصے سے میرے اور کیری کے بارے میں سن رہا ہے مگر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا لیکن دراصل اس کے دل میں رد عمل جمع ہو رہا تھا اور آج برداشت سے باہر ہو گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور حسد و رقابت کے جذبے اس کے دل میں موجود تھے۔"

صوفیہ کہتی ہیں کہ بہر حال مجھے آج تک اس بات کی خوشی ہے کہ نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے باوجود میں نے اس وقت ایک درست فیصلہ کیا۔ ہماری شادی بہت کامیاب رہی اور ہم نے ایک مطمئن و مسرور زندگی گزاری۔

رخسانہ نگار عدنان کا ایک اور اعزاز

رخسانہ نگار عدنان کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے نثر کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ افسانہ ہو یا ناول' ناولٹ ہوں یا سلسلہ وار ناول' رخسانہ نے جو بھی لکھا' قارئین نے پذیرائی کی' ٹی وی پر اس وقت ان کے چار سیریل آرہے ہیں۔

6 ستمبر 2015ء کو بی بی سی اسٹیشن نیٹ ورک پر ان کا لائیو انٹرویو آیا جو ایک بڑی کامیابی سمجھا گیا۔ انٹرویو لاہور میں بی بی سی کے اسٹوڈیو سے لائیو لندن بوقت شام چھ بجے سنا گیا۔ انٹرویو' خوب صورت آواز کی مالک صائمہ اجرم نے لیا۔ انٹرویو نصف گھنٹے کا تھا اور زیادہ تر سوال رخسانہ کے رائٹنگ کیریئر سے متعلق تھے۔ ان کے آن ایر ڈرامے "میرے درد کی تجھے کیا خبر' تیرے در پر" اور "پارس" کے بارے میں بات ہوئی۔

انٹرویو میں پوچھا گیا کہ وہ کس طرح اتنا زیادہ اور اتنا اچھا لکھ لیتی ہیں۔ جبکہ لکھنا ایک بہت مشکل کام ہے' پھر ایک تحریر جو نثر کی شکل میں آتی ہے' آن ایئر آنے کے بعد اس کے کرداروں اور کہانی سے آپ کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے اور آپ اپنی کہانیوں میں خود کہاں کہاں انوالو ہوتی ہیں۔ رخسانہ کے آنے والے سیریل "ایک تھی مثال" پہ بھی بات کی گئی "محبت' خواب سفر" کی میڈیم یاقوت پر بھی 'زندگی اک روشنی" کے صوفی صاحب پر اور "خوشبو کے گھر" پر بھی۔ آخر میں رخسانہ سے پوچھا گیا کہ وہ سوشل میڈیا پر اتنی ایکٹیو کیوں نہیں ہیں' جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ سوشل میڈیا کی دنیا فیک لگتی ہے۔ اس میں خود پسندی بہت زیادہ ہے۔ آخر میں میسج دیتے ہوئے رخسانہ نے لڑکیوں کی تعلیم پر' ان کو کوئی ہنر سکھانے پر زور دیا۔ یہ انٹرویو گوگل پر بی بی سی ایشین نیٹ ورک پر رخسانہ نگار کے نام سے سرچ کیا جا سکتا ہے۔ رائٹرز میں یہ انٹرویو پاکستان میں پہلے خلیل الرحمٰن قمر سے کیا گیا ہے اور

خواتین میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی مصنفہ رخسانہ نگار پہلی خاتون ہیں جن سے یہ انٹرویو لیا گیا ہے۔
(مبارکباں رخسانہ جی)

ادھر ادھر سے

☆ میری رائے میں وہ لوگ عظیم ہیں جنہوں نے زندگی میں کسی نظریے کو اپنایا اور صداقت پر مبنی کسی موقف پر ڈٹے رہے' انہوں نے ٹی وی پر آکر یہ نہیں کہا کہ میرا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں، اس بیان کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں یہ ہمت ہی نہیں ہوئی کہ زندگی میں کوئی نظریہ اپنا سکیں۔ ایک جیتے جاگتے عاقل و بالغ شخص کی بہرحال کوئی نہ کوئی رائے ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو خود کو سیاست سے الگ رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اس بھینس جیسی ہے جو دن بھر بیٹھی جگالی کرتی رہتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زندگی میں خود کوئی موقف اپنانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

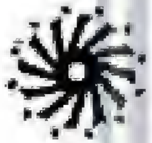
(یاسر پیرزادہ۔ ذرا ہٹ کے)

☆ ڈاکٹر ضیاء الدین اور ڈاکٹر اعجاز فاطمہ سے ڈاکٹر عاصم کی زندگی کے پہلے حصے تک اور پھر ڈاکٹر عاصم سے لے کر مشیر ڈاکٹر عاصم تک کا سفر دیکھیں تو تاسف اور افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ تمام عزت جو ڈاکٹر ضیاء الدین سے یہاں تک کمائی تھی۔ وہ چند بینک اکاؤنٹس' چند ایکٹر زمین اور سائرن بجاتی چند گاڑیوں کے نیچے کچلی گئی ہمیں نے زندگی میں اکثر لوگوں کی صدیوں کی عزت کاغذ کے چند ٹکڑوں کے ہاتھوں پرزے پرزے ہوتے دیکھی اور ڈاکٹر عاصم اس کی بدترین مثال ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا نواسا اور ڈاکٹر اعجاز فاطمہ کا بیٹا دولت کے ہاتھوں خرچ ہو گیا۔

(جاوید چوہدری۔ زیرو پوائنٹ)

☆ بلدیہ فیکٹری کے حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دوسرے دن کے اخبارات میں ایک خبر یہ بھی شائع ہوئی تھی کہ جس وقت فیکٹری میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک ٹینکر والے نے دیکھا تو اس نے کہا کہ میں اپنا ٹینکر فیکٹری کی دیوار پر مارتا ہوں تاکہ یہ دیوار ٹوٹے تو جو لوگ اندر چلا رہے ہیں ان میں سے کچھ تو بچ سکتے ہیں۔ لیکن وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس ڈرائیور کو ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا؟ اس کی تحقیقات بھی ہونی چاہیے۔

(جاوید احمد خان۔ سیدھی بات)



سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کے والد فیاض احمد شاہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم نہایت سادہ مزاج' کم گو اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی دائمی جدائی سدرۃ المنتہیٰ اور دیگر اہل خانہ کے لیے بہت گہرا اور بڑا صدمہ ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔
اللہ تعالیٰ مرحوم فیاض احمد شاہ کی مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں اعلا درجات سے نوازے اور سدرۃ المنتہیٰ اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

حمیرا عروش

[انسان کی اولین ضرورت کھانا ہے۔ ذائقہ دار کھانا جہاں صحت بخشتا ہے وہیں لذت سے ہم کنار کر کے خوشی کے احساس کو جنم دیتا ہے۔
عموماً" لڑکیاں نت نئی ڈشز بنانے کی شوقین ہوتی ہیں۔ مجھے بھی ذائقہ دار کھانے تیار کر کے داد وصول کرنے کا شوق ہے۔ میں تجربہ کار خاتون نہیں مگر بفضل خدا میرے ہاتھ میں ایک خاص ذائقہ ہے۔

س ۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسند ناپسند' غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

ج ۔ کھانا پکاتے وقت تمام باتوں کو مد نظر رکھتی ہوں۔ ابو کی صحت کا خاص خیال کرتی ہوں۔ عموماً" کھانا بھی ابو کی پسند پوچھ کر ہی تیار کرتی ہوں۔ دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے اگر پوری توجہ کے ساتھ کھانا تیار کیا جائے۔ پورے آداب کے ساتھ سر ڈھانپ کر اور تسبیح پڑھ کر تو کھانے میں غذائیت اور برکت شامل ہو جاتی ہے۔

س ۔ کھانے کا وقت ہے' گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔

ج ۔ ویسے ہمارے گھر اس طرح مہمان آتے نہیں۔ اگر آبھی جائیں تو خیر ہے کیونکہ میں کھانا ہر وقت تیار رکھتی ہوں۔ بہر کیف بھنی ہوئی کلیجی فوری تیار کی جا سکتی ہے۔ ترکیب ملاحظہ کریں۔

کلیجی

ضروری اجزا :

کلیجی	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
ادرک 'لہسن	دو عدد
سرخ مرچ پسی ہوئی	ایک چمچہ
ہلدی	آدھا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	چھ عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی باریک کاٹ لیں

ترکیب :

سب سے پہلے پیاز کو باریک کاٹ کر تیل میں سنہری کرلیں۔ پھر اس میں ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں اور ساتھ ہی ادرک' لہسن کا پیسٹ اور ہری مرچیں پیس کر شامل کرلیں۔ تھوڑا سا پانی ڈال کر ہلدی' نمک' اور سرخ مرچ بھی ڈال دیں۔ ہلکی آنچ رکھیں جب تک مسالا بھننے لگے' اس دوران آپ کلیجی کو اچھی طرح دھو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرلیں۔ جب تیل اوپر آجائے اور رنگت سرخ ہو جائے تو اس میں کلیجی کو بھی شامل کرلیں۔ شوربا کرنا مقصود ہو تو پانی ڈال دیں۔ اگر نہیں تو آدھا گلاس پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر رکھ دیں اور ساتھ ہی کٹا ہوا ہرا دھنیا دھو کر اس کے اوپر چھڑک دیں۔ ڈھکن بند کر کے رکھ دیں۔ دس منٹ بعد کھول کر دیکھیں۔ ڈش تیار ملے گی۔ ڈونگے میں نکال کر سلیقے سے پیش کریں۔

س ۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج ۔ صفائی کو نصف ایمان کا درجہ حاصل ہے لہٰذا یہ زندگی کا لازمی جز ہے۔ کچن کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہوں۔ ذرا سی لاپروائی مکھیوں کو دعوت دے جاتی

ہے اور طبیعاں جراثیموں کا گھر' سو کام نمٹاتے وقت صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتی ہوں اور تفصیلی صفائی بھی کرتی رہتی ہوں۔

س ۔ صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی ڈش کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج ۔ اکثریت کی طرح ہمارے ہاں بھی چائے پراٹھا اور سالن لازمی موجود ہوتا ہے۔ بیکری کی اشیاء بھی منگوالی جاتی ہیں۔ کسٹرڈ بہت اچھا بناتی ہوں (بقول بھائی) سو اس کی ترکیب ملاحظہ کریں۔

کیک کسٹرڈ

ضروری اجزا :

دودھ	1کلو
کسٹرڈ پیکٹ	چار چمچے
چینی	حسب ذائقہ
چھوٹی الائچی	2عدد
پسا ہوا کھوپرا	2چمچ
باریک کٹے ہوئے بادام	5عدد
جیلی	اگر دل چاہے تو
چھوٹا کیک	1عدد

ترکیب :

دودھ کو گرم کرنے رکھ دیں۔ تھوڑے سے پانی میں کسٹرڈ پاؤڈر مکس کرلیں۔ ابلتے ہوئے دودھ میں چینی اور پانی میں حل شدہ کسٹرڈ پاؤڈر ڈال دیں۔ دو منٹ تک چمچہ ہلاتی رہیں۔ کیک کے پتلے سلائس کاٹ لیں' ان کو ڈش میں رکھیں' گاڑھا ہوجانے پر کسٹرڈ ڈش میں ڈال دیں کیک' جیلی' بادام اور کھوپرا سجاوٹ کے لیے ڈال دیں۔ ٹھنڈا کرنے کے لیے ممکن ہو تو فریج میں رکھ دیں ورنہ کسی ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں اور ٹھنڈا ہوجانے پر سرو کریں۔

س ۔ آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج ۔ ہمارے ہاں باہر کھانا کھانے کا رواج نہیں یعنی ہوٹلنگ پسند نہیں کی جاتی البتہ اگر میں بیمار ہوں یا پڑھائی میں مصروف ہوں یا کسی اور وجہ سے کھانا تیار نہ کرپاؤں تو باہر سے منگوالیا جاتا ہے۔ گھر میں میرے علاوہ تمام مرد حضرات ہیں اس لیے مسئلہ ہوجاتا ہے۔

س ۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج ۔ کھانا بناتے وقت ڈش کا انتخاب موسم کو مدنظر رکھ کر نہیں کرتے بلکہ موسم کو دیکھ کر ڈش کا انتخاب کرتے ہیں۔ اگر موسم سہانا تو پھر پکوڑے وغیرہ چل جاتے ہیں۔ ویسے پکوڑے بنانے اور کھانے کے لیے موسم کی کوئی قید و بند نہیں۔

س ۔ اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج ۔ اچھا کھانا بنانے کے لیے بھرپور توجہ' حاضر دماغی اور چستی ہونا لازمی ہے۔ اچھا کھانا بنانے کی نیت بھی کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

س ۔ کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں۔

ج ۔ کچن میں اگر کاکروچ آجائیں تو انہیں بھگانے کے لیے تھیلی کے اندر سرف ڈال کر رکھ دیں' تھیلی کا منہ کھلا رہے۔ کچھ دن بعد تمام کاکروچ تھیلی کے اندر آرام فرماتے نظر آئیں گے۔

2 ۔ بعض اوقات گوشت بدبو چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے گوشت کو گلاتے ہوئے اگر تھوڑا سا میٹھا سوڈا بھی شامل کرلیا جائے تو بدبو دور ہوجائے گی اور گوشت ٹھیک رہے گا۔ مگر احتیاط کی جائے کہ گوشت کو خراب ہی نہ کیا جائے۔

اپنا اور خود سے وابستہ ہر چاہت بھرے رشتے کا خیال رکھیے گا اور ایک چھوٹے سے نام ''حمیرا عروش'' کو بھی شامل دعا رکھیے گا۔ فی امان اللہ

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

حلیم

ضروری اشیا :

گیہوں	آدھا کلو
گوشت	ایک کلو
چنے کی دال	ایک پیالی
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ (پسی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
میٹھا سوڈا	چوتھائی چائے کا چمچہ
گھی / تیل	ایک پیالی
پیاز	تین عدد
(باریک کاٹ لیں)	
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

حلیم کا بگھار

سفید زیرہ' پیاز' گھی تیل

ترکیب :

سب سے پہلے ایک دیگچی میں گوشت' گھی اور مسالے ڈال کر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ گیہوں کوٹ کر ڈیڑھ گھنٹے کے لیے بھگو دیں' پھر انہیں ایک الگ دیگچی میں بہت سا پانی ڈال کر ابلنے رکھ دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چمچ چلاتے رہیں۔ جب گیہوں میں لیس آنا شروع ہو جائے تو میٹھا سوڈا ڈال دیں۔ اس سے گیہوں اندر تک گل جائیں گے۔ جب گیہوں اچھی طرح گل جائیں تو گوشت (گائے بکرا یا چکن) میں ملا دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ چنے کی دال کو ابال کر پیس لیں اور پسی ہوئی دال میں دو پیالی پانی ڈال کر گوشت میں ملا دیں اور اچھی طرح سے چلا کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں اور اوپر سے گرم مسالا' ہرا مسالا اور کٹی ہوئی ادرک بھی ڈال دیں۔ حلیم جتنی دیر پکے گا اتنا ہی مزے دار ہو گا۔ حلیم پر پیاز اور زیرے کا بھگار دیں۔

پیاز کو الگ سے تل کر اسے اخبار پر پھیلا کر رکھ دیں تاکہ وہ کرکری ہو جائے پھر لیموں' ادرک' ہرا دھنیا' پودینہ' ہری مرچ اور گرم مسالا ڈال کر نوش فرمائیں۔

پائے

ضروری اشیا :

پائے مٹن	چار عدد
لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
دار چینی کے ٹکڑے	دو سے تین عدد
تیل	دو کپ
دہی	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
دھنیا پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

پیاز کاٹ کر تیل میں گولڈن فرائی کر کے نکال لیں اور دہی کے ساتھ پیس لیں۔ اسی تیل میں باقی کے مسالے اور پائے ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر اس میں پسا ہوا آمیزہ ڈال کر مزید بھونیں' پتیلے میں اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت اچھی طرح پانی میں ڈوب جائے پھر دھیمی آنچ پر رکھ کر پکائیں۔ جب گوشت گل جائے اور شوربہ بن جائے تو پیاز سے بگھار کر ہری مرچ' ہرا دھنیا' ادرک' لیموں ڈال کر گرم گرم

نان کے ساتھ پیش کریں۔

کھوپرے کی مٹھائی

ضروری اشیا :

کھوپرا (پسا ہوا)	ایک پیالی
دودھ	ایک پیالی
خشک دودھ	ایک پیالی
انڈا	ایک عدد
چینی	حسب ذائقہ
گھی	ایک پیالی
ونیلا ایسنس	چند قطرے
اخروٹ، بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

ایک پیالی میں انڈا پھینٹیں۔ جب پیالی جھاگ سے بھر جائے تو اس میں چینی شامل کردیں اور مزید پھینٹیں۔ گھی کو پگھلا کر ٹھنڈا کر کے اس میں پسا ہوا کھوپرا، چینی، خشک دودھ اور تازہ دودھ شامل کر کے لکڑی کی ڈوئی سے تمام اشیا کو یک جان کرلیں پھر اس میں انڈے اور چینی والا آمیزہ بھی شامل کرلیں، جب اچھی طرح یک جان ہو جائے تو اس کو دھیمی آنچ پر چولہے پر چڑھادیں۔ وقفے وقفے سے چمچہ چلاتے رہیں، جب آمیزہ خشک ہونے لگے تو اس کو بھون لیں۔ اسٹیل کی ٹرے یا ہموار ڈھکن پر گھی لگائیں اور اس پر بھنا ہوا آمیزہ انڈیل دیں۔ بیلن کی مدد سے ہموار کریں اور چھری سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ بادام اور اخروٹ سے سجا کے پیش کریں۔

شاہی قیمہ کڑاہی

ضروری اشیاء :

قیمہ (موٹا پسا ہوا)	ایک کلو
ٹماٹر	آدھا کلو (کاٹ لیں)
تیل	آدھا کپ
پیاز	دو عدد (بڑی باریک کاٹ لیں)
لہسن (پسا ہوا)	ایک کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
زیرہ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ (بڑی) (تین ٹکڑے کرلیں)	پانچ عدد
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
ادرک (لمبائی میں کٹی ہوئی)	تین کھانے کے چمچے

ترکیب :

قیمہ میں دہی، لہسن، دھنیا پاؤڈر، لال مرچ، ہلدی ملا کر مکس کر کے آدھا گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کرلیں اس میں قیمہ ڈال کر بھونیں اور پانچ منٹ کے بعد اس میں ٹماٹر ڈال کر مکس کر کے دھیمی آنچ پر پکائیں کہ قیمہ ٹماٹر کے پانی میں گل جائے اور ٹماٹر بھی گل جائیں۔

اچھی طرح بھون کر اس میں گرم مسالا پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، ہری مرچ ڈال کر دم پر دس منٹ رکھ دیں۔ ہرا دھنیا اور ادرک سے گارنش کر کے چپاتیوں یا سادہ چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔



عدنان

نفسیاتی اُلجھنیں ذہنی اُلجھنیں

موم۔ راولپنڈی

میرے سر میں شدید ترین درد رہتا ہے۔ تقریباً" ہر وقت ہی۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے ادھر سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈپریشن ہے۔ میڈیسن بھی دیں۔ وہ میں نے دو ماہ استعمال کیں، کافی عرصہ فرق محسوس ہوا۔ سر درد ختم نہیں ہوا اور نیند تو بالکل تھی ہی نہیں نا۔ پھر ان دواؤں سے نیند آنا شروع ہوگئی۔ جو کہ اب چھوڑنے کے بعد تقریباً" رات بارہ سے صبح کے چار بجے تک ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ ڈپریشن نام کی بیماری مجھے کب سے شروع ہوئی مگر سوچیں اور ہر وقت ذہنی کرب میں رہنا تو جیسے میرے پیدا ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔

میری دو سوتیلی بہنیں ہیں۔ میرے ابو کی پہلی شادی سے ہمارے ہاں (گاؤں میں) حالات اچھے نہیں تھے اور ابھی بھی نہیں ہیں۔ ایک کمانے والا شخص اور بارہ کھانے والے۔ آٹھویں تک گاؤں میں سرکاری اسکول ہے، پھر آگے پرائیویٹ پڑھائی ہے۔ سب سے بڑی بہن نے اپنی مرضی سے پانچویں تک پڑھ کے چھوڑ دیا۔ اور جو دوسرے نمبر والی بہن ہے۔ اس نے ضد میں چھوڑا۔ حالانکہ مڈل کے بعد ابو نے بے شک انکار کے بعد پھر پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ (مسئلہ صرف یہ تھا کہ لڑکوں والا اسکول ہے) اس کے بعد باری آئی میری۔ مجھے مڈل کے بعد جب ابو نے کہا کہ بس اب آگے نہیں پڑھنا ہے۔ گھر میں ہی رہو تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں بہت روئی پھر میرے ماموں نے مجھے آگے داخل کروا دیا۔ اب جھگڑا شروع، ایک محاذ کھل گیا کہ میری بہن کہتی میں نے لڑکوں کے اسکول نہیں پڑھا تو یہ کیوں پڑھے۔ وغیرہ وغیرہ بہت باتیں کیں انہوں نے۔ دسویں تک ماموں فیس وغیرہ دیتے رہے۔ وہ بھی کتنی تھی تین سو روپے۔ باقی سال کے شروع میں کتابیں وغیرہ لے دیں۔

بہنیں بہت منفی خیالات کی مالک تھیں اور اگر میں اپنی ذہنی حالت کی ذمے دار انہیں کہوں تو سو فیصد درست بات ہوگی۔ وہ مجھے مغرور کہتیں اب بھلا میں کس بات پر مغرور ہوتی۔ میں انہیں پلٹ کر جواب نہ دیتی۔ میں کون سا کسی کالج یا ہائی فائی اسکول میں پڑھ رہی تھی، دسویں کے بعد حالات کو دیکھتے ہیں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیچنگ شروع کر دی۔ صبح سات سے ڈیڑھ بجے تک اس کے بعد دوسری کلاسیں ہوتی تھیں، جب میں خود پڑھتی تھی ~~...~~ اجیسے میں نے پڑھا ہے۔ مجھے ہی پتا ہے۔ نہ جانے پاس کیسے ہوتی رہی۔ شاید اللہ کی مدد ساتھ رہی۔ پھر اسی اسکول میں میرے بھائی اور بہن زیر تعلیم رہے، وقت کے ساتھ فیسوں میں بھی اضافہ ہوا۔ میری تنخواہ پندرہ سو تھی، جس میں سے چار سو میری فیس، تین سو میرے ایک بھائی کی اور تین سو دوسری بہن کی۔ باقی رہے پانچ سو روپے تو اسکول کے مالک لاپروا سے تھے کہ بیٹا ابھی بقایا دیتا ہوں۔ کبھی دے دیتے اور کبھی نہیں۔ خیر اسی طرح میں نے بی اے سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا 2014ء میں۔ اب میں ایم اے پارٹ ون کے پیپر دے چکی ہوں اور ٹیچنگ بھی کرتی ہوں۔

جہاں تک بات ہے ذہنی صحت اور ڈپریشن کی تو اس کے بعد ڈاکٹر کی پوسٹنگ ہو گئی بعد میں ہر طرح سے سر درد کا علاج کیا۔ دوائیں تعویذ دم کچھ نہیں چھوڑا۔ مگر سر درد نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میری تنخواہ اب ۔ تین ہزار روپے ہے۔ جس سے آدھی کمیٹیاں اور آدھی گھر کے خرچ پہ ختم ہو جاتی ہے۔

ج: آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک ذہین، سمجھ دار لڑکی ہیں۔ ذہنی طور پر نارمل ٹھیک ہیں۔ ڈپریشن وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک ذہنی کرب کا تعلق ہے تو ہر حساس انسان ان حالات سے پریشان ضرور ہوتا ہے۔ خصوصاً" نیند کی کمی کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے، سر درد کا تعلق بھی آپ کے حالات سے نہیں ہے۔ جو حالات آپ نے لکھے ہیں، یقین کریں کہ اس دنیا میں لڑکیاں اس سے زیادہ بُرے حالات کا شکار ہیں۔ آپ تو خوش نصیب ہیں مشکل سے ہی سہی تعلیم حاصل کی۔ جاب کرنے کی اجازت مل گئی اب اپنے پیروں پر کھڑی ہیں، کسی کی محتاج نہیں ہیں۔

سر درد کے لیے ممکن ہو تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں اور ٹیسٹ وغیرہ کرالیں ویسے جہاں تک مجھے اندازہ ہے کہ کوئی

پریشانی والی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی خالی پیٹ رہنے سے بھی سر میں درد ہوتا ہے۔ ہاضمہ کی خرابی بھی سر درد کا باعث بنتی ہے۔ گیس جب اوپر کی طرف رخ کرتی ہے تو ہمیں سر درد، چکر اور متلی کی شکایت ہوتی ہے۔ سر درد کی ایک وجہ سرد ہوا لگ جانا بھی ہوتی ہے۔ آپ ڈاکٹر سے علاج کرا چکی ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب کسی حکیم سے رجوع کرکے دیکھ لیں۔ سر درد کے لیے ہمدرد کی سر ہند دوائیں بھی عام ملتی ہیں۔ آپ کسی بھی میڈیکل اسٹور پر جاکر لے سکتی ہیں۔

نیند نہ آنے کے لیے آپ رات کو کھانا جلد کھالیں۔ سونے سے پہلے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کرکے گرم پانی سے غسل کریں۔ پھر ایک گلاس گرم دودھ پی کر بستر پر جائیں۔ نیند آجائے گی۔

ایک بات کا خیال رکھیں کہ جب تک نیند نہ آئے بستر پر آرام کے لیے نہ لیٹیں۔ جب نیند آنے لگے تب ہی بستر پر جائیں۔

شمع۔ دیپال پور

میری شادی ہوئی۔۔۔ شادی کے صرف ایک سال بعد میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی۔ شادی کے بعد میں نے انہیں زیادہ تر سوتے ہوئے دیکھا۔ شادی سے پہلے ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ کمپیوٹر کا کام کرتے ہیں۔ باقاعدہ ڈپلوما لے رکھا ہے۔ گھر والوں نے دیکھا تھا۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک تھے، زیادہ تر خاموش رہے یہ کوئی ایسی برائی نہیں تھی۔ گھر والوں نے ہر طرح سے مطمئن ہو کر شادی کردی۔ شادی کے بعد مجھے ان کا رویہ بہت عجیب لگا۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ میرے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت سرد تھا۔ آپ یقین کریں ایک سال ہماری شادی رہی، انہوں نے بارہ ماہ میں بارہ جملے بھی نہیں بولے۔ شروع شروع میں میں شرم کی وجہ سے چپ رہی پھر میں نے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ گم صم بیٹھے خالی نظروں سے دیکھتے رہتے۔ یا چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی، چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے وہ سو کر گزارتے تھے۔ ساس نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے لیے ایک ماہ کی چھٹی لی ہے۔ ایک ماہ گزر گیا لیکن وہ کسی کام پر نہیں گئے۔ میں نے پوچھا تو کہا نوکری چھوٹ گئی ہے۔ میں شکل دیکھتی رہ گئی۔ دو ماہ سے نوکری نہیں ہے اور یہ آرام سے گھر بیٹھے ہیں۔ میرے سسر کاروبار کرتے تھے۔ ان کے پیسوں سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ وہ مجھے بھی جیب خرچ کے نام پر ہر ماہ پانچ سو روپے دیتے تھے۔ میری ضروریات بھی محدود تھیں۔ شادی پر سلامی کے نام پر جو پیسے ملے تھے۔ وہ میرے پاس تھے۔ میں ان میں سے خرچ کرلیتی تھی۔ میں امید سے ہوئی تو میں نے ان سے ایک بار پھر کہا کہ وہ نوکری تلاش کریں انہوں نے حسب معمول مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ساتواں مہینہ چل رہا تھا جب ساس نے کہا کہ تم میکے چلی جاؤ۔۔۔۔ ہمارے ہاں پہلی اولاد میکے میں ہوتی ہے۔ میں اپنے میکے آگئی۔ ان کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں لی گئی۔ نہ فون کیا۔ امی پریشان تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا، میں نے سوچا اگر میں نے انہیں اپنے حالات بتائے تو مزید پریشان ہوجائیں گی۔ خیر دو ماہ گزر گئے۔ بچی کی پیدائش ہوئی۔ اسپتال جانے سے پہلے امی نے سسرال فون کیا تھا وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد دوبارہ فون کیا تو ساس نے فون اٹینڈ کیا اور سرد مہری سے اچھا کہہ کر فون بند کردیا۔

عجیب لوگ تھے۔ میں نے سوچا بہت ہوگیا۔ اب مجھے خود سسرال جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی۔ شوہر کی طرف سے طلاق نامہ آگیا۔ اب گھر میں سب مجھے الزام دیتے ہیں کہ تمہیں گھر بسانا نہیں آیا۔ تم نے کچھ بتایا کیوں نہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ بتائیں ان حالات میں میں کیا کرسکتی تھی۔

ج : اچھی بہن! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں آپ کچھ بھی کرتیں۔ نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ ان لوگوں نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا۔ ان کا بیٹا ذہنی مریض تھا اور وہ سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کی شادی آپ سے کی۔ دراصل ہمارے ہاں لڑکوں میں کوئی بھی خرابی ہو بجائے علاج کرانے کے شادی کو ہر مسئلہ کا حل سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے شوہر ذہنی مریض تھے۔ انہیں باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی لیکن ان لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ وہ جو اٹھارہ گھنٹے سوتے رہتے تھے، ممکن ہے وہ کوئی دوائیاں استعمال کرتے ہوں۔

آپ کم عمر تھیں۔ اس صورت حال کو سمجھ نہ سکیں۔ آپ کے گھر والوں کو چاہیے کہ آپ کو الزام دینے کے بجائے آپ کی دل جوئی کریں۔

فی الحال آپ کی بچی چھوٹی ہے۔ ابھی آپ کے لیے گھر سے زیادہ دیر دور رہنا مشکل ہوگا۔ آپ نے انٹر کیا ہے۔ دوبارہ پڑھائی کا سلسلہ شروع کردیں۔ اس سے آپ کا ذہن مصروف رہے گا۔ پڑھائی مکمل کرکے آپ کوئی بھی جاب کرسکتی ہیں۔





سیمارباب۔۔۔بوریوالہ

س :۔ عید کے بعد میری شادی ہے ہمارے چھوٹے سے شہر میں کوئی ڈھنگ کا بیوٹی پارلر نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں دلہنیں مایوں کے بعد گھر سے نہیں نکلتیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے میک اپ کے بارے میں چند باتیں بتادیں۔

1 ۔ فاؤنڈیشن کے انتخاب میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

2 ۔ آئی شیڈو کس رنگ کالگایا جائے' آئی لائنر کیسے لگایا جائے؟

3 ۔ بلش آن کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟

ج :۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب کرتے ہوئے آپ کو سب سے پہلے اپنی اسکن کو جاننا چاہیے۔ اگر آپ کی اسکن خشک یا نارمل ہے تو لیکوئیڈ فاؤنڈیشن لیں۔ ایسے شیڈ کا انتخاب کریں جو آپ کے چہرے کے رنگ سے مشابہ ہو۔ بہت ہلکا ہرگز نہیں لیں۔ اس سے چہرے پر دھبے نظر آئیں گے۔

چہرے پر فاؤنڈیشن نقطوں کی شکل میں لگائیں۔ پھر نم اسفنج کی مدد سے اچھی طرح ہموار کریں۔ فاؤنڈیشن لگانے سے پہلے اگر چہرے پر ہلکا سا موئسچرائزر لگالیا جائے تو فاؤنڈیشن زیادہ اچھی طرح جذب ہوتا ہے۔

چہرے کے ساتھ ساتھ اپنی گردن کو نہ بھولیں' ورنہ گردن کا رنگ چہرے سے الگ نظر آئے گا۔

آئی شیڈو لباس کے رنگ کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ عام طور پر شادی کا جوڑا سرخ رنگ کا ہوتا ہے جس پر عموماً" گولڈن کام ہوتا ہے۔ آپ آنکھوں کے کناروں پر اور درمیان میں میرون کلر کا آئی شیڈو لگائیں اور اس پر ہلکا سانسہری بیچ دیں تو بہت اچھا لگے گا۔

آئی لائنر صرف اوپری پلک پر لگائیں اور ہموار پتلی لائن پلک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لگائیں۔ جب یہ سوکھ جائے تو اسی رنگ کی نرم نوک والی پنسل کو اپنی بنائی ہوئی لائن پر پھیردیں۔

بلش آن لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مسکرائیں۔ آپ کے رخسار ابھر آئیں گے۔ رخساروں کے ان ابھار پر بلش آن لگائیں' اسے اچھی طرح بلینڈ کرلیں تاکہ وہ قدرتی دکھائی دے۔

کبھی بھی بلش آن کو رخساروں سے نیچے نہ لگائیں بہت زیادہ نیچے لگایا گیا بلشر آپ کے چہرے پر تھکن ظاہر کرے گا۔

بلشر ناک کے قریب بھی نہ لگائیں ورنہ آپ کی ناک نمایاں ہوگی۔

اسی طرح آنکھوں کے قریب بھی نہیں لگانا چاہیے' اس طرح دوسروں کی توجہ آپ کی آنکھوں کے حلقوں پر مبذول ہوگی۔

عکس۔۔۔لاہور

س :۔ میرا مسئلہ میرے بال ہیں۔ پہلے میرے بال بہت اچھے اور گھنے تھے لیکن اب بالوں میں نہ چمک ہے' نہ ہی بڑھتے ہیں' بال تیزی سے گر رہے ہیں۔

ج :۔ سب سے پہلے آپ اپنے شیمپو کا جائزہ لیں۔ ممکن ہے جو شیمپو استعمال کررہی ہوں وہ آپ کے بالوں کے لیے اچھا نہ ہو' بال خشک ہیں اس لیے آپ کو خاص طور پر خشک بالوں کے لیے بنایا ہوا شیمپو استعمال کرنا چاہیے۔

ہفتہ میں دوبار سے زیادہ شیمپو ہرگز نہ کریں۔

بالوں کو ٹوٹنے سے روکنے کے لیے چوڑے دندانے والی کنگھی استعمال کریں۔

ہفتے میں دوبار گرم تیل سے مساج کریں۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ناریل یا زیتون کا تیل ہلکا سا گرم کرلیں اور بالوں کو شیمپو کرنے سے پہلے اس تیل سے اپنے سر پر ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں۔ پھر تولیہ گرم پانی میں بھگو کر نچوڑلیں اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیں۔ تیل آپ کے سر میں جذب ہوجائے گا۔ یاد رکھیں بالوں کی افزائش کے لیے تیل بہت ضروری ہے۔ اپنی غذا کا خاص خیال رکھیں۔ آج کل سیب کا موسم ہے۔ کینو کا موسم بھی آنے والا ہے۔ یہ دونوں پھل بالوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ سیب چھلکوں سمیت کھائیں۔

